''چہارسُو''

...... دی جوک......ایک مطالعہ......

عبداللہ جاوید کی زیرِنظر رفیقِ مطالعہ کتاب ''دی جوک......ایک مطالعہ'' ملن کنڈیرا کے عالمی شہرت یافتہ ناول کے ابعاد کا مطالعاتی احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سیاسی، سماجی اور انسانی رویوں اور ان پراثر انداز ہونے والے زمان ومکاں کے رجحانات سے قاری کو آشا کرتی ہے۔یہی نہیں بلکہ کتاب کی مرکزی فکریات اوراس کے رموز کو پرت پرت وا کر کے ان کا رشتہ شخصیات اور شہریات سے جوڑ کر لمحۂ موجود کے اندرون میں ماضی اور مستقبل کی دھندلی پڑتی ہوئی پر چھائیوں کو زندہ وتابندہ بناتی ہے۔علاوہ ازیں میں مطالعے میں انسانی رشتوں کی لطافتوں اور پیچیدگیوں پر خصوصیت سے توجہ مرکوز کی گئی ہے اوران کی بنتی، بگڑتی اور بدلتی صورتوں کا گہرائی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ان بنیادی تخلیقی وفکری نکات کو مرکزِ توجہ بنانے کی وجہ سے یہ رفیقِ مطالعہ کتاب قاری کو اصل ناول ایک بار پھر پڑھنے پر مائل کرتی ہے،اور یوں ثابت ہوتا ہے کہ ہر عظیم تخلیق ایک سے زائد بار پڑھے جانے کی حق دار ہوتی ہے۔

مبین مرزا

اشاعت:۲۰۲۰ء، قیمت:۸۰۰روپے، دستیابی:اکادمی بازیافت،اردو بازار، کراچی۔

...... کلیاتِ بلقیس جمال بریلوی ......

بلقیس جمال بریلوی کی شاعری کیسی ہے، ان کا رنگِ سخن کیا ہے اور کن موضوعات سے انہیں خاص طور سے دل چسپی تھی، ان سب باتوں کا اندازہ اس کتاب کو پڑھنے والے قارئین خود کرلیں گے۔ان کی شاعری کے مطالعے سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابتدا میں اُن کے ہاں قومی اور تہذیبی شعور سب سے نمایاں موضوع تھا۔شاید یہ اُس دور کا تقاضا بھی تھا۔مسلمان گھرانوں میں خواتین کی تعلیم اور سماجی کردار کا کوئی تصور نہ تھا۔بہت کم لوگ لڑکیوں کی باقاعدہ تعلیم کے بارے میں سوچتے اور کوئی عملی قدم اٹھاتے تھے۔میری والدہ محترمہ (رابعہ پنہاں) اور خالہ جان (بلقیس جمال بریلوی) نے گھر میں اپنے والد سے اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی تھی۔گھر میں شعروشاعری کا ماحول تھا جس نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز کیا۔چنانچہ جب وہ شعر کہنے لگیں تو انہوں نے ذاتی احساسات کے ساتھ ساتھ اپنے سماجی حالات اور قومی شعور کا بھی اظہار کیا۔ان کی شاعری میں خواتین کو قومی دھارے میں شمولیت اور بہتر سماجی کردار کی ترغیب دی گئی ہے۔

حمرا خلیق

اشاعت:۲۰۲۰ء، قیمت:۱۴۰۰روپے، دستیابی:اکادمی بازیافت،اردو بازار، کراچی۔

...... داستان ہونے کے بعد ......

''داستان ہونے کے بعد'' پہلی قسط حاضرِ خدمت ہے۔یہ ناول لکھنے کے لیے مجھے اپنے آپ کو ۱۹۹۳ء سے مجبور کرنا پڑا۔میں نے جب قلم سنبھالا تو احساس بھی نہیں تھا کہ قدرت نے لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر اس لیے ڈالی کہ یہ ناول لکھ سکوں۔یہ ناول نہیں وہ زخم ہیں جو ایک ماں نے بیٹی کے سینے میں منتقل کیے ہیں۔وفات سے کچھ عرصہ پہلے وہ کہا کرتی تھیں۔میں تمہارے نام ڈائری لکھ رہی ہوں اور تم ہی میرے لیے بہت رویا کرو گی۔تو میں ہنس کر کہتی امی آپ کی موت کوئی بڑی ٹریجڈی نہیں سب نے مرنا ہے۔آپ تو بھرپور زندگی گزار کر جارہی ہیں۔وہ اکثر کہا کرتیں کہ جب میں دنیا سے جاؤں گی تم مصروف عورت کے پاس وقت نہیں ہوگا۔کسی تقریب کسی ڈیوٹی کسی سیمینار میں مصروف ہوگی۔امی کا ۲۔دسمبر کو جب انتقال ہوا تو میں ادیبوں کی عالمی کانفرنس میں ٹیکسلا، خان پور سے واپس آرہی تھی۔(آج میرے پاس وقت ہی وقت ہے امی نہیں) جب ان کا بکس کھولا گیا تو بہت سارے سامان کے ساتھ ڈائری کے آدھے ورق غائب تھے۔اس ڈائری میں صرف مجھے مخاطب کیا گیا تھا اور وصیت کی تھی کہ میں ان کی کہانی لکھوں۔اس کہانی میں بہت جھول ہوں گے۔فنی محاسن کی کمی بھی ہوگی لیکن اسے ایک ماں کی وصیت اور بیٹی کی کاوش سمجھ کر قبول کیجیے۔

اشاعت:۲۰۲۰ء، قیمت:۵۰۰روپے، دستیابی: دستاویز مطبوعات، ٹمپل روڈ، لاہور۔

N.P.R- 063
زندگی کے ساتھ ساتھ
چہارسُو
جلد۳۰،شمارہ:جنوری،فروری ۲۰۲۱ء
بانی مدیراعلیٰ
سید ضمیر جعفری
مجلسِ مشاورت
قارئین چہارسُو
زرِسالانہ
دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ
مدیر مسؤل
گلزار جاوید
مدیرانِ معاون
بینا جاوید
قاری شا
محمد انعام الحق
عروب شاہد
آمنہ علی
رابطہ:537/D-1، گلی نمبر18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔
فون:(+92)-51-8730633-8730433
موبائل:(+92)-336-0558618
ای۔میل:chaharsu@gmail.com
۔ ویب سائٹ ۔
http://chaharsu.wordpress.com
پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

مرے اطراف کا بے انت سنّاٹا مرا دل ہے
اور اندر بھی جو برپا ہے وہ ہنگامہ مرا دل ہے

قرطاسِ اعزاز
مبین مرزا
کے نام

مبین مرزا5، جنوری1965ءکوملتان میں پیدا ہوئے۔ملک اور بیرونِ ملک کے ادبی حلقوں میں وہ ایک معروف ادبی شخصیت کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔لگ بھگ چالیس برس سے وہ اردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔اُن کے افسانے بہترین افسانوں کے انتخاب میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔اُن کے کئی افسانوں کی ڈرامائی تشکیل بھی ہوچکی ہے۔

نقادکی حیثیت سے مبین مرزا کا شمار جداگانہ شناخت رکھنے والے اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی تنقید فلسفے،نفسیات،تاریخ اور جدید تھیوریز سے براہِ راست سروکار رکھتی ہے،اور وسیع علمی تناظر میں نتائجِ فکر کا اظہار کرتی ہے۔اُن کے ہاں موضوعات کا تنوع اور بیان کا سلیقہ بھی نمایاں ہے۔وہ اکثر و بیشتر مختلف ٹی وی چینلز پر ادبی اور سماجی مبصر کی حیثیت سے شریک ہوتے رہتے ہیں۔

مبین مرزا شاعر کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ملک و بیرونِ ملک کے معروف ادبی جرائد اور اخبارات میں اُن کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔وہ طویل عرصے سے کانفرنسز اور سیمینارز میں بھی شریک ہورہے ہیں اور متعدد ممالک میں پاکستان کی ادبی اور ثقافتی تقریبات میں نمائندگی کرچکے ہیں۔وہ کئی برس تک روزنامہ ''ایکسپریس'' کے سنڈے میگزین میں ادبی، سماجی، سیاسی اور عالمی موضوعات پر ہر ہفتے آرٹیکل بھی لکھتے رہے ہیں۔

وہ ممتاز ادبی وتہذیبی جریدے ''مکالمہ'' کے مدیر ہیں۔جس کے اب تک 52 شمارے شائع ہوچکے ہیں،جن میں کم وبیش 2000 صفحات پر مشتمل خاص افسانہ نمبر اور سال نامہ 2018 اور 2019 بھی شامل ہے۔وہ ملک کے معروف اشاعتی ادارے ''اکادمی بازیافت'' کے سربراہ ہیں اور ''اکادمی ادبیات پاکستان'' کے بورڈ آف گورنرز کے رُکن بھی رہے ہیں۔

اُن کی درجِ ذیل کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں:

خوف کے آسمان تلے (افسانے [illegible]، سعادت حسن منٹو: شخصیت وفن (تنقید)2008، تابانی (شاعری)2015، زمینیں اور زمانے (افسانے)2015، ارژنگ (خاکے 2020، اردو کے بہترین شخصی خاکے (خاکے/ تالیف)2002، پاکستانی ادب (نثر کا انتخاب/ تالیف)2002، ادبیات (قیامِ پاکستان کے بعد کی نسل کا منتخب ادب)(نظم ونثر کا انتخاب/ تالیف)2005، منٹو: منتخب مضامین (تنقید/ تالیف)2011، مکالمہ۔

(اب تک 52 شمارے شائع ہوچکے ہیں، جن میں 2000 صفحات پر مشتمل خصوصی افسانہ نمبر کے علاوہ سال نامہ 2018ء اور 2019ء بھی شامل ہیں۔)

مبین مرزا کے تنقیدی مضامین اور فکشن کے تراجم کی کتابیں تدوین واشاعت کے مراحل میں ہیں۔

قلبِ دروں

عطیہ سکندر علی

(سکھر)

داستان سرائے

121/C ماڈل ٹاؤن، لاہور

۱۳۔ جولائی ۱۹۹۶ء

عزیز گرامی قدر، السلام علیکم۔

آپ کا دین دار اور عرصے سے اس قرض کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں۔

(1) اصل میں خط لکھنے کا بڑا چور ہوں اور جگہ جگہ سے ہزیمت اٹھا چکا ہوں۔ اس بیماری کے ہاتھوں میرا بڑا نقصان ہوا ہے لیکن کیا کروں کوئی چارہ گر نہیں ملتا۔

(2) یہ آپ کے خط کا جواب نہیں اس کی رسید ہے، اس لیے کہ جواب تفصیل چاہتا ہے اور تفصیل تاخیر کا باعث ہو سکتی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تاخیر آپ کو ناراض کردے گی۔

(3) پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ رسالہ نکالنے کا پروگرام ابھی تک ہے یا ختم ہوگیا۔ اگر ختم ہوگیا ہو تو مجھے بواپسی ڈاک اطلاع دیں تاکہ آپ کا افسانہ ایک اور 'بلائے جان' کو دے دوں۔ اس نے آفت مچا رکھی ہے اور میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے۔ ویسے آپ کا جواب کیا ہوگا اس کا مجھے اندازہ ہے۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں، آپ ملنگ آدمی ہیں اور ملنگ جب ایک بار منکوں کی مالا گلے میں ڈال لیتا ہے پھر اتارنے پر تیار نہیں ہوتا۔

(4) جب آپ کا جواب آئے گا تو افسانہ 'نکالنے' کی کوشش کروں گا۔ اصل میں ان دنوں گھر میں بچوں نے سفیدی اور ڈسٹمپر کرانے کا بکھیڑا ڈال رکھا ہے۔ میری کام والی میز چیزوں کے بوجھ تلے آ گئی ہے۔ میز پر جو کاغذات ہیں انھی میں آپ کا افسانہ ہے۔ آپ کہیں گے تو زور زبردستی لیور لگا کر بوجھ تلے سے افسانہ نکالنے کی کوشش کروں گا کیوں کہ ڈسٹمپر کا کام تو ابھی لمبا ہے۔

آپ کی بانو آپا کہتی ہیں کہ میں اگلے ایشو کے لیے کہانی ضرور دوں گی۔ اس کا وعدہ پکا ہوتا ہے اور وہ اپنے عہد پر قائم رہتی ہے۔

سب کو میرا پیار دیں اور یاد دلائیں، پچھلی مرتبہ ٹی وی پر پروگرام سے پہلے پروڈیوسر کے کمرے میں جو محفل جمی، خوب رہی۔ اس محفل میں آپ نے بہت اچھی گفتگو کی تھی۔ ایسی نشستیں اب خواب و خیال ہو گئی ہیں۔ ٹی وی شو میں بھی آپ نے جم کر بات کی تھی۔ سنا ہے قاسمی صاحب اس پروگرام سے خفا ہیں۔ انھوں نے کوئی کالم بھی لکھا ہے جس میں میزبان کو ڈانٹا ہے۔ البتہ شہزاد احمد نے پروگرام کی تعریف کی ہے۔

اشفاق احمد

ریلوے روڈ، سرگودھا

۲۸۔ مئی ۱۹۹۷ء

محترمی مبین مرزا صاحب، السلام علیکم۔

آپ کا خط ملا۔ امید ہے اسی دوران آپ کو کتابوں کا ایک اور بنڈل بھی مل گیا ہوگا۔ اس خط کے ساتھ مزید کتابیں ارسال ہیں۔

عرش صدیقی کے بارے میں آپ نے بہت خوب صورت مضمون لکھا ہے۔ ایک گہرے جذباتی تعلق کے بغیر اس قسم کا مضمون لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے آپ کی محبت اور احساسِ زیاں جھلکتا ہے۔ میں آپ کے اس انتہائی قیمتی مضمون کو اوراق میں شامل کر رہا ہوں۔

مگر ایک گزارش ہے۔ ایک تو یہ کہ مضمون کے صفحہ نمبر تین پر فیض صاحب کے بارے میں جو لطیفہ درج ہے اسے حذف کر دینا بے حد ضروری ہے۔ مضمون کے مزاج اور اس کی فضا میں یہ فٹ نہیں بیٹھتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس مضمون کے پرنٹس اوراق کے صفحات کی Lines کے مطابق نہیں ہیں۔ اگر کمپیوٹر میں مواد موجود ہے تو نئے پرنٹس نکالنا آسان ہوگا۔ بصورتِ دیگر آپ مجھے مطلع کر دیں میں دوبارہ اس کی کمپوزیشن کروالوں گا۔ اوراق میں جو مضمون چھپتا ہے اس کے پہلے صفحے کی سطریں ۱۹ اور باقی صفحات کی سطریں ۲۷ ہوتی ہیں۔ اوراق کا کوئی بھی پرچہ آپ کے پاس ہوگا، اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ آپ نے مضمون کی پروف ریڈنگ بھی بہت اچھی کی ہے۔ کہیں کوئی غلطی نظر نہیں آئی۔ فقط ایک لفظ 'قمیض' لکھا گیا ہے۔ نیا پرنٹ بھجواتے ہوئے یہ معمولی سی غلطی بھی آسانی سے درست ہو سکتی ہے۔ مضمون کے ساتھ اپنی کوئی تازہ نظم بھی بھجوا سکیں تو ضرور بھیج دیجیے۔

ارمان نجمی صاحب کا خط آیا۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر ان کا مضمون اسی گوشے میں آ جائے۔ خطوط کے ذریعے انٹرویو کا سلسلہ بہت عمدہ رہے گا اور بآسانی تکمیل پا سکتا ہے۔ آپ نے جو سوالات بھیجے تھے میں نے ان کے جوابات لکھ دیے ہیں۔ بھجوا رہا ہوں۔ عمدہ سوالات تھے۔ ان میں کئی غور طلب نکات ہیں۔ امید ہے یہ سلسلہ مزید آگے چلے گا۔

سلیم آغا سے ایک مضمون حاصل کر لیا ہے۔ یہ بھی ارسال ہے۔ بھیجی جانے والی کتابوں میں حیدر قریشی کی لکھی ہوئی کتاب ''عہد ساز شخصیت'' بھی شامل ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ایک غزل لکھ کر بھیج رہا ہوں۔

وزیر آغا

برادرم مبین مرزا، السلام علیکم۔

۲۸۔ مارچ ۲۰۰۰

تمھارے خط کے ساتھ مکالمہ کے دو شمارے (۵ اور ۶) موصول ہوئے، لیکن یہ وہ پیکٹ ہے جس میں میرے لیے نسخے بھیجے گئے ہیں۔ بڑا پارسل

ابھی نہیں ملا۔ممکن ہے دو چار دن میں مل جائے۔

مکالمہ کے دونوں شمارے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دونوں پرچے عمدہ اور تمھاری مدیرانہ صلاحیت کا ثبوت ہیں۔عسکری صاحب والا گوشہ بھی شان دار ہے۔اس میں شامل کی گئی تحریریں عسکری صاحب کی تفہیم کے بعض نئے پہلو سامنے لاتی ہیں۔تم نے اس میں جتنا اور جیسا مواد شامل کیا ہے، بہت سے مدیر نمبر میں بھی پیش نہیں کرتے۔تم محنت اور سلیقے سے پرچہ مرتب کرتے ہو۔البتہ ایک شکایت تم سے ضرور ہے کہ پرچہ بہت تاخیر سے لاتے ہو۔لکھنے والے کو تمھیں کچھ بھیج کر صبر ایوبی سے کام لینا پڑتا ہے،لیکن یہ بھی ہے کہ جب پرچہ آتا ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس وقت اردو کا سب سے اچھا ادبی پرچہ مکالمہ ہے۔

تم نے اپنی کتاب کی اشاعت کے بارے میں مجھ سے رائے طلب کی ہے۔میری رائے بھی وہی ہے جو انتظار حسین نے تم سے کہا ہے۔تمھیں اب کتاب چھاپ لینی چاہیے۔اب اور تاخیر کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔البتہ انتظار صاحب کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتا کہ تمھیں افسانوں کا مجموعہ لازماً پہلے لانا چاہیے۔وہ خود افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کا وزن افسانے کے پلڑے میں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں،لیکن میری رائے میں اس کا بہتر فیصلہ تم خود کر سکتے ہو کہ پہلے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو یا شاعری کا۔ویسے دونوں کتابیں ساتھ ساتھ بھی آ سکتی ہیں۔افسانوں کے مجموعے اور ناول کو ایک ساتھ لانا ٹھیک نہیں ، شاعری اور افسانے کی کتاب میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔تم نے یہ نہیں لکھا کہ تم کس مجموعے میں میرا فلیپ شائع کرنا چاہتے ہو، یہ بتاؤ تو میں لکھ کر بھیج دوں گا۔جہاں تک مجھے یاد ہے، کسی خط میں تمھاری شاعری کے بارے میں میں نے تمھاری فرمائش پر اپنی رائے لکھ کر بھیجی تھی۔تم اس کو شامل کر سکتے ہو اگر تم شاعری کی کتاب پہلے چھاپ رہے ہو۔کہو گے تو دوبارہ لکھ بھیجوں گا۔

میں صحت کے مسائل سے دوچار رہا ہوں، لیکن اب بہتر ہوں اور کام بھی کر رہا ہوں۔مکالمہ کے لیے کچھ بھیجوں گا۔

شمس الرحمان فاروقی

7341 Tropicana Street

Miramar, Miami- FL 33023

۲۹۔اپریل ۱۹۹۲ء

مرزا صاحب، کہیے کیسے ہیں؟

یہاں میامی میں ہمارا تیسرا دن ہے۔کراچی سے نیویارک تک جہاز کا سفر توقع کے خلاف نہایت آرام دہ اور پر لطف رہا۔ پھر اس سے آگے میامی تک بھی آرام سے پہنچ گئے۔ نیویارک ایئر پورٹ پر رضوان میاں اور ان کی امریکی دلھن اپنی رینٹڈ کار لیے ہمارے منتظر تھے۔سو جہاز سے اترتے ہی کار میں آ بیٹھے اور میامی کے لیے روانہ ہو گئے۔نیویارک سے میامی تک راستے کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور درمیان میں کھانے اور چائے پانی وغیرہ کے لیے قیام کرتے ہوئے کل تیس گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد بالآخر میامی آ پہنچے۔

میامی کے بارے میں میرا پہلا تاثر تو یہی ہے کہ کراچی کے شور وشر کے مقابلے میں اس شہر کا پرسکون اور صاف ستھرا ماحول کم از کم باہر سے تو بہت بھلا لگتا ہے۔اندر کا حال خدا ہی جانے۔اور دوسری بات یہ کہ ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک اور خالص اشیائے خوردنی بھی یہاں آ کر ایک مدت بعد میسر آئی ہیں۔ ہماری امریکی بہو نے (جو اپنے انداز واطوار اور رنگ روپ کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ مزاج اور عادات وخصائل کے اعتبار سے بھی بڑی حد تک مشرقی لڑکی معلوم ہوتی ہے)اپنے گھر کا ایک کمرہ تمام ضروریات سے آراستہ کر کے ہم میاں بیوی کے لیے وقف کر دیا ہے۔سو ہم بھی فی الحال بیٹے اور بہو سے ملنے میں لگے ہیں۔ اور سوائے اس کے کہ بہو کے ساتھ بے تکلف انگریزی بولنے اور ساس بہو کے درمیان ترجمانی کے فرائض ادا کرنے میں الجھن ہوتی ہے،لیکن اس کے سوا یہاں اور کوئی پرابلم پیش نہیں۔

اچھا اب آپ ادھر کی سنائیں۔کیا احوال ہیں؟ قیصر سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں؟ ہوتی ہے تو کچھ اس کا اور کچھ اپنا احوال قلم بند کریں۔اور ہاں کبھی ایس یو خان صاحب سے ملاقات ہو تو ان تک میرا اسلام،شوق ملاقات کے ساتھ پہنچا دیں۔ان سے میں ایک ہی بار ملا ہوں مگر ان کی شخصیت میں ایک ایسی کشش اور اپنائیت سی محسوس ہوئی کہ ان کی یاد آتے ہی دل بے اختیار ان کی جانب کھنچنے لگتا ہے۔

اور سلیم احمد کو تو آج کل آپ پڑھ ہی رہے ہوں گے۔ان کی ہر کتاب پر آپ کے تأثرات الگ الگ بھی اور totality میں بھی بے کم و کاست درکار ہیں کہ اس سے بہتر اور دلچسپ موضوع گفتگو ہمارے اور آپ کے درمیان شاید اور کوئی نہیں ہو سکتا۔میرا مشورہ ہے کہ جو کتاب آپ دیکھ چکیں،اس کے بارے میں اپنے تأثرات ساتھ ہی بھیجتے جائیں۔ پھر سب کتابوں پر مجموعی تبصرہ بھی ہو جائے۔ یہ تبصرہ ہمارے آپ کے درمیان سلیم احمد پر گفتگو کے لیے اچھی base فراہم کرے گا۔اور ہاں سلیم احمد کو پڑھنے کے دوران یا پڑھنے کے بعد جو بھی سوالات آپ کے ذہن میں آئیں اگر وہ بھی ساتھ ہی ساتھ قلم بند کرتے جائیں اور اپنے تأثرات کے ساتھ مجھے بھیجتے جائیں تو کیا ہی کہنے۔اس طرح آپ اپنے مطالعے میں مجھے بھی شریک کر سکیں گے۔اور ہو سکتا ہے کہ آپ جیسے ذہین اور وسیع المطالعہ ادیب کے تبصرے اور سوالات کی روشنی میں سلیم احمد کی کائنات فکر وفن کے کچھ نئے گوشے مجھ پر بھی کھل سکیں۔ پھر اس کے بعد اپنے اوپر مضمون تو سلیم احمد آپ سے خود ہی لکھوا لیں گے(بلکہ مضمون کے بجائے مضامین بھی لکھوا سکتے ہیں)۔

اور ہاں،آپ کی صحت کے بارے میں مجھے خاصی تشویش ہے۔ذرا اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کیجیے۔

آپ کا پتا خدا جانے کہاں رہ گیا۔اس لیے یہ خط قیصر عالم کی

معرفت بھیج رہا ہوں۔

جمال بھائی

پیارے مبین مرزا

ارے بدمعاش، ارے بدمعاش، ارے بدمعاش۔۔۔ظالم تم نے تو میرا دل خوش کر دیا۔ تم سے فون پر بات نہ ہوتی تو تمھارے بارے میں میری رائے قیامت تک ٹھیک نہیں ہو سکتی تھی، حالانکہ اس میں تمھارا اتنا قصور نہ ہوتا۔ اصل میں تمھارے بارے میں مجھے میرے دو دوستوں جمال پانی پتی اور مشفق خواجہ نے گمراہ کیا۔ میں اس سے پہلے بھی مکالمہ اور تم سے واقف تھا، لیکن یہ واقفیت برائے نام تھی۔ تمھارا بیہودہ کالم پڑھنے کے بعد تمھارے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے جمال خاں کو فون کیا۔ اس سالے نے بتایا کہ تم بہت مذہبی آدمی ہو۔ اس سے ملنے جاتے ہو اور نماز کا وقت ہوتا ہے تو مصلیٰ مانگ کر وہیں پہلے نماز پڑھتے ہو، اس کے بعد چائے پینے کے لیے بیٹھتے ہو۔ میں نے جمال خاں کی بات کی تصدیق کے لیے خواجہ کو فون کیا۔ اس نے تو حد ہی کر دی۔ کہنے لگا، مبین مرزا کے چہرے پر نہیں لیکن پیٹ میں ڈاڑھی ہے۔ میں نے سوچا، لاحول ولا، کس مولوی سے پالا پڑ گیا۔ میں نے ان دونوں دوستوں سے پوچھا کہ تمھیں میرے پیچھے کس نے لگایا ہے؟ دونوں کا خیال تھا کہ یہ کام تم خود اپنے رسک پر کر رہے ہو۔

مجھے حیرت ہوئی، لیکن پھر خیال آیا کہ کوئی مولوی کسی بھی بات پر بہک سکتا ہے۔ بہتر ہے تمھیں نظر انداز کر دیا جائے، لیکن تمھارے کالم میں جیسے تیکھے فقرے لکھے گئے تھے، انھیں دو ہی صورتوں میں نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔۔۔یا تو پڑھنے والا غبی ہو یا پھر اس کی تم سے دوستی ہو۔ میں بھلا کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ گربہ کشتن روز اوّل، فون کر کے تم سے براہ راست نمٹ لیا جائے تا کہ آئندہ تمھیں ایسی کسی بیوقوفی کی ہمت ہی نہ ہو۔ یوسفی صاحب سے بات ہوئی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ پی جاؤ، لیکن میں نے خود سے کہا، پی جاؤں تو ساقی کیسے کہلاؤں۔ بس پھر جو فون کیا تو میں نہال ہی ہو گیا۔ تم نے جس طرح ترکی بہ ترکی گالی کا جواب گالی سے دیا، اس پر تو میں اش اش کر اٹھا (عالی عش عش لکھتا ہے جو بالکل غلط ہے)۔ گالی دینا زندہ اور جری آدمی کی نشانی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم ایک زندہ اور جری آدمی ہو۔ تمھارے کالم سے بدزبانی کے علاوہ جس چیز کا اندازہ ہوتا ہے، وہ تمھاری ذہانت ہے۔ تمھارا مطالعہ بھی اچھا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ تم ادب کی دنیا میں شناخت حاصل کر سکتے ہو، بڑا نام کما سکتے ہو۔ اس سے پہلے ضروری ہے کہ ایک بات اور بھی سمجھ لو، وہ یہ کہ اردو ادب کی ایک دنیا ہے، اس میں ذہین لوگوں کا جو قبیلہ ہے، وہ بہت بڑا نہیں ہے، مختصر سا ہے اور میں اس قبیلے کا سردار ہوں، اور یہ بھی کہ میں اپنے قبیلے کے ہر فرد سے پیار کرتا ہوں۔ بس اب تم سے رابطہ رہے گا۔

جان ساقی خوش رہو، خوش رہو۔۔۔اور ادب میں میری خدائی کا اعلان کردو۔ باقی باقی۔

ساقی فاروقی

Multan Post graduate College

Principal: Dr. I. R. Arsh siddiqui

۲۴۔ جنوری ۱۹۹۵ء

عزیز محترم مبین مرزا صاحب، السلام علیکم۔

آپ کا ۱۵؍ جنوری کا خط ملا۔ آپ نے بڑی تفصیل سے لکھا۔ اچھا کیا۔ خط لکھنے کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ فرصت اور اطمینان سے لکھا جا سکتا ہے اور مافی الضمیر پوری طرح بیان ہو جاتا ہے۔ ٹیلی فون پر اکثر ٹیلی فون ختم ہونے کے بعد خیال آتا ہے، ارے وہ بات رہ گئی اور وہ بات بالکل ہی بھولی رہی۔ آپ کو دوسرا خط لکھنے کے چند روز بعد میں جدہ چلا گیا تھا، بھائی بیٹے بہو اور پوتے کے پاس۔ عمرے کی نیت سے۔ پندرہ روز وہاں گزرے۔ تین بار مکہ گئے۔ دو عمرے پورے کیے۔ دو روز مدینے میں گزرے۔ باقی جدہ میں آٹھ دس نزدیک دور کے عزیز ہیں، ان سے ملاقات میں گزرے۔ واپسی پر چند روز دبئی، شارجہ، العین اور ابوظہبی میں گزرے۔ خاصا اچھا دورہ رہا۔

آپ کا خط جن اعلیٰ جذبات اور خیالات کا حامل ہے وہ آپ کی اعلیٰ شخصیت اور قابلِ احترام کردار کا عکس پیش کرتے ہیں۔ مجھے آپ محبت اور احترام کے لائق سمجھتے ہیں، یہ میری خوش قسمتی ہے اور آپ کا کرم ہے۔ میرے دل میں بھی آپ کے لیے محبت اور خلوص ہے۔ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے اندر محبت اور احترام کے جذبات نہ ہوں۔ ان جذبات کا اظہار پوری طرح اس وقت ہوتا ہے جب اسے اپنے معروض میں کہیں اپنے اندر کا عکس نظر آئے۔ اس صورتِ حال کی شناخت انسان اپنے شعور سے کرتا ہے یعنی جذبات و احساسات کا دل سے کوئی تعلق نہیں ان کی پہچان کے لیے لازماً شعور کو راہ نما ماننا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر فطری طور سے جبلی تقاضے، خود غرضی اور وحشیانہ پن کے تمام عناصر اسی طرح موجود رہتے ہیں جس طرح جنگل کے آدمی میں ہوا کرتے تھے۔ اب بس یوں ہے کہ تمام وحشیانہ پن کو انسان شعور کی مدد سے بیلنس کرتا ہے اور کنٹرول کرتا ہے۔ ہم ایسے لوگوں کی ساری زندگی اسی جدوجہد میں گزرتی ہے۔ یہ اچھا ہے یا برا اس پر شاید حتمی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے، آپ کے اعلیٰ کردار کو مزید نکھارے، آپ کو کامیابیوں کامرانیوں کے ساتھ اور صحت کے ساتھ طویل عمر عطا کرے اور مزید خوش رکھے۔ آمین۔

میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ دسمبر میں کام کے دباؤ میں رہے۔ کراچی کے حالات تو ہمیں جو کراچی سے اتنا دور بیٹھے ہیں، پریشان کیے رکھتے ہیں تو آپ لوگ جو اس عذاب کی صورتِ حال کے اندر رہنے پر مجبور ہیں، آپ کی پریشانی تو بہت زیادہ ہوگی۔ مجبوری ہے، اسی عذاب کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ اب تو ہر طرف یہی صورت ہے۔ ملتان جو بہت پرسکون جگہ تھی، اب خوف و ہراس

کامسکن ہے۔ ہر شب دو چار ڈکیتیوں کی خبریں ملتی ہیں۔ اور کوئی علاقہ محفوظ نہیں اور پولیس نہ سنتی ہے نہ مدد کرتی ہے۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ اکثر ڈکیتیوں میں پولیس کا باقاعدہ حصہ ہوتا ہے۔

پچھلے دنوں پورے ملک میں نزلہ زکام اور فلو کی لہر تھی۔ ہم اپنی باری دے چکے۔ امید ہے آپ کی طبیعت اب اچھی ہوگی۔

اگر سالنامہ اور اس کے ساتھ مجھ سے متعلق گوشے کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس میں نہ پریشانی کی بات ہے نہ کسی وضاحت کی نہ کسی معذرت کی۔ میرے لیے تو اس کی اہمیت صرف اور صرف اس امر میں ہے کہ یہ آپ کی محبت کا تحفہ ہے۔ بس۔ آپ نے کہہ دیا، تحفہ مجھے مل گیا۔

آپ نے مجھ سے علمی تعلق کا ذکر جس احترام سے کیا ہے، میں اس پر بھی آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے — لیکن ایک بات ضرور عرض کروں گا۔ یہ خوشی نامکمل رہ گئی کیوں کہ آپ نے ایم اے انگریزی کو بیچ میں چھوڑ دیا۔ حالاں کہ آپ جیسے ذہین شخص کے لیے یہ کارِ دشوار ہرگز نہ تھا۔ میری خواہش ہے کہ آپ دوبارہ اس کا عزم کریں اور فائنل ائیر کا امتحان بھی دے ڈالیں۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا بس جب بھی جتنا بھی وقت ملے تیاری کریں۔ مجھے یقین ہے آپ آسانی سے فائنل ائیر کا امتحان بھی پاس کر لیں گے۔ اس کے بعد چاہیں تو اردو میں بھی ایم اے کر لیں۔ وہ تو آپ کے لیے بہت آسان ہوگا۔

It is never too late for a good turn.

آپ کو شاید میں نے بتایا ہو کہ میری تعلیمی زندگی میں کتنی رکاوٹیں اور دشواریاں تھیں۔ پہلے تو یہ ہوا کہ میرے والد کانگڑہ میں محکمہ بجلی (آج کل واپڈا) میں ملازم تھے۔ وہاں برف پڑتی تو وہ ہمیں یعنی اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو ننھیال یعنی گورداس پور بھیج دیتے۔ میرے ماموں کاروباری لوگ تھے، مڈل پاس ضرور تھے لیکن تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ ہم سب بھائیوں کے مسلسل تین سال ضائع ہو گئے۔ میٹرک میں نے لدھیانہ سے کیا۔ امتحان دینے اور انٹر میں داخلے کے درمیانی وقت میں ٹائپ سیکھا کہ نوکری کر لیں لیکن نہ کی اور انٹر میں داخل ہو گئے۔ انٹر کا امتحان ۱۹۴۷ء کے باعث وقت پر نہ ہو سکا۔ لاہور آکر دسمبر ۴۷ء اور جنوری ۴۸ء میں دیا۔ یونیورسٹی بھر میں تیسری پوزیشن آئی۔ وظیفہ کے حق دار ٹھہرے لیکن والدین یا کسی بزرگ کو معلوم ہی نہ تھا کہ انجینئرنگ کالج میں داخلہ کیسے ہوتا ہے۔ مجھ سے دو دو سو کم نمبر والے داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی نے ۱۹۴۹ء میں ایک گشتی مراسلہ تمام کالجوں کو جاری کیا جس میں وظیفے حاصل کرنے والوں میں میرا نام تھا۔ میں یونیورسٹی پہنچا معلوم ہوا کہ چونکہ میری پڑھائی میں تسلسل نہیں رہا اس لیے میں وظیفے کا حق دار نہیں رہا۔ دکھ تو ہوا مگر میں اسے بھول کر کسی اور راستے کی تلاش کرنے لگا۔ گھر کی مالی حالت بہت خراب تھی سو واپڈا میں کلرکی کر لی۔ ۱۹۴۹ء میں پرشین آنرز کیا پھر انگریزی لازمی میں اچھے نمبر آئے۔ ساتھ ہی ترقی مل گئی۔ میں چار برس میں اسسٹنٹ ہو گیا اور ساتھ ہی گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی کے لیے داخلہ لے لیا۔ ابھی تو زندگی کی کوئی منزل سر نہ ہوئی تھی کہ والد ریٹائر ہو گئے ۱۹۵۲ء میں اور پھر ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ابھی ایم اے Previous کا امتحان نہیں ہوا تھا۔ چھ چھوٹے بہن بھائی تھے۔ سرکاری کوارٹر چھن گیا۔ ہمیں بھی پڑھائی چھوڑنا پڑی۔ ایک سال گزرنے کے بعد پھر عزمِ سفر باندھا۔ بہت سی مالی دشواریوں اور عدم فرصتی نے مسائل پیدا کیے۔ فائنل کی تیاری کے لیے رخصت لی مگر اس کا بڑا حصہ بغیر تنخواہ کے تھا۔ بہت خوشامدوں کے بعد ایک عزیز سے کچھ رقم قرض لی۔ بہرحال اللہ کا کرم رہا اور بالآخر ۱۹۵۵ء میں ایم اے ہو گیا — اصل بات جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی مجھ پر مایوسی اور کم ہمتی اور عدم حوصلہ کی کیفیت کا حملہ نہیں ہوا حالانکہ میں ان دنوں بھی کوئی مذہبی آدمی نہ تھا — اللہ لوگ ضرور تھا اور وہ ہمیشہ سے ہوں اور رہوں گا۔ شاید طبیعت کی فقیری کام آتی رہی۔ آج میں حیران ہوتا ہوں کہ حوصلہ قائم کیسے رہ گیا۔ بعد میں بارہ برس یونیورسٹی میں رجسٹراری کی۔ اس پر حیران ہوں کہ میں کیسے کامیابی کے ساتھ اور ''دامن تر'' کیے بغیر اس خوفناک جنگل سے بچ کر نکل آیا — یہ ایک معمولی سی مثال ہے۔ بے شمار مثالیں دنیا میں ہیں۔ شیر زمان، وائس چانسلر او پن یونیورسٹی اور کئی اہم عہدوں پر فائز لوگوں کا ماضی میرے ماضی سے بھی زیادہ غریب اور حوصلہ شکن رہا ہے۔ آپ پر اللہ کا کرم ہے کہ کوئی بڑا مالی مسئلہ نہیں ہے سو آپ کو ایم اے ضرور کرنا چاہیے۔ مجھے پورا یقین ہے، ہو جائے گا۔ انشاء اللہ

میں آپ کے خط کا فوری جواب لکھ رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ جواب کا شدت سے انتظار کرتے ہیں اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ انتظار سے پریشان اور اداس ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کتابیں بعد میں بھیجوں گا — کوشش کیجیے کہ پریشانی اور اداسی کو آنے سے پہلے پہچان لیں، ان کا استقبال کریں کہ ان کا کردار پر مثبت اثر بھی ہو سکتا ہے، خاص طور پر آپ جیسے ذہین اور حساس ادیب شاعر پر۔ بشرطیکہ وہ ان سے مغلوب نہ ہو۔

عرش صدیقی

مثالی قائد

ملے گا کب کوئی قائد مثالی
بڑھی حد سے ہماری خستہ حالی
طلوعِ صبح کے ہم منتظر ہیں
کٹے گی کب یہ لمبی رات کالی

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

براہِ راست

کچھ لوگ اپنی ذات میں انجمن، کچھ ادارہ اور کچھ انسٹی ٹیوٹ ہوا کرتے ہیں۔مبین مرزا صاحب سے ملنے کے بعد آپ کے دل میں نئی لفظیات اور نئے معنی ومفہوم سراُبھارنے لگتے ہیں۔مرزا صاحب کے خاندانی پس منظر کے علاوہ اُن کی ذات کی سچائی اور بانکپن آپ کو گرویدہ تو کر ہی لیتا ہے بلکہ بار بار ملنے کے لیے اُکساتا بھی ہے۔
اسی خواہش کے پیشِ نظر ہم نے آج کی علمی، ادبی اور سخنی محفل آراستہ کرکے آپ کے لیے مبین مرزا کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے مواقع مہیا کر دیے ہیں۔آپ کو اختیار ہے کہ آپ جس شکل میں اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیں بصد شوق کیجیے اور مبین مرزا صاحب کے فنی محاصل کو کم ازکم اتنی واضح سمت ضرور بتلا دیجیے جس پر گزر کر وہ اپنا سفر نہ صرف جاری رکھ سکیں بلکہ بہت کچھ ایسا کر سکیں جس کی خواہش ان کے دل میں اور ہمارے دماغوں میں ہے۔

.....گلزار جاوید

☆ سمت اور قبلہ درست رکھنے کی غرض سے گفتگو کا سلسلہ آپ کے مغلیٰ پس منظر سے شروع کرنا ضروری ہی نہیں لازمی بھی ہے؟

☆☆ اچھا اب پس منظر کا معاملہ یہ ہے کہ ماضی میں بہت دور تک جاتا ہے،لیکن بہتر ہے کہ ہم اپنے زمانے کوسامنے رکھتے ہوئے بات کریں۔یوں ہے کہ ہمارے ابا جان قیام پاکستان کے فوری بعد کے دنوں میں دلی سے آئے تھے۔ابتدا میں کچھ وقت ان کا لاہور اور کراچی میں گزرا، بعدازاں ملتان میں سکونت اختیار کی۔اس کے کچھ اور اسباب بھی ہوں گے،لیکن ایک اہم سبب یہ تھا کہ ہماری پھوپھی جان اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ملتان آکر آباد ہوئی تھیں۔وہ ابا جان سے عمر میں خاصی بڑی تھیں اور وہی ہمارا کل ددھیال تھیں۔
جب ہم نے ہوش سنبھالا اس وقت ہمارے گھر میں مرصع اردو یا آپ کہیے کہ قلعہ معلّٰی کی اردو تو نہیں بولی جاتی تھی،لیکن ہاں زبان وبیاں کی غلطی پر فوراٹوکا جاتا تھا۔ابا جان کو ہم نے کبھی پلیٹ کہتے نہیں سنا، وہ ہمیشہ رکابی کہتے تھے۔اسی طرح کھاناڈالیے نہیں کہا جاتا تھا،کھانا لیجیے یا اتاریئے کہتے تھے۔گھر کے ماحول کی ان چیزوں نے مزاج بنانے میں ظاہر ہےایک کردارادا کیا۔
ہماری پیدائش ملتان کی ہےاور گریجویشن تک کازمانہ وہیں گزرا۔ہم سے پہلے گھر میں کوئی ادیب شاعر تو نہیں تھا،لیکن کتابوں سے دل چسپی کا ماحول ضرور تھا۔پڑھنے کی عمر شروع ہوئی تو گھر میں نونہال، تعلیم وتربیت، بچوں کی دنیا اور بچوں کا باغ جیسے رسالے آنے لگے۔یوں اوائل عمری سے ہی پڑھنے پڑھانے سے دل چسپی ہوگئی جو آگے چل کر لکھنے لکھانے کی طرف بھی لے آئی۔اباجان ایک عملی آدمی تھےلیکن جب ہمارے لکھنے کا انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے خوشی کا اظہار کیااور ہمیشہ خوش ہوتے رہے۔تو بس یہ سب رہا۔

☆ آپ کی تربیت میں بالواسطہ یا بلا واسطہ دہلی، ملتان، لاہور، کراچی کی آمیزش نے شخصی طور پراور تخلیقی سطح پر کس نوع کے گُل بوٹے کاڑھے ہیں؟

☆☆ اس سلسلے میں سب سے اہم بات جوہم محسوس کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جہاں بھی رہنا ہوا وہاں اپنے عہد کے اچھے اور بڑے لوگوں کی صحبتیں میسر آئیں۔ملتان میں پروفیسر عرش صدیقی، ڈاکٹر اسلم انصاری، علامہ عتیق فکری، سید عطاالمحسن بخاری، سید عطاالمومن بخاری، لاہور میں احمد ندیم قاسمی، وزیرآغا، شہزاد احمد، سراج منیر، تحسین فراقی، یونس جاوید اور کراچی میں مشتاق احمد یوسفی، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی، حمید نسیم، قمر جمیل، جمال پانی پتی، مشفق خواجہ، ضمیر علی بدایونی، سید مظہر جمیل، پروفیسر سحر انصاری ایسے اہل علم ودانش کی صحبتیں اٹھانے اور بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع ملا۔یہ سب لوگ سینئر تھے یا ہیں،لیکن ایک حد تک سبھی سے دوستانہ ماحول کے مراسم رہے۔اچھا پھر یہ ہے کہ جب آدمی کئی ایک شہروں میں رہتا ہےتو زندگی کا ایکسپوزر اور تجربات کا دائرہ بڑھتا ہے جوایک لکھنے والے کے تخلیقی اظہار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ایسا ہمارے کام میں کس حد تک ہوا ہے،اس کا اندازہ دوسرے لوگ کرسکتے ہیں۔

☆ آپ کے قریبی دوستوں سے ہم کسی قدر آگاہی رکھتے ہیں۔آج کی نشست میں اُن خوش نصیبوں کے نام بتلایئے جنہوں نے اپنی محنت اور لگن سے خودکو آپ کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی؟

☆☆ ہاہاہاہا۔دل چسپ سوال ہے یہ، ان معنوں میں کہ جواب دیتے ہوئے ذراسا سوچنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔خیر،اس سے پہلے ہم نے کبھی اس زاویے سے سوچا نہیں۔خیال ہی نہیں آیا کبھی ایسا۔دیکھیے، ہماری دانست میں دشمنی کے معاملے میں آدمی کو ہمیشہ ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔دوستی میں اگر آپ سے چوک ہوجائے تو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔آپ اسے نبھالے جاسکتے ہیں، لیکن اگر دوستی دشمنی کا فیصلہ بے احتیاطی سے کیا جائے تو اس کی بڑی قیمت چکانی پڑ سکتی ہے۔اس لیے کہ چھوٹا اور گھٹیا دشمن بار بار آپ کو اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔آپ کو اپنے معیارات سے اتارنے کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔سو یہ قدرے احتیاط سے کرنے والا کام ہے۔

ہر آدمی کی زندگی میں پسند اور ناپسند کرنے والے لوگ ہوتے ہیں سو ہماری زندگی میں بھی ہوں گے۔اان میں کچھ ایسے لوگ بھی رہے کہ جن سے واسطہ پڑااور دھواں دار جھگڑے کی نوبت بھی آئی۔اب سنیے کہ یہ کون لوگ تھے۔ ایک ساقی فاروقی اور دوسرے احمد جاوید (لاہور والے)۔ ساقی صاحب سے تو جلد ہی معاملات سدھر گئے تھے اور پھر زبردست دوستی ہوگئی۔احمد جاوید صاحب سے بھی اب صاحب سلامت ہے۔کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو ہم سے بگڑتے ہوں گے،لیکن بوجوہ بچارے شاید سامنے نہیں آتے یا ممکن ہے، ہم ہی ہماشا کو خاطر میں نہ لاتے ہوں۔ہاہاہا۔

☆ دیارِ یار کے مبین مرزا، افسانہ نگار مبین مرزا، ناول نگار مبین مرزا، شاعر مبین مرزا، مترجم مبین مرزا، تنقید نگار مبین مرزا، مکالمہ کے مدیر مبین مرزا اکادمی بازیافت کے روحِ رواں مبین مرزا۔۔۔اتنی ڈھیر ساری ذمہ داریاں اور ایک جانِ ناتواں۔۔۔قطرے کے گہر ہونے تلک کی داستان کا بیان آپ ہی کو زیب دیتا ہے؟

☆☆ بھائی یہ تو آپ کا حسنِ ظن ہے کہ ہر شعبے میں کامیاب و کامران گردانتے ہیں۔کسی کی رائے آپ سے مختلف بھی ہوگی بلکہ بہت سوں کی ہوسکتی ہے۔ممکن ہے وہ ہمیں کہیں بھی شمار نہ کرتے ہوں۔خیر، اللہ آپ کی زبان مبارک کرے اور زندگی میں کچھ ایسا ہو پائے جو جینے کے عمل کو بامعنی ثابت کرتا ہو۔

اب یہ جو مختلف شعبوں میں کام کرنے کی بات ہے، اس کی بابت ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس میں آدمی کے اختیار کا کچھ ایسا عمل دخل نہیں ہے۔مراد یہ کہ ایک آدمی میں شعر کہنے یا افسانہ لکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ بے چارہ خواہش کے باوجود یہ کام نہیں کرسکتا، یعنی یہ قدرت کی دین ہے۔اب رہ گئی بات ایک سے زیادہ شعبوں میں اپنی توانائی کو بروئے کار لانے کی، اس کا کچھ تھوڑا بہت کریڈٹ آدمی لے سکتا ہے،لیکن سچ پوچھیے تو یہ معاملہ بھی توفیق کا ہے۔اگر توفیق ہی نہ ہو تو آدمی تنکا توڑنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا۔زندگی میں ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ ان کی غیر معمولی صلاحیت کا اعتراف کیے بغیر آدمی نہیں رہ پاتا،لیکن اس کے ساتھ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ صلاحیت کے باوجود ایک شخص کوئی بڑا کام نہیں کر کے دکھا پاتا۔ایسی بے توفیقی نظر آتی ہے کہ آدمی رائگاں جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ ایک آدمی اپنے تئیں بڑی توپ چلا رہا ہے،لیکن کہیں اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا جارہا،کوئی اسے توجہ کے لائق ہی نہیں گردانتا۔اب بتائیے کہ اس کا کیا ہوسکتا ہے۔ان سب باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو آپ ہی بتائیے کہ آدمی کس چیز کا کریڈٹ لے اور بھلا کس منہ سے لے۔

☆ افسانوی ادب میں آپ کا طلوع علامتی اور تجریدی ادب کے غروب کے ساتھ ہوا اور بیانیے کی روایت نے جڑ پکڑنا شروع کی۔آپ نے فنی سفر کی ابتدا میں کن رویوں کو کام میں لاکر اپنی جستجو کو آگے بڑھانے کی سعی کی؟

☆☆ ہماری نسل کے لوگوں نے یہ بات ابتدا ہی میں محسوس کر لی تھی کہ افسانے میں اظہار کے جو طریقے چل رہے ہیں، تکنیک اور اسلوب و بیاں کے جو تجربات کیے گئے ہیں ان میں سے کتنے ہی ہمارے کام کے نہیں ہیں۔اس کا سبب یہ تھا کہ ہماری زندگی کے حقائق و واقعات ہی بہت مختلف نوعیت کے تھے۔ آپ یاد کیجیے، ۸۰ کی دہائی، یہ وہ زمانہ ہے کہ دنیا میں وہ تبدیلیاں نظر آتی ہیں کہ جو ایک آدمی سے لے کر پورے سماج تک رویوں کی کایا کلپ کا ذریعہ بن رہی تھیں۔انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایسی تبدیلیاں آئی تھیں اور آئے چلی جاتی تھیں کہ ان کو مروجہ تکنیک اور اسالیب کے ذریعے اس طرح تخلیقی تجربے میں سمیٹنا بڑی معنوی تشکیل کے لیے کارآمد محسوس نہیں ہوتا تھا۔اچھا پھر ہمیں یہ بھی لگتا تھا کہ اپنی الگ شناخت کے لیے ہماری نسل کو یوں بھی کچھ الگ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ہم اپنے سے پہلے کے تخلیق کاروں کا محض ایک تسلسل ہو کر رہ جائیں گے۔اس مسئلے کو ہمارے کئی نقادوں نے سمجھا اور بیان کیا ہے۔ابھی کچھ عرصہ پہلے مرزا حامد بیگ نے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔

خیر، تو بس یہ چیزیں تھیں جو تخلیقی سفر کی ابتدا میں محسوس ہوئیں تو ہم نے شعوری طور پر تکنیک اور اسلوب کے کچھ تجربات اپنے انداز سے کرنے کی کوشش کی، مثلاً یہ کہ ہم نے سماجی حقیقت نگاری اور علامت نگاری کو ملا کر اظہار کیا، عصری حسیت کی معنویت کو تاریخ کے ریفرنس کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی یا یہ کہ سیاسی اثرات کو تہذیبی تناظر میں رکھ کر دیکھا۔اب یہ تجربے کس حد تک کامیاب رہے، یہ بات اہلِ نظر ہی بتا سکتے ہیں۔

☆ ترقی پسند افسانہ نگاری کے خلاف علامت اور تجریدی افسانہ نگاروں کے ردِعمل میں بیانیہ افسانہ نگار دیوار کی اوٹ میں چھپے ہوئے کیوں تھے۔اس حوالے سے آپ کی رائے اور عمل ریکارڈ پر لانا ذمہ داری کا تقاضا بھی ہے اور حقیقت سے پردہ کشائی بھی؟

☆☆ اس مسئلے کو ہمیں دو زاویوں سے دیکھنا چاہیے۔ایک تو یہ کہ ترقی پسند تخلیق کار بیانیہ روایت کو جہاں تک لا سکتے تھے، وہاں لا کر وہ خود بھی ٹھہر گئے تھے۔اب ایک ایسی یکسانیت پیدا ہوگئی کہ موضوعات اور اظہاری اسالیب تک میں انجماد آگیا۔لہٰذا ایک ایسی تبدیلی کی ضرورت کا احساس فطری بات ہے جو اس انجماد کو توڑے۔دوسرا زاویہ اپنی جگہ اہم ہے۔وہ یہ کہ کسی بھی ادبی روایت میں تبدیلی کے محض مقامی اسباب ہی بنیاد نہیں بنتے، بلکہ ایک بڑا انسانی دائرہ اس کا جواز فراہم کرتا ہے۔ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد سماجی حقیقت نگاری کے بیانیہ نے جن معنوی سطحوں کو چھو لیا تھا، اس کے بعد اس میں امکانات سمٹ گئے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ عالمی تناظر بھی اظہار و بیاں کی نئی فضا ہموار کر رہا تھا۔چنانچہ تبدیلی ناگزیر تھی۔

☆ مبین مرزا کے افسانوں میں مردہ معاشرے کی نت نئی تصویریں، خوف و دہشت کی پرچھائیوں میں لپٹی بستیاں اور موت کے انتظار میں لٹکتے سوگ، جیسے پہلے تھے ویسے اب ہیں۔آپ نہیں سمجھتے آپ کی جستجو اور سعی رائیگاں گئی؟

☆☆ دیکھیے بات یہ ہے کہ کوئی بھی لکھنے والا اپنے معاشرے میں نون

کنفورمسٹ ہوتا ہے۔معاشرے میں جوخرابیاں رواج پارہی ہوتی ہیں، وہ ان کو محسوس ہی نہیں کرتا، ان کے خلاف آواز بھی اٹھاتا ہے، انھیں رد کرتا ہے، لیکن وہ معاشرے میں کسی براہ راست تبدیلی کا مکلّف نہیں ہوتا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔اس لیے کہ معاشرے میں تبدیلی کے لیے قوت نافذہ درکار ہوتی ہے جو اہل سیاست یا اہلِ اقتدار کے پاس ہوتی ہے۔اس لیے ادیب کی کامیابی یا ناکامی اس سے نہیں ماپی جا سکتی کہ وہ اپنے سماج میں کیا تبدیلی لایا ہے۔اس کا کام تو اظہار کرنا، آواز اٹھانا اور اپنا ردِعمل دینا اور نشان دہی کرنا ہے اور بس۔اس کی کامیابی کا اندازہ آپ اس امر سے کر سکتے ہیں کہ جو وہ کہہ رہا ہے، آیا وہ واقعی غور طلب ہے یا نہیں۔دوسرے یہ کہ جو وہ آپ تک پہنچانا چاہتا تھا، اس کا ابلاغ پوری طرح ہو رہا ہے یا نہیں۔

☆ آپ نے پرانے زمانے کی کہانیوں کو موجودہ دور کے حالات میں ڈھال کر حکمرانوں کو آئینہ دکھانے کی جو کوشش کی اُس میں کس حد تک کامیابی ملی؟

☆☆ بھائی ماجرا یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے ایک مدت سے آئینہ دیکھنا ہی چھوڑ رکھا ہے، تو اب ان کو کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رہ گئی بات لکھنے لکھانے کی، اس کا معاملہ وہی ہے، اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے۔

☆ جدید دور کے انسان کو درپیش جن صعوبتوں کا ذکر آپ کے افسانوں میں کیا جاتا ہے آنے والے زمانے کی ہولناکیوں کا ہلکا سا شائبہ بھی ذہن میں ہوتا تو مصنف ہرگز انہیں صعوبتیں نہ گردانتا؟

☆☆ پہلی بات تو یہ کہ مستقبل ایک پردے کی چیز ہے، اس کی بابت ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں، وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔دوسری بات یہ حالات کتنے بھی تشویش ناک ہوں، لکھنے والا امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔امید حوصلہ دیتی ہے، جینے کی امنگ کو قائم رکھتی ہے۔اگر امنگ ختم ہو جائے تو زندگی ایک لایعنی شے ہو کر رہ جاتی ہے۔ادیب کی ذمہ داری ہے کہ ہولناکی کا اندازہ لگانے کے باوجود امید اور حوصلے کا سامان کرے۔اپنے پڑھنے والوں کو اندھی گلی میں لے جا کر بے آسرا نہ چھوڑ دے۔

☆ آپ کے افسانوں میں کردار سازی کا ذکر قابل توجہ ہے۔آپ کے کردار معاشرے میں موجود کرداروں سے مشابہہ ہوتے ہیں یا آپ کا تخیل نئے کردار تراشتا ہے؟

☆☆ ہمارا خیال ہے، کوئی بھی تخلیقی ادیب جو کچھ اپنے معاشرے میں دیکھتا اور اس سے لیتا ہے، اسے وہ من وعن پیش نہیں کرتا۔اس لیے کہ ایسا کرنا تخلیقی عمل کے مزاج کے خلاف ہے۔وہ اس میں کچھ اپنے تخیل سے شامل ضرور کرتا ہے اور یہ اضافہ ہی اس میں نئی جہت پیدا کرتا اور پڑھنے والوں کے لیے معنی خیز بناتا ہے۔سو ہم نے بھی اپنے تئیں یہ کوشش کی ہے کہ جو کچھ پیش کریں وہ نقالی نہ ہو بلکہ تخلیقی عمل کا مظہر ہو۔

☆ فخر آپ غزل کے شاعر ہونے پر کرتے ہیں مگر کثرت سے نظمیں کہہ کر خوب داد اور واہ واہ بھی بٹور رہے ہیں؟

☆☆ ہاہاہا۔ یہ تو آپ نے دل بڑھانے والی بات کی۔ ویسے یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ پڑھنے والے کا لکھنے والے کی کسی بھی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆ آپ کے ہاں برتی گئی تراکیب حسن اندازہ، افتخار جاں، پیہم شناسائی، غالب، مومن، فیض اور جذبی سے مستعار بتلانے والے آپ کی تحسین کر رہے ہیں یا تنقید کی چرکے لگا رہے ہیں؟

☆☆ لکھنے والے کی طرح ہر پڑھنے والا بھی اپنے ذہنی سیاق میں کسی تحریر کو دیکھتا ہے اور اس کو ماسبق مطالعے سے منسلک کرتا ہے۔اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں سے استفادہ ہے یا فلاں کا اثر ہے تو اسے پڑھنے والے کی ذاتی رائے سمجھنا چاہیے۔ ہاں اگر یہ بات ایک اعتراض کی صورت میں کہی جائے تو پھر اسے لکھنے والے کی خامی باور کیا جائے گا۔ ہماری بابت جن اثرات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ منفی نہیں مثبت رخ کے طور پر ہے۔ ہمیں تو ایسا ہی محسوس ہوا ہے۔

☆ آپ کی نظم ''سے ساگر کی کتھا'' میں محترمہ قرۃ العین حیدر کی اُنگلی تھامنے کی اصطلاح ایجاد کرنے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

☆☆ اس نظم میں قرۃ العین حیدر صاحبہ کا حوالہ تخلیقی رو میں آیا ہے، دانستہ لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ہمارا احساس یہ ہے کہ اردو فکشن میں وقت محض کے عمل کو سمجھنے اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات کو بیان کرنے کا جو کام قرۃ العین حیدر صاحبہ نے اپنی نگارشات میں کیا ہے، وہ بے حد غیر معمولی اور کچھ انھی کا حصہ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی احساس دراصل اپنے عہد کی ایک بڑی تخلیقی شخصیت کو خراج تحسین کے طور پر اس نظم میں در آنے کا سبب ہے۔

☆ اردو شاعری میں لسانی اور ہئیتی تجربوں کے نام جو کچھ ہو رہا ہے اس سے آپ کے ہاں کس حد تک اطمینان پایا جاتا ہے؟

☆☆ یہ کام تو ایک طویل عرصے سے ہمارے یہاں ہو رہا ہے۔ اس کے حق میں اور خلاف دونوں طرح کے خاصے دلائل بھی سامنے آ چکے ہیں۔حالیہ دورانیے میں کوئی ایسی نئی چیز تو سامنے نہیں آئی جس کی بابت یہ کہا جائے کہ یہ اہم یا توجہ طلب ہے۔اب رہی یہ بات کہ اب تک جو تجربات ہوئے ہیں، ان کی کیا حیثیت ہے تو سب سے پہلے اصول کی سطح پر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ادب میں تجربات کا ہونا اچھا ہے، مفید ہے، بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔اس لیے کہ ایسے ہی تجربات کے نتیجے میں ادب میں بدلتے زمانے کے تناظر میں نئے اور بڑے کام کا امکان پیدا ہوتا ہے۔تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں نئے تجربات کے نام پر شاعری میں خاصی چیزیں ایسی بھی ہوئی ہیں جو سراسر لغو اور لایعنی تھیں۔ وہ شعر و ادب میں کسی جہت یا نئے امکان معنی کا در تو کیا کھولتیں الٹا شاعری سے لوگوں کو بدظن کرنے کا ذریعہ بنیں۔ یہ جو آج کل آپ ٹی وی پر شاعروں کا مذاق اڑتے ہوئے اور ان کو عوام کی تضحیک کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھتے ہیں، اس کی بنیاد میں کہیں آپ کو ایسے ہی شعری تجربات کا بھی اثر نظر آئے گا۔

☆ ذرا اُن عدسوں، خوردبین یا دوربین پر روشنی ڈالیے جن کی مدد سے

عصری شاعری کا درست طریق پر جائزہ لیا جاسکتا ہے؟

☆☆ کسی بھی عہد اور تہذیب کے ادب کو پڑھنے، سمجھنے اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے ہمیں بنیادی اصول بھی اسی عہد اور تہذیب سے فراہم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جو ادب کی تفہیم و تنقید میں اس کی intrinsic value کا تعین ہوتا ہے وہ اس تہذیب کی اقدار کے تحت ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ادب و شاعری میں غیر متغیر قدر اور انسانی جہت کا تصور بھی دراصل تہذیب کے نظام اقدار ہی کے حوالے سے اپنے معانی کا اظہار کرتا ہے۔ اب اگر یہ بنیادی نکتہ پیش نظر ہو تو معاصر شاعری کے مطالعے اور اس کی معنویت کی تفہیم میں سہولت ہو سکتی ہے۔ ہمارے یہاں اس وقت جو غزل اور نظم کہی جا رہی ہے، اس میں انسانی تجربے اور احساس کی وہی صورتیں نمایاں ہیں جو ہمارے معاشرے کی زندگی کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ منٹو نے ویسے تو یہ بات ایک خاص سیاق میں کہی تھی کہ اگر یہ افسانے ناقابل برداشت ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یہ معاشرہ ناقابل برداشت ہے، لیکن اس کا اطلاق ادب کی تمام اصناف پر ہو سکتا ہے۔ آپ کو اگر آج اپنی شاعری میں اداسی کے چٹیل میدان نظر آتے ہیں، روح کی ویرانی دکھائی دیتی ہے، شعور کی پیچیدہ پگڈنڈیاں اور احساس کے آڑے ترچھے راستے یہاں ملتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے یہاں انسانی تجربے کی صورت حال ایسی ہے کہ جو تخلیق کار کے اندر شعور و احساس کی انھیں کیفیات کو پیدا کر رہی ہے۔ اس شاعری کو ہمیں اپنے عہد کے انسانی سیاق میں پڑھنا اور سمجھنا چاہیے، اور شاعر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ ہمیں اس منظرنامے کے سامنے لایا ہے۔

☆ آپ کی شاعری کے بطن سے نئی کروٹ، نئے رُخ، نئے آہنگ اور فلسفے کی بات کر کے تحسین فراقی صاحب نے حقِ دوستی کیا ہے یا سنجیدگی سے کسی نئی کھڑکی کی نشان دہی فرما رہے ہیں؟

☆☆ ہمارا خیال ہے کہ یہ سوال تو تحسین فراقی صاحب سے کیا جانا چاہیے۔ ویسے یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ وہ ادبی معاملات میں رائے دیتے ہوئے ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں دوست داری کا نہیں۔

☆ سحر انصاری صاحب جس طریق پر آپ کے تراجم کو سراہ رہے ہیں اُس میں نقاد سے زیادہ التفات کا پہلو کیوں نمایاں ہے؟

☆☆ یہ سوال سحر انصاری صاحب سے کیا جائے تو بہتر جواب حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ اس عہد کے اہل نظر میں ہیں، مدلل اور مسکت جواب دے سکتے ہیں۔

☆ میر، فیض، ناصر، یاس یگانہ، میرا جی، راشد، مجید امجد سے اکتساب کا ذکر کرنے یا قلبی تعلق پر زور دینے والے وجوہات پر روشنی ڈالنے سے گریزاں نظر کیوں ہیں؟

☆☆ اس کی بابت ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ بس یہ سوچا جا سکتا ہے کہ بات کو اختصار سے کہنے کی وجہ سے حوالوں سے اجتناب کیا گیا ہوگا۔

☆ سلیم یزدانی صاحب نے اس تواتر سے آپ کی نسبت درویش کی گردان کی ہے کہ قاری کے ذہن میں آپ کی شخصیت کا باریش تصور ابھرنے لگتا ہے؟

☆☆ ہاہاہاہا۔ ویسے ہمارے یہاں بے ریش درویش بھی گزرے ہیں۔ تاہم ان باتوں کی وضاحت خود سلیم یزدانی صاحب سے طلب کی جانی چاہیے، ہم سے نہیں۔

☆ آگے چل کر یزدانی صاحب آپ کی شخصیت کو پُر اسرار بتلا کر ابہام یا اشتیاق پیدا کرتے نظر آتے ہیں؟

☆☆ اسے آپ طرزِ تحریر کہہ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے پڑھنے والا دل چسپی سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

☆ حتیٰ کہ ایک جگہ تو یزدانی صاحب تمام حدود پار کرتے ہوئے آپ کی دوستی سے باز رہنے کی تاکید کرنے کی انتہا کو پہنچ گئے؟

☆☆ ممکن ہے یہ مشورہ سچائی سے دیا گیا ہو۔ ہاہاہاہا۔

☆ آپ کے بارے ایک رائے یہ بھی ہے کہ آپ نے تہذیب کے نام پر تصنع یا تکلفات کی بے جا فصیل اپنے گرد قائم کی ہوئی ہے؟

☆☆ کیا جایے تو نے اسے کس آن میں دیکھا والا معاملہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ سب کو اپنے زاویے سے دیکھنے اور اپنی رائے بنانے اور اس کے اظہار کا حق ہے۔

☆ آج کی نشست میں اُن شرائط کی پردہ کشائی کیجیے جن پر آپ کسی صورت سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں؟

☆☆ بات یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ باتیں، چیزیں یا معاملات ہر شخص کی زندگی میں ایسے ہوتے ہی ہیں جن پر وہ کسی صورت سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری زندگی میں بھی ایسا ہوگا۔ تاہم یہ معاملات ایسے نہیں ہوتے کہ آدمی ہر وقت ان کا نقارہ بجاتا ہوا گھومتا رہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بڑا مصنوعی سا عمل ہوگا۔ ہاں جب وقت یا حالات ایسا کوئی تقاضا پیش کریں تو پھر ان کا اظہار برملا ہونا چاہیے۔

☆ عشق کو آرزو انگیز اور انقلاب خیز قوت گرداننے والے تخلیق کار کے ذاتی تجربات، واردات کا بیان آج کی نشست کا خاصا ہونا چاہیے؟

☆☆ ادب و شعر ہی میں نہیں بلکہ جملہ فنون لطیفہ میں اور زندگی کے کتنے ہی بڑے کارناموں میں بے شک عشق کے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن اس پر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ عشق ایک بے حد نجی معاملہ ہے، بہت پرائیویٹ شے ہے۔ ہر جگہ اس کی کیفیت سراسر موضوعی ہوتی ہے، بالکل ذاتی، سبجیکٹو قسم کی۔ اس کی تہ در تہ کیفیت اور اظہار کی صورتوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے، اس کی لطافت کی داد دی جا سکتی ہے، لیکن اسے بیان میں لانا مشکل ہے۔ بیان مکینیکل ہو جاتا ہے، اس میں سے لطافت رخصت ہو جاتی ہے۔

☆ فعالیت کے بغیر زندگی میں کچھ حاصل کرنا ناممکنات میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ کی نسبت جس زور، شور سے فعالیت کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ کس خاص حوالے یا سمت کی نشان دہی کرتی ہے؟

☆☆ دیکھنے والے اپنی نگاہ سے دیکھتے اور سراہنے والے اپنے زاویے سے کسی کام کو سراہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ جس رخ سے ایک شے ہمارے

نزدیک لائق داد ہے، دوسرے کے لیے بھی اسی طرح ہو۔ ہم اسی شے کو اہم یا قابلِ ستائش جانتے ہیں جس کو اہمیت دیتے ہیں۔ فعالیت کا بھی یہی ہے۔ سب کے لیے یہ یکساں قابلِ داد نہیں ہوسکتی۔ ہم اگر ذاتی حوالے سے دیکھیں تو بس اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ ہم نے زندگی میں یہ کوشش کی کہ عملی معاملات کی طرف ہمارا رویہ عملی ہو۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ سمجھ لیجیے کہ ذمہ داریوں کی طرف ہم نے تغافلِ عارفانہ اور تجاہلِ شاعرانہ اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کام کو کام کی طرح دیکھا اور کیا۔ اسی کو یار لوگ فعالیت کہتے ہوں گے۔

☆ جو لوگ آپ کی نسبت پرفیکشنسٹ کا تصور قائم کیے ہوئے ہیں اُس کا کوئی سبب، جواز یا دلیل تو یقیناً ہوگی۔ اس طرح کی توقعات انسان کی ذمہ داری بڑھا دیتی ہیں۔ آپ کے لیے احباب کی توقعات پر پورا اُترنا کس طور ممکن ہوتا ہے؟

☆☆ درست بات کہی ہے آپ نے۔ اس قسم کی توقعات ذمہ داری میں اضافہ کرتی ہیں۔ اب اگر آدمی مزاجاً چیزوں کو سنبھال کر اور قرینے سے کرنے کا عادی ہے تو پھر کوئی دقت نہیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو بلاشبہ جان جوکھم میں پڑ جاتی ہے۔ ہمیں سہولت یہ رہی کہ گھر میں ایسا ماحول ملا جہاں کام کو سلیقے سے کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اصرار کیا جاتا تھا کہ جو کرو، یہ سوچ کر کرو کہ اچھے سے اچھا ہو۔ بس یہ بات گھٹی میں پڑی ہو تو پھر آدمی کو مشکل پیش نہیں آتی۔ اچھا پھر زندگی میں اساتذہ اور جو سینئرز ملے انھوں نے بھی کچھ اسی قسم کی باتیں سمجھانے سکھانے کی کوشش کی۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایسی کوئی کارآمد چیز زندگی میں ہے تو اس میں اصل کریڈٹ فیضانِ نظر اور مکتب کی کرامت دونوں ہی کو جاتا ہے۔

☆ کم کم لوگ اپنی خامیوں اور خوبیوں کی نسبت حقیقت پسند ہوا کرتے ہیں۔ آپ کی حقیقت پسندی کس نوعیت اور پیمانوں سے مشروط ہے اور اس پر عمل کرنے میں کس طرح کے مسائل کا سامنا رہتا ہے؟

☆☆ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی بابت سوچتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ خامیاں بے حد اور خوبیاں اکا دکا اور ان کے لیے بھی خوش گمانی سے کام لینا پڑتا ہے کہ بھئی ہاں یہ خوبی قیاس کی جاسکتی ہے۔ یہ احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور محکم ہوتا جاتا ہے۔ جب یہ عالم ہو تو بھلا بتائیے کہ آدمی کس منہ سے اپنی کسی خوبی کا اظہار کرے۔ ممکن ہے کہ اس بات میں انکسار کا رنگ جھلکتا ہو، لیکن یقین جانیے، یہ بات مبنی بر حقیقت ہے، اس میں نام کو بھی انکسار نہیں۔ اور ہم سے انکسار یوں بھی ممکن نہیں کہ ہم بادشاہوں کی اولاد میں ہیں، صوفیا کی نہیں۔ سو ہم اپنے معاملے میں مبالغہ تو کر سکتے ہیں، کسرِ نفسی سے کام نہیں لے سکتے۔ تو بس یوں جانیے کہ جو کہا سچ ہی کہا ہے۔

☆ موت سے پہلے موت کو گلے لگانے والے مردہ سماج کو جگانے کی کوشش کا نتیجہ کس شکل میں برآمد ہوا؟

☆☆ دیکھیے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے ایسی کیا توپ چلائی ہے ادب میں کہ جس کے برتے پر ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ اس کے ہمارے معاشرے پر گہرے اثرات ہوں گے، اتنے گہرے کہ اس کے رویے میں تبدیلی دیکھی جا سکے گی۔ ہم سے بدرجہا بڑے لوگ بہت بڑا بڑا کام کر کے جاچکے ہیں، جب ان کے کام کا ایسا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ہم بھلا کس شمار قطار میں۔ دوسری بات یہ کہ ادب سے ہمیں براہِ راست تبدیلی کی کوئی توقع رکھنی ہی نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ یہ ادب کے دائرۂ اختیار سے باہر کی چیز ہے۔ ادب آدمی پر اثرانداز ضرور ہوتا ہے، لیکن اس کی نوعیت داخلی قسم کی اور آہستہ رَو ہوتی ہے۔ جو لوگ ادب کے ذریعے سماج میں انقلاب کے خواہاں تھے، آپ نے ان کے حاصلات دیکھ لیے۔ سماجی انقلاب کا کام سیاست دان، انتظامیہ اور اقتدار کے لوگوں کا ہے۔ ادیب کا اس سے کچھ ایسا لینا دینا نہیں ہے۔ اسے اس غلط فہمی کا شکار ہی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ سماج کو بدلنے کے منصب پر فائز ہے۔ وہ تو اگر صرف چند لوگوں میں بہتر زندگی کا شعور پیدا کر سکے، ان کے اندر کچھ خواب جگا سکے، اپنی تہذیب کی اخلاقی و جمالیاتی قدروں کا ادراک پیدا کر سکے تو اس کے لیے یہی بہت ہے۔

☆ بجائے انسان کے جن بننے کی خواہش آپ کے سر میں کب اور کس سبب گھر کر گئی اور اس کے زیرِ اثر کیا کچھ کارنامے سرزد ہوئے؟

☆☆ ایسی باتیں کسی کے بارے میں اس کے محبت کرنے والے دوست کسی خوش گمانی اور جذبے کی فراوانی میں اڑا دیتے ہیں۔ ان کی بابت سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔

☆ جو ادیب، شاعر، عاشق یا دانشور دنیا کو جُوتے کی نوک پر رکھنے کی بات کرتے ہیں اُن کی بابت آپ کیا حاشیہ آرائی کرنا پسند کریں گے؟

☆☆ ادیب کا رویہ معاشرے کی طرف ایک حد تک ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا ایک صوفی کا ہوتا ہے۔ صوفی دنیا کو مسترد نہیں کرتا لیکن وہ اس کا دیوانہ بھی نہیں ہوتا۔ ادیب کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا کام دنیا کے بغیر نہیں چلتا، یعنی وہ جنگل میں بیٹھ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اسے زندگی کے تہ در تہ اور زندہ تجربے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے دنیا سے قطع تعلق اس کے لیے ممکن نہیں، لیکن اگر وہ دنیا کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیتا ہے، دنیا کی آرزو اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا کام، اس کا فن، اس کا ہنر چھوٹا پڑ جاتا ہے اور دنیا بڑی ہو جاتی ہے۔ ادب کی دنیا کے بڑے لوگوں کو آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں دنیا ہے ضرور، لیکن اپنی جگہ پر۔ وہ اسے جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں اور نہ سر پہ سوار کراتے ہیں۔

☆ مغل بچے جس پر مرتے ہیں اُسے مار رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں کتنے گھائل اور قتل ہوئے ہم نہیں جانتے البتہ آپ کا طرزِ عمل عین مین اس محاورے کو سچ ثابت کرنے پر تن، من، دھن سے جٹا ہوا ہے۔ جن ادباء، شعرا کے نام سُن کر احترام سے سر جھک جانا چاہیے آپ اُن کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ صاف لفظوں میں کہا جائے تو سیدھے منہ بات تک کرنا پسند نہیں کرتے؟

☆☆ اگر بات ادب و احترام کی ہے تو ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اسے اپنے ادبی اور سماجی روابط میں ملحوظ رکھا جائے، لیکن اگر معاملہ دبنے یا پچک جانے کا ہو تو ہم اس سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ محبت کی روایت سر آنکھوں پر لیکن

مرعوبیت کا ہمارے یہاں گزر نہیں۔

☆ محترم جمیل الدین عالی، جناب مسلم شمیم، جناب مظہر جمیل، پروفیسر فتح محمد ملک، جناب رؤف پاریکھ نے آپ کو بار بار اعلیٰ تعلیمی اداروں میں معقول پوزیشن کی ترغیب دی مگر آپ نے ہمیشہ کنّی کترا گئے؟

☆☆ یہ سب محبت اور اخلاص کے لوگ رہے ہیں، جو مشورہ انھوں نے دیا، اس میں بھی یقیناً بھلائی کی خواہش رہی ہوگی، لیکن بس ایک وقت پر ہم نے طے کر لیا تھا کہ اب ملازمت کے چکر میں نہیں پڑنا، سو نہیں پڑے۔

☆ اصولی طور پر تخلیق کار کا ارتقائی سفر تا عمر جاری رہتا ہے۔ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب تخلیق کار کے دل، دماغ میں اپنے کام اور جدوجہد کی نسبت اطمینان کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ آپ کے ہاں صورت حال کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ سچ یہ ہے کہ ہم تو ابھی اس اطمینان کی منزل سے بہت دور ہیں۔ لگتا ہے بہت کچھ کرنے کو ہے، اور کام کی رفتار حوصلہ افزا نہیں۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ناکردہ کاری کا احساس بھی بڑھتا جاتا ہے۔ خدا کرے کہ وہ کام ہو پائے جس کی قدرت نے صلاحیت دے کر بھیجا ہے۔

☆ اگر کم عمر اور کم وقت میں تکمیل تک پہنچنے کا دعویٰ کر لیا جائے تو آگے سفر جاری رکھنے کا جواز کیوں کر باقی بچتا ہے؟

☆☆ کم عمری کیا، یہ وہم تو اگر پختگی کے مرحلے میں بھی لاحق ہو جائے تو کام کی لگن، سفر اور ترقی کا جواز لایعنی ہو جاتا ہے۔ امکانات کی نفی ہو جاتی ہے۔

☆ روشنیوں کے شہر اور پاکستان کے دل کراچی پر گزشتہ تین دہوں تک جو سیاہ بادل چھائے رہے اُس کی دھند میں کیا کچھ بھسم ہوا اور اُس کا مداوا کس طور ممکن ہے؟

☆☆ کراچی کی بدقسمتی، افسوس صد افسوس بڑی ہمہ گیر قسم کی ہے۔ اس کے مالک تو سب بننا چاہتے ہیں، سب اس کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے کچھ کرنے پر کوئی آمادہ نہیں۔ اگر کرنا بھی پڑے تو اس کا مقصد دکھاوا زیادہ ہوتا ہے، اخلاص نام کو نہیں۔ یہ صورت حال ایوب خان کے دور سے آغاز ہوئی تھی۔ اس کے بعد سب نے اپنا اپنا حصہ اس میں بے دریغ ڈالا۔ گزشتہ تین دہائیوں میں تو جو ابتلائیں اس شہر پر گزری ہیں، ان کا حال تو خون کے آنسو رلانے والا ہے۔ تلافی کی صورتیں آسان تو خیر نہیں ہیں، لیکن ناممکن بھی نہیں۔ کاش حکمران اس معاملے میں سنجیدہ ہوں اور وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے وہ کرنے کے لیے عملی قدم اٹھائیں جس کی صحیح معنوں میں ضرورت ہے۔ ایسا سیاسی شعبدہ بازی سے بلند ہو کر ہی ممکن ہے۔

☆ یہ جو ایک یا ایک سے زائد منہ زور طاقتیں عام آدمی کو فتح کرنے کی دھن میں تمام تر اخلاقی حدود پار کرنے میں مصروف ہیں اس سے ترقی پذیر ممالک اور اقوام بالخصوص تیسری دنیا اجازت دیجیے تو مقہور و مجبور مسلم دنیا کہاں کھڑی دکھائی دیتی ہے؟

☆☆ یہ بے حد اہم اور سنجیدگی سے غور و فکر کی دعوت دینے والا سوال ہے۔ ہر عہد کے ادب اور تہذیب کو کسی نہ کسی بنیادی سوال کا سامنا ہوتا ہے، یہ ایسا ہی ایک سوال ہے۔ افسوس کی بات مگر یہ ہے کہ اس پر اوّل تو سوچا ہی نہیں جا رہا اور اگر کچھ لوگ ایسا کر بھی رہے ہیں تو ان کی آواز کہیں نہیں پہنچ پا رہی۔ نتیجہ یہ کی اس سوال کو جس طرح اس دور میں ہمارے یہاں موضوع گفتگو ہونا چاہیے، نہیں ہے۔

اس وقت دنیا کی تمام مقتدر اقوام کا ایک ایجنڈا ہے، اور وہ یہ کہ کم زور ممالک کے وسائل پر قبضہ جمایا جائے اور ان کے عوام الناس کو ایک صارف معاشرہ بنا کر اس طرح مطیع کر لیا جائے کہ اس کے بعد وہ ایک نہ ختم ہونے والی اور نادیدہ غلامی میں رہیں۔ پوری تیسری دنیا آپ کو اسی صورت حال سے دوچار نظر آئے گی اور یہ کام بہت زبردست منصوبہ بندی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ان ملکوں کے عوام کی اکثریت آپ کو روزی روٹی کے معاملات ہی سے دوچار ملے گی۔ اس ایجنڈے کی سب سے ہول ناک چیز یہ ہے کہ معاشرے کے افراد میں قومی و تہذیبی شعور ختم کیا جا رہا ہے۔ ان کی اخلاقی قدار کا نظام منہدم ہو رہا ہے۔ ثقافتی شناخت کے نشانات معدوم ہو رہے ہیں۔ اس طرح پورا کا پورا معاشرہ انسانوں کے ایک ریوڑ میں تبدیل ہو رہا ہے، جس کے لیے کوئی سمت سفر ہے اور نہ وجود سے برتر زندگی کے کوئی معنی۔ یہ بڑی اندوہ ناک اور دل بجھا دینے والی صورت حال ہے، خاص طور پر اس لیے کہ ہمارے یہاں لوگ ابھی اس مسئلے کو درست تناظر میں دیکھ اور سمجھ ہی نہیں رہے۔ اس کے اثرات آپ اپنے ادب میں بھی دیکھ سکتے ہیں، خصوصاً جدید تنقید میں جو اپنے ادب کو پڑھنے اور اپنی تہذیب کو دیکھنے کے لیے وہی طریقے اور وہی سب ٹول اختیار کرنے پر مصر ہے جو دشمنوں کی طرف سے فراہم کیے جا رہے ہیں۔ چناں چہ آپ دیکھ لیجیے، اپنی تاریخ، تہذیب، اقدار اور روایات ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھنے اور اس کے آگے سوالیہ نشان لگانے کا وتیرہ عام ہو رہا ہے۔ خیر یہ ایک بڑا موضوع ہے اور بڑے سیاق میں دیکھے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں کچھ باتیں سرسری انداز میں اور محض اشارتاً کی گئی ہیں۔ خدا کرے کہ ہماری یہاں اپنے عہد کے بڑے سوالوں پر سنجیدگی سے غور کرنے والے اذہان اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اپنے کام پر متوجہ ہوں۔

☆ عہد جدید انسانی تہذیب و تمدن، رسوم و رواج اور اُس کی تقدیر پر کب کا خطِ تنسیخ کھینچ چکا، آگے کی بابت آپ قیاس لڑائیے؟

☆☆ عہد جدید کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس وقت تک کسی امید افزا مستقبل کی توقع نہیں کی جا سکتی جب تک حالات کے نرغے میں جاتے ہوئے لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ان کے یہاں سوچنے والے اور اور معاشرے میں مؤثر کردار ادا کرنے والے لوگ سامنے آ کر اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے۔

البتہ اس مسئلے کا ایک اور رخ بھی ہے، وہ یہ کہ قدرت کا اپنا ایک انتظام ہوتا ہے، ظالم اور جابر کی رسی ایک وقت پر کھینچ لی جاتی ہے، تب سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔

☆ سفید جھوٹ کا نہ صرف چہار جانب بول بولا ہو رہا ہے بلکہ ڈھٹائی سے کامیابی کے جھنڈے بھی گاڑے جا رہے ہیں اور طرح طرح کے ڈراوے بھی دے کر مستقبل کے حوالے سے بے یقینی کو عام کرنے والے کیا مقاصد حاصل کرنا

چاہتے ہیں؟

☆☆ ان افراد اور اقوام کے مقاصد اب کوئی ایسی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہے۔ان کی طرف ہم ذراسی دیر پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔بے یقینی اور خوف کی اس فضا سے بھی انھی مذموم مقاصد کا حصول آسانی سے اور جلد ممکن بنانا ہے۔پہلے جنگیں لڑی جاتی تھیں، حملے اور قبضے کیے جاتے تھے،لیکن اب حکمت عملی تبدیل کر لی گئی ہے۔اپنے لوگ ہدف بنائے گئے معاشرے میں پہنچائے جاتے ہیں،ایسی جگہوں پر بٹھائے جاتے ہیں جہاں وہ مطلوبہ اہداف کے حصول میں کردار ادا کر سکیں۔اس کے بعد ان کے ذریعے پہلے ترغیب سے اور لالچ سے کام نکالنے کا حربہ اختیار کیا جاتا ہے،وہ کامیاب نہ ہو تو خوف اور دھمکی کا طریقہ آزمایا جاتا ہے اور اگر وہ بھی ناکام ہو جائے تو پھر جنگ کا موقع پیدا کیا جاتا ہے۔آپ اس وقت دنیا کی صورت حال دیکھ لیجیے،یہ تینوں حربے استعمال ہوتے نظر آئیں گے۔

☆ اگر کسی طرح کی خوش اُمیدی،خوش فہمی یا اشتباہ تھا بھی تو وہ کب کا دم توڑ چکا،اگلے معاملات کی پردہ کشائی کرنے والا کوئی دوربیں،دور اندیش یا بڑا دماغ قحط الرجال کے اس دور میں کہاں تلاشا جائے؟

☆☆ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت انسان اور اس کی تہذیب ایک انقباض کے مرحلے میں ہیں۔مراد یہ ہے کہ انسانی،تہذیبی اور سماجی سطح پر بڑے امکانات کا منظر نامہ اس وقت آپ کو مشرق و مغرب میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔بیس ویں صدی میں آپ دیکھیے ادب،ثقافت،فلسفے،سیاست ہر شعبے میں آپ کو بڑے لوگ نظر آتے تھے،اکیس ویں صدی میں آپ کو کسی بھی شعبے میں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ ادب ہی کو دیکھ لیجیے،اقبال،ٹیگور،پاؤنڈ،ایلیٹ،ہیمنگوے،ولیم فوکنر،لارنس، ایلڈس ہکسلے،ورجینیا وولف،فوسٹر،بورخیس،نجیب محفوظ،مارکیز،کنڈیرا،پریم چند، منٹو،بیدی،محمد حسن عسکری،عزیز احمد،سلیم احمد،قرۃ العین حیدر،راشد،میراجی،فیض غرضے کہ آپ کو ہر طرف بڑے بڑے ادیب شاعر ملتے ہیں۔اکیس ویں میں ایسا نہیں ہے۔یہ تہذیبوں پر اضمحلال کا دور ہے۔اخلاقی،فکری اور جمالیاتی قدریں ایسے دور میں فروغ پاتی نظر نہیں آ رہیں۔تاہم ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ یہ مرحلہ گزرے گا اور بہتری کا زمانہ پھر آئے گا۔اس لیے کہ یہی فطرت کا اصول ہے۔انجماد اور اضمحلال کے زمانے پہلے بھی گزرتے رہے ہیں،ان کے بعد پھر بحالی اور انشراح کا دور آتا ہے۔تاہم ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس دور میں کرنے کا کیا کام ہے؟ یہ کام وہی ہے جس کی نشان دہی مغرب میں عہد جدید کے حوالے رینے گینوں نے کی ہے۔وہ اسے ایک انٹیرم فیز قرار دیتے ہیں جیسے ایک طوفانی یا ہنگامی دور ہوتا ہے۔رینے گینوں کا کہنا یہ ہے کہ اس دور میں بیج کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ہم اس نکتے کو ایک تمثیل کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہی۔یوں سمجھ لیجیے کہ سیلاب آیا ہوا ہے۔اب اگر ایک جگہ سے سیلاب کا ریلا گزر رہا ہو تو وہاں فصل کاشت نہیں کی جاتی،بلکہ سیلاب کے اترنے کا انتظار کیا جاتا ہے اور اس عرصے میں بس بیج کو بچا کر رکھا جاتا ہے۔اس لیے کہ سیلاب گزرنے کے بعد یہ بیج پھر کارآمد ہوگا۔انسانی معاشرے میں بیج کا کام کرتی ہیں اس کی قدریں۔تو اس وقت ہمیں اپنے معاشرے میں اپنی اخلاقی،ادبی،فکری اور تہذیبی قدروں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔اگر ہم ان قدروں کو بچانے میں کامیاب رہے تو اگلی نسلوں اور اگلے دور کو اپنی روایات اور اپنی تہذیب زندہ حالت میں منتقل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

☆ اس ابتلائی دور میں بطور بیدار مغز پاکستانی آپ اپنی قیادت کے قول،فعل اور عمل سے کس حد تک مطمئن ہیں اور اُنھیں کس طرح کے مشورے دینا پسند کرتے ہیں؟

☆☆ اگر آپ اپنی سیاسی مقتدرہ اور بیوروکریسی کی بات کر رہے ہیں تو اس سے اطمینان کی سطح صفر ہے۔ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ ان دونوں شعبوں میں اب صاف ستھرے لوگ نہیں ہیں۔ہیں مگر اتنے کم کہ وہ کوئی مؤثر کردار معاشرے میں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔اکثریت نااہل اور کرپٹ ہے۔اس کو ملک و قوم سے اور اپنی تہذیب سے کوئی سروکار نہیں۔ایک وقت تھا کہ ہمارے یہاں سیاست میں لوگ قومی شعور کے ساتھ اور عوامی خدمت کا نصب العین اور ایک مقصد لے کر آتے تھے،اب اس کے بالکل برعکس صورت حال ہے۔ان لوگوں کو اب کسی کے مشورے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ اپنے عوام سے اور اپنے ادیبوں سے ایک بات ضرور کہی جانی چاہیے۔وہ یہ کہ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اور ہمیں جو سیاسی و انتظامی قیادت میسر ہے،اس کی بابت ہمیں کسی خوش فہمی میں ہرگز نہیں رہنا چاہیے۔لازم ہے کہ ہم سب اس وقت اپنی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور ان حالات میں اپنا کردار ادا کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کریں۔اور اس صورت حال میں بے حد اہم اور بنیادی کام ہے،اپنی تہذیب و روایت اور اس کی اقدار کے شعور کو محفوظ رکھنا اور فروغ دینا۔اس وقت دنیا ایک بے اقدار معاشرت کی طرف بہت تیزی سے جا رہی ہے۔اقدار کا تصور ہی معدوم ہوتا جا رہا ہے۔رویوں میں وہ چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں جو غیر اخلاقی ہی نہیں غیر انسانی بھی ہیں۔یہ ہزاروں برس کی انسانی تہذیب کے سفر کی نفی کا مرحلہ ہے اور یہ سب کچھ ایک طے شدہ ایجنڈے کے تحت ہو رہا ہے۔انسان ایک مشینی اور حیوانی زندگی کی طرف جا رہا ہے۔اس کے آگے اگر کوئی شے بند باندھ سکتی ہے تو وہ اقدار کا شعور ہے۔اس کام کے لیے ادب سے زیادہ مؤثر کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ہمیں اپنے ادب کو عصری شعور کا ترجمان بنانا چاہیے۔اس کے ذریعے اپنی سوچ،اپنے احساس کو لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔ معاشرے میں ادب کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ عام آدمی کو ادب سے اور ادب میں اٹھائے گئے سوالوں سے جوڑنا چاہیے۔لوگوں کو سستی اور گھٹیا تفریح کی طرف دھکیل دیا گیا ہے۔ایسی تفریح جس میں ابتذال ہے،جو جبلی جذبوں کے لیے ترغیب کا سامان رکھتی ہے۔پہلے لوگ تفریح کے لیے بھی ادب پڑھتے تھے اور ادب میں جو تطہیر کی صلاحیت ہوتی ہے،وہ ان کے لیے بھی مفید ثابت ہوتی تھی۔اب عوام میں ادب کا ذوق ماند پڑ گیا ہے،اس کو بحال کرنے کی ضرورت ہے۔

''موجِ رواں''

(مبین مرزا کے غزلیہ کلام سے کشید)

فاری شا (اسلام آباد)

پہلے ذرا ترنگ میں کارِ زیاں کریں کوئی
اور پھر اختیار ہم طرزِ فغاں کریں کوئی

حد سے گزر گئے ہیں غم دل بھی ہوئے ہیں چاک چاک
رنج گرو! تو آؤ اب زخم عیاں کریں کوئی

دل کا یہی جواب تھا ، کچھ بھی نہیں ہے فائدہ
ہم نے بہت کہا کہ غم تجھ سے بیاں کریں کوئی

شام جو ڈھل رہی ہے یوں دل بھی تو ڈوبتا ہے ساتھ
آؤ کہ ہم چراغِ جاں شعلہ فشاں کریں کوئی

آؤ کہ دشتِ جاں میں پھر رنگ کوئی کھلائیں ہم
آؤ کہ بحرِ دل میں پھر موج رواں کریں کوئی

......○......

☆

مرے اطراف کا بے انت سنّاٹا مرا دل ہے
اور اندر بھی جو برپا ہے وہ ہنگامہ مرا دل ہے

ہُوا تھا جو کسی پل کی طلسمی داستاں میں گم
اُسی کھوئے ہوئے اک شخص کا قصّہ مرا دل ہے

وہی محمل ہے یہ دُنیا کہ لیلیٰ جس میں جا بیٹھی
ہوا جو قیس کا مسکن وہی صحرا مرا دل ہے

میں کب سے محوِ دُنیا تھا مگر اک دن مجھے خود پر
کیا ہے منکشف جس نے وہ آئینہ مرا دل ہے

اُفق پر جس کے ہر لمحہ نیا سورج چمکتا ہے
کسی کی یاد سے روشن وہی خطہ مرا دل ہے

کھلا ہے عشق میں جس کے جہاں کا زیر و بم مجھ پر
اُسی کے ذکر کا وجد آفریں نغمہ مرا دل ہے

○

☆

لپٹی رہے گی اس طرح قدموں سے دُنیا کب تلک
برپا رہے گا خاکِ جاں تیرا تماشا کب تلک

وہ تازہ دم تھا منزلیں آگے بلاتی تھیں اُسے
رکھتا بھی ساتھ اُس کے ہمیں آخر کو رستہ کب تلک

آشفتگی میری ہی کیا اُس کی بھی آنکھیں بول اُٹھیں
ہوتا نہ دُنیا پر بھلا یہ راز افشا کب تلک

اس کا خیال اپنی جگہ میرا ملال اپنی جگہ
اب دیکھنا ہے اس طرح چلتا ہے قصّہ کب تلک

شورِ تلاطم کہہ اُٹھا اب روکنا ممکن نہیں
تھامے رہوں دل میں یونہی آخر یہ دریا کب تلک

مدّت ہوئی ڈھوتے ہوئے اس جسم و جاں کے ڈھیر کو
اے زندگی پھرتا رہوں لے کر یہ ملبہ کب تلک

○

☆

فغاں کہ نذرِ طلسمِ زمانہ ہوگئے ہیں — ہم ایسے لوگ بھی آخر فسانہ ہوگئے ہیں
جہاں پہ پہنچے تھے اک روز طمطراق کے ساتھ — بہ حسرت آج وہاں سے روانہ ہوگئے ہیں
تو کیا ہوئی وہ تمنّا کی دولتِ بیدار — کہ سارے شوق ہی رسمِ شبانہ ہوگئے ہیں
وہ لوگ جن کا طلب گار اک زمانہ تھا — کسی کی سادہ دلی کا نشانہ ہوگئے ہیں
کسی کی چشمِ گریزاں کو جن سے نسبت ہے — بُرا نہیں کہ وہ غم جاودانہ ہوگئے ہیں
اب اس قدر نہیں خالی ہمارا دامن بھی — گناہ ہم سے بھی کچھ فاخرانہ ہوگئے ہیں
جو مثلِ ابرِ بہاراں ہیں دوسروں کے لیے — وہ لوگ اپنے لیے تازیانہ ہوگئے ہیں
کچھ اور شے ہے کہ جس نے گھُلا دیا مجھ کو — کہ یہ عوارضِ جاں تو بہانہ ہوگئے ہیں

...... ○ ......

☆

بڑے طوفاں اٹھانے کے لیے ہیں
یہ آنکھیں مسکرانے کے لیے ہیں
بالآخر کم پڑے گا یہ اندھیرا
چراغ اِتنے جلانے کے لیے ہیں
یہ خوش بو لہجے اور یہ خوش ادا لوگ
بچھڑ کر یاد آنے کے لیے ہیں
خدا جانے یہ دل کے وسوسے اب
مجھے کیا دن دکھانے کے لیے ہیں
ہُوا کرتے تھے ہم اپنے لیے بھی
مگر اب تو زمانے کے لیے ہیں
جو آنکھیں خواب بُننے کے لیے تھیں
وہ اب آنسو بہانے کے لیے ہیں
ہم ایسے لوگ اُس کی انجمن میں
چراغِ دل جلانے کے لیے ہیں

○

☆

دل دیا اور دل سے گرمِ آرزو رکھّا ہمیں
رکھنے والے نے ہمیشہ سرخ رُو رکھّا ہمیں
کچھ بھی اُس سے پوچھنے کہنے کی مہلت ہی نہ تھی
اِس ادا سے اُس نے محوِ گفتگو رکھّا ہمیں
پہلے سب کو اُس نے بخشیں حسبِ خواہش صورتیں
پھر ہماری سمت دیکھا ، ہُو بہ ہُو رکھّا ہمیں
اک زمانہ چاہتا تھا جس سے چشمِ التفات
خوش ادا اُس مہرباں نے رُو بہ رُو رکھّا ہمیں
ہم نے بس اک بار کی تھی اپنی مجبوری بیاں
پھر تو ساری عمر اُس نے چارسُو رکھّا ہمیں
خواہشِ دُنیا تو کیا ، یہ دھیان تک آیا نہیں
دل نے ایسے محوِ کارِ جستجو رکھّا ہمیں
گردشوں سے وقت کی آزاد ہیں یوں جسم و جاں
ایک خواہش نے مثالِ رنگ و بو رکھّا ہمیں

○

☆

دن رات کے دیکھے ہوئے منظر سے الگ ہے — یہ لمحہ تو موجود و میسّر سے الگ ہے
موجیں کہ بگولے ہوں، مرے دل کا ہر اک رنگ — صحرا سے جدا اور سمندر سے الگ ہے
وہ شے کہ لگے جس سے مری روح پہ یہ زخم — واقف ہی نہیں تُو — ترے خنجر سے الگ ہے
پوشیدہ نہیں مجھ سے یہ دُنیا کی حقیقت — باہر سے مرے ساتھ ہے، اندر سے الگ ہے
اک رنگ برستا ہی رہا مجھ پہ اگرچہ — معلوم تھا وہ میرے مقدر سے الگ ہے
تجھ کو نہیں معلوم ہوئے جس پہ فدا ہم — ہے اور ہی کچھ جو ترے پیکر سے الگ ہے
اُس چشمِ کرم نے مجھے بخشا جو خزینہ — اَن مول ہے وہ اور زر و گوہر سے الگ ہے
اُس شخص کی اُلفت نے پھر اک روز بتایا — قسمت مری دارا و سکندر سے الگ ہے

...... O ......

☆

کبھی خدا کبھی خود سے سوال کرتے ہوئے
میں جی رہا ہوں مسلسل ملال کرتے ہوئے
مگن تھا کارِ محبت میں اِس طرح کہ مجھے
خبر نہ ہو سکی اپنا یہ حال کرتے ہوئے
کسے بتاؤں گزارا ہے میں نے بھی اک دور
مثال ہوتے ہوئے اور مثال کرتے ہوئے
وہ جذب و شوق ہی آخر عذابِ جاں ٹھہرا
حرام ہو گیا، جینا حلال کرتے ہوئے
نہ کوئی رنج اُن آنکھوں میں تھا دمِ رخصت
نہ تھی زبان میں لکنت سوال کرتے ہوئے
یہ کام اُس کے لیے جیسے مسئلہ ہی نہ تھا
وہ پُرسکون تھا کارِ محال کرتے ہوئے
تمام عمر جو لَو دیں، مجھے رکھیں آباد
گیا وہ ایسے غموں سے نہال کرتے ہوئے

O

☆

رہے گی خواہشِ مال و منال بھی کب تک
رکھے گا وقت ہمیں پائمال بھی کب تک
نہال رکھے گا کب تک یہ زخمِ جاں مجھ کو
رہے گا وہ مرا پُرسانِ حال بھی کب تک
بہت ملال تھا اُس کو مرے اُجڑنے کا
مگر یہ بات — وہ کرتا ملال بھی کب تک
بہت خیال تھا یوں اُس کو میری خوشیوں کا
مگر یہی کہ وہ رکھتا خیال بھی کب تک
یہ عشق آ ہی گیا منزلِ سوال پہ اب
یہ بات الگ کہ رہے گا سوال بھی کب تک
خلا زدہ دل میں ہے صدیاں نہ بھر سکیں جس کو
نبھاتے ساتھ مرا ماہ و سال بھی کب تک
کھلے نہ ہم سفروں پر مری تھکن کا حال
مگر دکھاؤں میں اب یہ کمال بھی کب تک

O

☆

مجھے جس نے میرا پتا دیا، وہ غمِ نہاں مرے ساتھ ہے
مری زندگی، مری روشنی — دلِ بے اماں مرے ساتھ ہے

مرا کارواں جو بچھڑ گیا مرے دل کا نقش بگڑ گیا
میں ہوں اک مسافرِ گم شدہ سو یہی فغاں مرے ساتھ ہے

اُسی آرزو کی تڑپ لیے یونہی پھر رہا ہوں میں در بہ در
وہی خاک ہے مرے سر میں بھی وہی آسماں مرے ساتھ ہے

یہ جو آنکھ آج چھلک اٹھی مرے دل کا بھید ہی کھُل گیا
میں سمجھ رہا تھا یہ اب تلک غمِ بے نشاں مرے ساتھ ہے

جو گئے دنوں پہ اٹھی نظر مرے دل نے خود یہ کہا مجھے
میں کسی طلسم کدے میں ہوں کوئی داستاں مرے ساتھ ہے

بڑی مدّتوں کے جو بعد اب تری یاد آئی تو یوں لگا
سرِ دشتِ وحشتِ زندگی کوئی مہرباں مرے ساتھ ہے

یہی سوچ کر میں ہوں مطمئن، تہی دست پھر بھی نہیں ہوں میں
مرے دوست گو کہ چلے گئے غمِ دوستاں مرے ساتھ ہے

کسی تال پر کسی تان پر مری روح آج ہے وجد میں
مرا وہم ہے کہ حقیقتاً کوئی نغمہ خواں مرے ساتھ ہے

یہ عجیب رنگِ مزاج ہے مگر اب یہی مجھے راس ہے
کبھی ڈھونڈتا ہوں میں خود کو بھی کبھی اک جہاں مرے ساتھ ہے

...... ○ ......

☆

قرینے زیست میں تھے سوختہ جانی سے پہلے
بہت آباد تھے ہم خانہ ویرانی سے پہلے

بدلتے موسموں کے ساتھ غم بھی آئے لیکن
غموں کی شان الگ تھی اِس فراوانی سے پہلے

اِنھی خوش ذوق لوگوں میں بہت چرچے رہے ہیں
ہماری خوش لباسی کے بھی عریانی سے پہلے

جو یارِ مہرباں نالاں ہے اب میری طلب سے
اُسے شکوہ تھا میری تنگ دامانی سے پہلے

بڑا زیرک بہت دانا تجھے ہم جانتے تھے
دلِ ناداں تری اِس حشر سامانی سے پہلے

یہ پردہ ہے کسی شے کا وگرنہ ہم نے یارو!
بڑے طوفاں اٹھائے ہیں تن آسانی سے پہلے

یہاں اک باغ تھا جس میں چہکتے تھے پرندے
یہیں اس قریۂ جاں کی بیابانی سے پہلے

یہ مجبوبی، یہ خاموشی ہمیشہ سے نہیں ہے
لبِ گویا تھے ہم بھی اپنی حیرانی سے پہلے

○

☆

کچھ درد جگائے رکھتے ہیں، کچھ خواب سجائے رکھتے ہیں
اِس دل کے سہارے جیون میں ہم بات بنائے رکھتے ہیں

ایسے بھی مراحل آتے ہیں اِس منزلِ عشق کی راہوں میں
جب اشک بہاتے ہیں خود بھی اُس کو بھی رُلائے رکھتے ہیں

کیا اُس سے کہیں اور کیسے کہیں، اُن رنگ بدلتی آنکھوں سے
کیا شوق اُمڈتے ہیں دل میں، کیا وہم ستائے رکھتے ہیں

اک بات پہ آکر آج ہمیں اقرار یہ اُس سے کرنا پڑا
کب یاد نہیں کرتے اُس کو، کب اُس کو بھلائے رکھتے ہیں

صد رنگ نظارے تھے جس میں وہ دل کا چمن کیا تم سے کہیں
کیوں اُس کو اجاڑ کے بیٹھے ہیں، کیوں خاک اُڑائے رکھتے ہیں

محتاج نہیں ہے کشتِ جاں موسم کے بدلتے دھاروں کی
کچھ داغ تو دل میں بے موسم سو پھول کھلائے رکھتے ہیں

عاشق بھی نہیں سادھو بھی نہیں، پھر راز ہے کیا یہ مرزا جی
کس آنچ سے دہکا ہے سینہ، کیا آگ جلائے رکھتے ہیں

○

مبین مرزا ایک جواں سال مگر پختہ اور نادرۂ کارفن کار ہیں۔ جب سے ترقی پسند افسانہ نگاری کے خلاف علامتی اور تجریدی افسانہ نگاروں کا تخلیقی ردِّعمل سامنے آیا ہے۔ ہمارے ہاں زندگی کی ترجمانی اور تنقید کی سی تنقیدی اصطلاحات بڑی حد تک نامعتبر ہو کر رہ گئی ہیں۔ مبین مرزا کے افسانوں نے ان اصطلاحات کو ایک نیا اعتبار بخشا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب ہمارے ہاں علامت اور تجرید، ساختیات اور مابعد ساختیات کے ادبی فیشن نے اردو فکشن میں انقلابی حقیقت نگاری کی روایت کو دھندلا رکھا ہے، مبین مرزا نے ہمارے جیتے جاگتے معاشرتی اور روحانی منظر نامے کو اپنے توجہ کا مرکز ومحور بنا رکھا ہے۔ چناں چہ مبین مرزا کے افسانوں نے مجھے اپنی قومی زندگی کی خطرناک ترین بیماری کی خبر بھی دی ہے اور اس بیماری سے نجات کے لیے نسخۂ شفا بھی عطا کیا ہے۔ ان افسانوں نے اس حقیقت کو روشن تر کر دیا ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی عشق کا چلن بھول بیٹھی ہے۔ کارِ دل ہو یا کارِ دُنیا، ہم عاشقانہ رسم وسلوک کو فراموش کر کے صرف حیوانی زندگی ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے قومی زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ ماضی بعید میں شیخ سعدی نے ہمیں یہ سنا دُنی سنائی تھی کہ:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

دمشق میں عشق فراموشی کا سبب قحط سالی تھا۔ پاکستان میں عشق فراموشی کا سبب خوش حالی ہے۔ بجھی عشق کی آگ اندھیرا ہے۔ اس اندھیر نگری کے سیاسی ومعاشرتی زوال اور اخلاقی وروحانی انحطاط کی صورت گری مبین مرزا کے فنی مجاہدے کا اوّلین مقصود ہے۔ جبر واستبداد انسانی شخصیت وکردار کو کس طرح چپکے چپکے بدل کر رکھ دیتا ہے اور فاشزم کے حصار میں بند زندگی پر رفتہ رفتہ کیوں کر مردنی چھا جاتی ہے؟ یہ سوال مبین مرزا کا مرکزی سوال ہے۔ انھوں نے پاکستان کی دیہی اور شہری زندگی پر جبر واستبداد کی آہنی گرفت کے منفی اثرات پر تخلیقی انداز میں غور وفکر کیا ہے۔

جبر واستبداد کی مسلسل حکمرانی میں اصول وضوابط پر ثابت قدمی اور اعلیٰ انسانی اوصاف سے وفاداری بہ شرطِ استواری ناممکن ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس جبرِ مسلسل کے خلاف بغاوت کا شعلہ رفتہ رفتہ سیاہ پوش ہو جاتا ہے، لوگ باگ بزدلی اور مفاہمت کے چلن پر فخر کرنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی غلامانہ اخلاقیات وجود میں آ جاتی ہے۔ مبین مرزا ہمارے معاشرے پر اسی غلامانہ اخلاقیات کے ہمہ گیر منفی اثرات کو سمجھنے اور ان زہرناک اثرات سے نجات کی راہیں ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ ان کے افسانوں میں بزدلی اور مفاہمت کی فضا میں انسانی شخصیت کی شکست وریخت کے مناظر جلوہ گر ہیں۔ افسانہ ''قید سے بھاگتے ہوئے'' کا مرکزی کردار جاگیرداری نظام کے مظالم کی تاب نہ لا کر ملکاں بی بی کے ساتھ اپنے عہدِ وفا سے روگردانی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عہدِ وفا استوار کرتے وقت اسے ملکاں بی بی نے سمجھایا تھا کہ:

''مراد—'' ملکاں بی بی کی آواز بھیگی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر نرمی سے بولی، ''ہاں— سچ بول رہے ہو تم، میرا دل کہتا ہے— اچھا بیٹھو—'' ملکاں بی بی نے ایک طرف سرک کر اپنے برابر جگہ بنائی— ''سنو، میں تمھیں پوری بات بتا دیتی ہوں۔ اس کے بعد تم کوئی فیصلہ کرنا۔ ابھی نہیں، ابھی رکو۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔''

''آپ مجھے جو چاہے بتائیں لیکن فیصلہ میں نے کر لیا ہے بی بی جی۔''

''نہیں۔ پہلے آرام سے میری بات سنو۔ دیکھو، میرے دو بھائی ہیں، دونوں خنزیر ہیں، پکے خنزیر— بہن کوئی نہیں ہے۔ دونوں بھائی لاہور میں رہتے ہیں، ہر مہینے ان میں سے ایک یہاں کا پھیرا لگاتا ہے، اس لیے کہ ہماری ساری زمینیں یہاں ہیں۔ تمھیں پتا ہے ہماری کتنی زمینیں، کتنی جائیداد ہے؟''

''اوں ہوں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے بھی نہیں پتا۔ ہاں پوری زمینوں اور جائیداد کا نہیں پتا مجھے بھی— پر یہ پتا ہے کہ بہت کچھ ہے— اتنا کچھ کہ ہم بہن بھائیوں کے الگ الگ ٹبر ہوں تو بھی ساری عمر بیٹھ کر کھا سکتے ہیں، تنکا بھی توڑے بغیر۔ لیکن میرے بھائیوں کے دل میں طمع بھر گیا ہے، وہ سب کچھ خود ہضم کر لینا چاہتے ہیں، مجھے میرا حصہ دینے کو تیار نہیں، اسی لیے میری شادی نہیں کر رہے۔ وہ چاہتے ہیں، میں ساری عمر اس حویلی میں پڑی سڑتی رہوں، میرا اپنا گھر نہ ہو تا کہ کل کلاں بہنوئی ان سے زمین کا بٹوارا نہ کرائے۔''

''آپ کو حویلی میں کوئی تنگی ہے؟''

''نہیں کوئی تنگی نہیں۔ گھی، دودھ، اناج، جانور سب کچھ اپنی زمینوں کا ہے۔ خرچہ پانی بھائی مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔ گاڑی اور ڈرائیور رکھ چھوڑے ہیں، میں جب چاہوں، جہاں چاہوں ڈرائیور کے ساتھ جا سکتی ہوں۔ کوئی پابندی نہیں ہے— بلکہ ڈرائیور کے ساتھ، ملازموں کے ساتھ یا کسی کے بھی ساتھ جو چاہے تعلق رکھوں، انھیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس شادی نہیں کر سکتی۔''

جاگیرداری نظام کے یہ محافظ اپنی اکلوتی بہن پر عاشقانہ زیست کی صراطِ مستقیم کو بند کر کے ہوس کی ان گنت ٹیڑھی میڑھی راہیں کھول دیتے ہیں۔ ملکاں کی نظر میں یہ طرزِ عمل اس کے بھائیوں کو آدمیت کے بلند مقام سے گرا کر حیوانیت (خنزیر) کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیتا ہے۔ یہی سفاک نظام بالآخر مراد کو اپنا عہدِ وفا توڑ کر ہوس کی راہ اپنانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بے وفائی کا یہ طرزِ عمل اسے پرائیوٹ جیل سے رہائی دلاتا ہے۔ گویا جاگیردارانہ جبر واستبداد کی انسان دشمن فضا میں آدمی حیوان بن کر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک طرف وہ چند جاگیردار

ہیں جو بے حدوحساب اراضی کے مالک ہیں اور ''ایک تنکا توڑے بغیر'' نسل درنسل دادِعیش دیتے چلے آرہے ہیں اور دوسری جانب دن رات محنت ومشقت میں مصروف وہ انبوہِ کثیر ہے جسے دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں۔ اس نظام کی سفا کی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ جا گیردار اپنی ہمشیرہ تک کو شخصیت کی تکمیل کا فطری حق دینے پر آمادہ نہیں۔ صرف اور صرف اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں اُس کی وسیع وعریض جا گیر میں سے کسی چھوٹے سے چھوٹے قطعہء اراضی کے چھن جانے کا امکان حقیقت میں نہ بدل جائے۔ یہ تو رہا دیہات کے خدا (دیہہ خدا) کی خدائی کا نقشہ۔ اب آیئے شہری زندگی کے مصائب وآلام کی نقش گری کی جانب۔ ملتان سے کراچی کی جانب اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ فاشزم کے شہر آشوب میں اعلیٰ انسانی اقدار پر کیا گزرتی ہے؟''

افسانہ ''خوف کے آسمان تلے'' کا مرکزی کردار پروفیسر کیانی مثالی انسانی تصورات پر ایمان رکھنے والا ایک درویش صفت انسان ہے۔ ظلم کی لپیٹ میں آئے ہوئے شہر میں وہ انسانی خواب وخیال سے وابستگی پر ثابت قدم رہنے میں کوشاں ہے جب کہ زندگی کے گونجتے گرجتے حقائق پاس پڑوس ہی نہیں خود اُس کے گھر کے اندر کی زندگی کو جبر واستبداد کی قوتوں کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے ''فوائد'' سمجھانے میں مصروف ہیں۔ اسی افسانے کے ایک کردار کے لفظوں میں ''مقتل بنایا ہوا ہے کراچی کو ظالموں نے۔'' اس شہر کے باسیوں کے سروں پر ہمہ وقت موت منڈلاتی رہتی ہے۔ مقتل شہر میں الیکشن کا زمانہ ہے۔ پروفیسر صاحب کسی بھی امیدوار کو اپنے ووٹ کا مستحق نہیں سمجھتے۔ چناں چہ گھر بیٹھے کتاب پڑھ رہے ہیں کہ:

اتنے میں چھوٹی بیٹی کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی، ''پاپا! کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔''

''کون ہے بیٹا؟''

''معلوم نہیں، کئی آدمی ہیں، بلا رہے ہیں آپ کو۔''

''اچھا، انھیں بٹھایا آپ نے ڈرائنگ روم میں؟''

''نہیں پاپا، وہ کہہ رہے ہیں، ہم جلدی میں ہیں، بیٹھیں گے نہیں۔''

پروفیسر کیانی گھر سے باہر آئے، چار پانچ نوجوان اور دو ادھیڑ عمر آدمی ان کے منتظر تھے۔

''سلام علیکم سر!'' کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

''وعلیکم السلام — جی فرمایئے؟''

''سر بس یہ کہنا تھا کہ آپ کی فیملی کا ابھی ووٹ نہیں ہوا۔ بس جا رہی ہے، آپ بھی اس میں بیٹھ کر ووٹ ڈال آیئے، یہیں گھر پر اتار دے گی گاڑی واپس۔ وہاں بھی دیر نہیں لگے گی۔ اپنے لڑکے موجود ہیں، خود پرچی بنوا دیں گے، آپ کو تو بس مہر لگانی ہے۔''

''ہاں ہاں، ہمیں جانا ہے لیکن بس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی گاڑی میں چلے جائیں گے۔'' پروفیسر کیانی نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''سر کیوں گاڑی میں جاتے ہیں، بس جا تو رہی ہے؟'' ادھیڑ عمر آدمی تحمل سے بولا۔

''نہیں بھئی، ہم اپنی گاڑی میں ہی جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کی مرضی، لیکن بس اب چلے جائیں فوراً۔ بعد میں پھر رش ہو جاتا ہے! اخیر وقت میں۔'' دوسرے لڑکے نے کہا۔

''ہاں میاں — بس دیکھیے —''

''دیکھیے دیکھیے نہیں سر! اب چلے جایئے۔ ہم چار بار یاد دہانی کرانے آچکے ہیں آپ کو صبح سے اب تک۔'' دائیں ہاتھ پر کھڑا نوجوان ذرا چمک کر بولا۔

''مطلب ہے سر، کہ اب ٹائم کم بچا ہے نا۔ پھر رش پڑ جائے گا تو آپ کو زحمت ہوگی۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''پانچ ووٹ ہیں، سر آپ کے گھر کے۔ آپ کا، آپ کی بیگم صاحبہ کا اور تین آپ کی بیٹیوں کے، پانچوں ڈلوایئے گا۔'' ایک اور نوجوان بولا۔

''ایک ایک ووٹ قیمتی ہوتا ہے سر۔'' اسی ادھیڑ عمر آدمی نے مسکرا کر کہا۔

''آپ بس فوراً چلے جایئے۔'' وہی دائیں ہاتھ کھڑا نوجوان دوبارہ چہکا۔ ''پانچویں بار تو یاد دہانی نہ کروانے آئیں ہم۔'' اس نے ذرا ٹیڑھی نظروں سے پروفیسر صاحب کو دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ اگر پانچویں بار بتانا پڑا تو کسی اور انداز میں بتایا جائے گا۔

دہشت گردی کی یہ فضا پروفیسر کیانی کے عزم واستقلال میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ بالآخر وہ اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ اُس تشدد پسند سیاسی گروہ کے امیدوار کے حق میں ووٹ ڈال آتے ہیں۔ مسلسل خوف، دہشت کی فضا پروفیسر کیانی کے کردار کو یوں منقلب کر دیتی ہے کہ وہ الیکشن آفس میں جا کر شہر پر قابض اسی سیاسی گروہ کو کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں:

مصافحہ کر کے پروفیسر صاحب چل دیے۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے الیکشن آفس سے باہر نکلے، راستے میں کئی لوگوں نے سلام کیا، پروفیسر صاحب نے سب کو مسکرا مسکرا کر جواب دیا۔ اب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ بلا ٹل گئی، اب ان کے پاؤں تلے اطمینان کی ٹھوس زمین تھی لیکن انھیں لگ رہا تھا جیسے ہر ہر قدم پر وہ نیچے اور نیچے — پاتال میں لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔

کسی شہر میں سچ کی حرمت کو پامال کرنے والی قوتیں قابض ہو جائیں تو وہاں سچ کے ساتھ زندہ رہنا ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے، باطل حق کو مغلوب کر لیتا ہے، زندگی آسمانوں کی جانب پرواز کی بجائے پاتال کی جانب رینگنے لگتی ہے اور انسان اُن کیڑوں مکوڑوں کی مثال بن کر رہ جاتے ہیں جو پاتال میں خوش رہنے کا فن جانتے ہیں۔ ''سفید پردہ'' کا یا کلپ کی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ خالد ایک ذہین نوجوان ہے۔ کام کی تلاش میں ہے مگر کام نہیں ملتا۔ وہ فرسٹ ڈویژن ہے مگر اُس کی بجائے تھرڈ ڈویژن کو سفارش پر روزگار مل جاتا ہے۔ اُس کا والد آئیڈیلسٹ ہے۔ سفارش کر سکتا ہے مگر نہیں کرتا۔ وہ جائز اور ناجائز میں تمیز کرتا

ہے، میرٹ کو کوٹا سسٹم پر ترجیح دیتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنے باصلاحیت بیٹے سے مسلسل ناانصافی کے باوجود اپنے اصولوں پر قائم رہتا ہے۔ جب گھر کے افراد اُس کی اصول پسندی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو وہ:

ایک دم تیز آواز میں بولنے لگے، "تو کیا کریں، دامن پھیلائیں آپ کی نوکری کے لیے، دوسروں کے آگے۔ معلوم ہے کیا ہوگا—؟" وہ رکے اور پھر دھیرے سے بولے۔ جیسے انھیں اپنی بلند آواز کا اندازہ ہوگیا ہو، "ایک جائز کام کی سفارش کے بدلے میں ہم سے کئی ناجائز کام نکلوائے جائیں گے۔ جو کام ساری زندگی نہیں کیا ہم نے، وہ اب کرنا پڑے گا۔ اصولوں کی زندگی گزاری ہے ہم نے۔ کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔"

"ہاں، اسی لیے تو ٹھوکریں کھا رہی ہے آپ کی اولاد۔ آپ کو اپنے اصول زیادہ پیارے ہیں۔" بھائی نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ لیکن یہ ڈوبتی ہوئی آواز بھی دھماکا کر گئی۔ ایک دم پورے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ خاموشی کے یہ چند لمحے صدیاں بن گئے۔ "اختر میاں!" صدیوں کے بعد ابا کی آواز سنائی دی لیکن جیسے اب یہ آواز کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ انھوں نے کھنکار کے گلا صاف کیا، پھر بولے، "اولاد کے لیے ماں باپ کے جذبات کو آپ ابھی نہیں سمجھ سکتے— اور زندگی کا اصولوں سے کیا تعلق ہوتا ہے، اس کا بھی آپ کو شعور نہیں۔" وہ پھر کھنکارے جیسے بولنے میں انھیں مشکل ہو رہی ہو، بولے، "خدا آپ کو سلامت رکھے اور خوشیاں دکھائے اولاد کی۔ جو باتیں دیر سے جا کر سمجھ آتی ہیں آدمی کو، ان پر پچھتاوا بھی دیر تک رہتا ہے اسے۔" کرسی کے بازو پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، بولے، "ہم دستبردار ہوگئے آپ سے۔ آج کے بعد آپ آزاد ہیں جو چاہے کیجیے، جیسی چاہے زندگی گزاریے۔ ہم کچھ نہ پوچھیں گے آپ سے، نہ ہی کچھ کہیں گے۔" آخری فقرہ انھوں نے بہت ٹھہر ٹھہر کر بے حد نرم لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

باپ کی اس ثابت قدمی نے خالد کے عزم و استقلال کو متزلزل کر دیا۔ چناں چہ ایک اصول پسند گھرانے کے اس ذہین نوجوان نے خود کو حالات کے دھارے کے سپرد کر دیا۔ اُس نے شہر پر قابض سیاسی گروہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے کلاشنکوف اُٹھالی اور دہشت گردی کا طرزِ حیات اپنا لیا۔ اس کردار کا انجام سبق آموز ہے۔ صرف نو دن تک دہشت گردی کی زندگی گزارنے کے بعد اسے وہ آئیڈیلز یاد آنے لگتے ہیں جن سے بے وفائی کے عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا:

ابا یاد آئے پھر ایک ایک کر کے بہنیں یاد آنے لگیں اور جب سب یاد آ چکے تو فرح یاد آئی۔ پتا نہیں کیا سوچ رہی ہوگی، کہاں ہوں میں، کیوں نہیں فون کر رہا؟ روز فون کرنے والا آدمی۔ اور اب نو دن ہوگئے۔ وہ تو پریشان بھی بہت جلد ہو جاتی ہے، بالکل اماں جیسی عادتیں ہیں اس کی بھی۔ اس بات پر خود ہی ہنسی آ گئی اسے۔ منگیتر کی عادتیں اماں جیسی۔ اس کے چہرے پر آئی ہوئی مسکراہٹ جیسے یک لخت منجمد ہوگئی۔ سخت حیرانی کے ساتھ اس کی نظریں جہاں تھیں وہیں ٹھہر گئیں۔ فرح اس کے سامنے تھی۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے پھر پلکیں جھپکیں، آنکھیں ملیں۔ وہ جو سفید پردہ آنکھوں کے آگے رہتا تھا، وہ غائب تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ فرح یہاں کیسے آ سکتی ہے۔ وہ یہاں کیسے آ گئی؟ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور خواب دیکھ رہا ہے۔ اپنے جاگنے کا یقین کرنے کے لیے اس نے گود میں رکھی کلاشنکوف پر دونوں ہاتھ جمائے۔ ہاں وہ جاگ رہا تھا۔ لیکن یہاں کیسے۔ اُسے یہ کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟

یوں خالد، اپنے مورچہ بند ساتھیوں کے روکنے کے باوجود اپنے خواب، اپنی منگیتر فرح کے تصوراتی ہیولے کی جانب لپکتا ہے اور گلی میں پہنچ کر سیکورٹی فورسز کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔ خالد کا انجام افسانے کے قاری کے ذہن میں یہ سوال چھوڑ جاتا ہے کہ کیا اصولوں سے بے وفائی کی زندگی موت کا دوسرا نام نہیں؟ کیا باطل کے ساتھ زندہ رہنے کی بجائے حق کی خاطر جان دے دینا بہتر طرزِ حیات نہیں؟ اقبال نے اس راز سے یوں پردہ اٹھایا ہے:

کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف ، مرگ حیاتِ بے شرف!

افسانہ "گم شدہ لوگ" کے کردار بے شرف زندگی میں مبتلا ہیں۔ انجلی اور رئیس دو طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انجلی منٹو کے افسانہ "کالی شلوار" کی ہیروئن کی چھوٹی بہن ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بازارِ حسن میں بیٹھنے کے بجائے اپنے گھر ہی کو بازارِ حسن بنا لیتی ہے اور نت نئے مہمانوں کی خاطر تواضع اور آرام و آسائش کے بندوبست میں لگی رہتی ہے۔ وہ موت سے عبارت بے شرف زندگی سے اُکتا کر حقیقی زندگی کی جانب لوٹ جانا چاہتی ہے:

میں بے نام رشتوں میں جیون بتا رہی ہوں، لیکن دکھی ہوں، بے چین ہوں، میں ایک ایسے رشتے کی تلاش میں ہوں جسے میں شناخت کر سکوں، جس کے ذریعے اپنی شناخت حاصل کر سکوں، دنیا کے سامنے، دنیا کی زبان میں۔

چناں چہ وہ رئیس سے ازدواجی رشتے میں منسلک ہو جانا چاہتی ہے۔ رئیس اُس کی محبت کا دم بھرتا ہے۔ اسم بامسمّی ہے۔ اُس کے ساتھ چند روز بسر کرنے کے لیے وہ پابندی کے ساتھ کراچی سے آیا کرتا ہے۔ جب انجلی اُس کے سامنے اس آرزو کا اظہار کرتی ہے تو وہ درج ذیل الفاظ میں اُس کی اس آرزو کو خاک میں ملا دیتا ہے:

میں اپنے لیے کسی جسم کا نہیں بلکہ ایک روح کا متلاشی ہوں۔ ایسی روح کا جو میرے ساتھ کسی بندھن میں نہ بندھی ہو، جس سے کسی رشتے، کسی تعلق کی بیڑیاں میرے پاؤں میں نہ پڑی ہوں۔ اُس سے میرا لاتعلقی کا تعلق ہو۔ اس سے میری دوستی ہو۔ بے نام دوستی جو کچھ نہیں مانگتی، کوئی سوال نہیں کرتی، کسی اُلجھن، کسی آزمائش میں نہیں ڈالتی۔

عشق کی آزمائش میں پڑنے کی بجائے لاتعلقی کا تعلق قائم کیے رکھنا طوائفیت کا دوسرا نام ہے۔ رئیس اور انجلی میں فرق یہ ہے کہ وہ طوائف کی زندگی سے نجات کی آرزومند ہے اور رئیس طوائفیت کو اپنا طرزِ حیات بنا کر مطمئن ہے۔ لاتعلقی کا یہی تعلق افسانہ "ریت کی دیوار کے اُدھر" کی افسر شاہی کا شیوہ ہے۔ ایک شہید سپاہی کی بیوی حمیدہ اپنے دونوں بچوں۔۔۔ طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کو اپنے شہید شوہر

کی وصیت کے مطابق ''مجاہد''، ''غازی'' اور ''شہید'' بنانا چاہتی ہے۔ جب اُسے اپنے شہید شوہر کا تمغائے شجاعت وصول کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے تو وہ اپنے دونوں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے تعلیمی وظیفہ حاصل کرنے کی تمنا کرتی ہے، اس پر:

بڑے افسر نے سخت غصے میں جھنجھلاتے ہوئے اسے ڈانٹا، ''مائی تمھیں یہاں پر شوہر کا تمغا لینے کے لیے بلایا گیا ہے، بھیک مانگنے کے لیے نہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔''

اعلیٰ وارفع قومی وملی آئیڈیلز پر اپنی جان نچھاور کرنے والے شوہر کی شجاعت اور جاں نثاری پر نازاں حمیدہ یہ سنتے ہی آسمان سے زمین پر آ گری:

یک بہ یک ذلت کا شدید احساس اس کے پورے وجود میں چھا گیا۔ اسے لگا جیسے کوئی گندی، گھٹیا اور ذلیل مخلوق سمجھ کر اس سے بات کی گئی ہے۔ شدید دکھ اور ہتک کے احساس سے اس کا دل بھر گیا۔ جلا کر راکھ کر ڈالنے والی آگ اس کی رگ رگ میں دوڑتی چلی گئی۔ ایکا ایکی لرزتا ہوا غصہ لہر کی طرح اس کے وجود میں سرسرانے لگا۔ نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم بھیک مانگنے نہیں آئے تھے، ہم تو دینے آئے تھے۔ اپنے اگلی پیڑھی بھی نچھاور کرنے آئے تھے۔ کوئی شدید غصے اور دکھ کے ساتھ اس کے اندر دھاڑ رہا تھا۔ نہیں چاہیے۔ کچھ نہیں چاہیے ہمیں۔ ساری دولتیں، ساری عہدے سب کچھ تمھیں مبارک۔ نہیں چاہیے ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اس کے اندر کوئی چیخ رہا تھا، مسلسل چلا رہا تھا۔ اسے لگا کہ پل بھر پہلے اُس کے سامنے جو نظارہ تھا وہ سارا نظارہ ریت کی دیوار میں تبدیل ہو گیا اور یہ دیوار جو آسمان تک کھنچی ہوئی تھی، گھڑی کی گھڑی میں ڈھ گئی۔ ریت اُس کے سانسوں میں بھر گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ سارا کمرہ گھومنے لگا۔ زمین آسمان گھومنے لگے۔ اس نے ڈوبتی آواز میں منشی جی کو آواز دی، ''ابا جی ـــ! ابا جی مجھے چکر آرہے ہیں۔ دل گھبرا رہا ہے۔ دم گھٹ رہا ہے میرا۔ مجھے یہاں سے باہر لے چلو ابا جی ـــ!''

یہ ہے اُس غیرتِ فقر کا ردِعمل جو قومی آئیڈیلز کے ساتھ اٹوٹ وابستگی کی خوگر ہے۔ اس کے برعکس حکمران طبقے کا ہمارے قومی وملی مقاصد کے ساتھ فقط ''لاتعلقی کا تعلق'' قائم ہے۔ یہ تعلق قومی وسائل کو اپنے آرام وآسائش کی خاطر استعمال کرنے مگر کسی ''آزمائش'' میں نہ پڑنے کے چلن سے عبارت ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ حکمران طبقے کا یہ ''لاتعلقی کا تعلق'' عوام کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے میں اب حد سے بڑھنے لگا ہے اور ہمارے قومی وملی آئیڈیلز اس کی دستبرد سے بچتے نظر نہیں آتے۔

یہ ہیں وہ تاثرات جو مبین مرزا کے چند افسانوں نے میرے دل میں پیدا کیے۔ میں نے ان کہانیوں کو پڑھ کر اپنے دل میں گردوپیش کی زندگی کو سمجھنے اور بدلنے کے جذبات موجزن پائے۔ مبین مرزا کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''خوف کے آسمان تلے'' اس حقیقت کا ثبوت بن کر طلوع ہوا ہے کہ مبین مرزا کہانی کہنے کا فن جانتے ہیں۔ اردو دنیا ان کی مزید تخلیقی فتوحات کی منتظر ہے!

☆

''جوں جوں دوا کی''

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

خط ان کا بہت خوب ' عبارت بہت اچھی
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نزاکت بن نہیں سکتی حسینوں کے بنانے سے
خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

یہ راز تو کوئی راز نہیں، سب اہلِ گلستان جانتے ہیں
ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا

داورِ محشر میرا نامہ اعمال نہ کھول
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

غم و غصہ، رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

جذبوں کی حرارت کا شاعر

پروفیسر سحر انصاری
(کراچی)

شاعری انسان سے انسان کا جمالیاتی مکالمہ ہے۔ جمالیاتی اس لیے کہ زندگی کے کسی بھی تجربے کا اظہار اگر جمالیاتی ہیئت (Art Form) میں نہ ہو تو اس کی اثر آفرینی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ادب اور غیر ادب، شاعری اور ناشاعری کے مابین اگر کوئی "خطِ فاصل کھینچا جا سکتا ہے تو اس کی بنیادیں تصورِ اقدار اور تخلیقی تپش سے مشروط ہوں گی اور اس کا پیرایۂ اظہار اپنے وسیع تر معنوں میں جمالیات ہی ہوگا۔ آج کل خاص طور پر اردو شاعری میں لسانی اور ہیئتی تجربوں کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اُس کا بڑا حصّہ جمالیاتی رکھ رکھاؤ اور تخلیقی تپش سے عاری نظر آتا ہے۔ اس کا احساس مجھے اُس وقت اور بھی شدت سے ہوا جب میں نے مبین مرزا کے شعری مجموعے ''تابانی'' کی غزلوں اور نظموں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ انھوں نے اس دور کے کسی بھی رائج الوقت یا فیشن ایبل رجحان کی تقلید میں وقت ضائع نہیں کیا۔ جدید طرزِ احساس کو کلاسیکی اہتمام کے ساتھ نئے رنگ و آہنگ میں پیش کیا ہے۔ مبین مرزا کی شعری کاوشوں میں تکمیلیت پسندی (Perfectionism) اور تخلیقی تپش نمایاں ہے جو انھیں اپنے بیش تر معاصرین سے مختلف اور لائق توجہ بناتی ہے۔

مبین مرزا کی ادبی زندگی کم و بیش تین عشروں سے زیادہ مدت پر محیط ہے۔ ان کے ادبی اظہارات میں افسانہ، تنقید اور شاعری شامل ہے۔ وہ مترجم بھی بہت اچھے ہیں اور وہ ''مکالمہ'' جیسے منفرد جریدے کے مدیر ہونے کے علاوہ اکادمی بازیافت جیسے نیک نام ادارے کے مالک و منتظم بھی ہیں۔ اس نامساعد اور مصروف زندگی میں سے وہ اتنے سارے شعبوں میں کس طرح کام کر لیتے ہیں، یہ خود ایک مثال سے کم نہیں۔

مبین مرزا کے مجموعے ''تابانی'' میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی شعری تخلیقات میں وہی موضوعات نظر آتے ہیں جو اس عہد کی دین ہیں اور جنھیں ہر حساس اور باضمیر انسان اپنے بطونِ ذات کا حصّہ سمجھتا ہے۔ ان میں رومانیت سے لے کر اپنے عہد کے مقامی اور عالمی مسائل بھی موجود ہیں اور انسان اور کائنات سے متعلق بعض بنیادی سوالات کا عکس بھی ان میں نمایاں ہے۔ اس آگہی میں زندگی کے تجربات، گرد و پیش کے مشاہدات اور مطالعے کی وسعت بھی شامل ہے۔

مبین مرزا کے افسانوں کا مجموعہ تو شائع ہو چکا ہے، لیکن تنقیدی مضامین ہنوز منتظرِ تدوین و ترتیب ہیں۔ شاعری کی یہ کتاب بھی دوسرے دوستوں کے علاوہ میرے اور سلیم یزدانی کے اصرار ہی سے ممکن ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت کا جواز یہ ہو سکتا ہے کہ مبین مرزا نے زندگی اور کائنات کے باب میں جو خرد بین اور دور بین استعمال کی ہے ہمیں اس کے عدسوں سے اس عہد کی تخلیقی جہات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اپنے پورے عہد کی سچائیوں اور زمینی حقائق کا مکمل بیان کسی بھی فردِ واحد کے لیے ممکن نہیں۔ اسی لیے ہر اچھی اور معتبر تخلیقی کاوش کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔

ہر عہد اپنے حسن و قبح سے پہچانا جاتا ہے۔ قباحت کا ایک رُخ تو اس وقت سامنے آیا جب فرانس کے دانش ور شاعر بودلیئر نے اپنے شعری مجموعے کو ''بدی کے پھول'' سے معنون کیا، اور پھر حسن کی حقیقت کو سمرسٹ ماہم کے الفاظ کے آئینے میں دیکھیے تو وہ کہتا ہے:

It seemed to me that beauty was like the summit of a mountain peak, when you had reached it there was nothing to do but to come down again.

(مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حُسن پہاڑ کی چوٹی کی طرح ہے جب آپ وہاں پہنچ جاتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ اب کرنے کے لیے کچھ نہیں سوائے اس کے کہ دوبارہ نیچے اُتر آئیں۔)

تخلیقی کرب اور شدتِ احساس سے متصف کسی بھی انسان کی ساری زندگی خطِ مستقیم سے عبارت نہیں ہوتی۔ اس میں نشیب و فراز بھی آتے ہیں۔ سرخوشی کا عہد بھی ہوتا ہے اور ابتلا و آزمائش کے لمحات بھی جو کبھی کبھی صدیوں سے بھی زیادہ گراں بار محسوس ہوتے ہیں۔ حسن و عشق کے معاملات ہوں یا زمانے کے ستیز و ساز گار داؤ پیچ یقیناً مبین مرزا بھی موسموں کے گرم و سرد کے تجربے سے گزرے ہیں اور شاید اب بھی گزر رہے ہیں، کیوں کہ ان کی شاعری ان جہات کی غمازی کر رہی ہے۔

انسانی تاریخ عہد بہ عہد انسانی رویوں کی تبدیلی کا گوشوارہ ہی ہے۔ محبت اور عشق کے تصورات بھی جامد و مطلق نہیں ہیں۔ ایک ہی عہد کے شعرا اس باب میں مختلف رویوں کو عزیز رکھ سکتے ہیں، مثلاً:

ایک ہی لہر کا آنچل تھامے ساری عمر بتا دینا
(رئیس فروغ)

ہم سے خلوت میں جو درپے ہو زلیخائے بہار
ہم نہیں یوسف کہ عذرِ پاک دامانی کریں
(سراج الدین ظفر)

ادب و شعر کی دنیا میں تنوع جذبوں اور تجربوں کے اختلاف ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر جذبے کا اظہار رسمأ نہیں بلکہ باطنی سچائی کے ساتھ کیا جا رہا ہو تو اس میں انفرادیت کا رنگ ضرور ظہور پذیر ہوگا۔ مبین مرزا اپنے احساس کو اس پیرایے میں ادا کرتے ہیں:

اب فقط جسم نہیں روح بھی ہے محوِ طواف
ایسے بخشا ہے مری زیست کو محور تو نے

تجھ کو نہیں معلوم ہوئے جس پہ فدا ہم
ہے اور ہی کچھ جو ترے پیکر سے الگ ہے
یہ روز پوچھتی ہے تجھ سے کچھ نہ کچھ اے دل
سوال تو بھی کوئی زندگی سے پوچھ کبھی

یہ احساس کئی کھڑکیاں کھولتا ہے۔صرف ایک سوال ہی نہیں، سوالوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جس میں وجود کی قدر و قیمت، جبر واختیار، کامرانی و رائگانی، فنا وبقا، زوال ولازوال سب اپنا اپنا مفہوم چاہتے ہیں۔

مرے وجود کی پنہاں حقیقت افشا کر
بتا میں کس لیے ہونے کا کرب سہتا ہوں

جانے کس موڑ پہ ہستی کا سفر ہے کہ جہاں
خواہشِ مرگ میں جینے کی تمنا بھی ہے

یہی تو دُکھ ہے زمیں آسماں بنا کر بھی
میں در بہ در ہوں خود اپنا جہاں بنا کر بھی
اگر یہ سچ ہے کہ ہر شے یہاں پہ فانی ہے
تو کیا کروں گا میں کچھ جاوداں بنا کر بھی
مصر ہے اس پہ — مجھے رائگاں نہیں ہوتا
وہ زندگی کو مری رائگاں بنا کر بھی

یہ جو رزم گاہ ہے وقت کی یہاں سب اثاثے ہی لٹ گئے
وہ مرے جنون کی خودسری وہ بہار تیرے جمال کی

وہ میری وحشتِ دل ہو کہ تیری چشمِ کرم
فنا ہے سب کے لیے لازوال کوئی نہیں

لیکن یہ بھی زندگی کا ایک رُخ ہے، فکر کی محض ایک جہت ہے۔تاہم فطرت کے قانونِ تلافی (Law of compensation) میں بہت کچھ ظاہر اور بہت کچھ پنہاں بھی ہوتا ہے جو شاید اِن سوالوں کی تلخی کو وقتی طور پر ہی سہی، زائل کر کے ایک نوع کی نئی سرشاری اور کیف سامانی کی طرف مائل کردیتا ہے۔

سو اب میں عہدۂ دنیا سے کیا غرض رکھوں
کسی نے منصبِ دل پر بٹھا دیا ہے مجھے
میں سب سے دُور فقط اپنے آپ میں گم تھا
کسی کے قرب نے سب سے ملا دیا ہے مجھے
تمام عمر جو رکھے گا زیست کو روشن
تری نظر نے وہ منظر دکھا دیا ہے مجھے

میں ایک دشت تھا خود اپنے ہی سراب میں گم
بس ایک موج نے دریا بنا دیا ہے مجھے

غزلوں کے ساتھ ساتھ اس مجموعے میں مبین مرزا کی نظمیں بھی شامل ہیں۔یہ نظمیں غزل کی فضا سے الگ اپنا ایک رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ان دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہوئے شاید ہر شاعر یہ محسوس کرتا ہو کہ غزل کے مقابلے میں نظم اور وہ بھی آزاد نظم میں اظہار کی آسانی اور بے ساختگی زیادہ ہوتی ہے۔پھر مبین مرزا کی نظمیں اُن کے افسانہ نگار اور کہانی کار ہونے کی بھی گواہی دیتی ہیں۔یہ نظمیں بیش تر جدید طرز کی اس اعتبار سے ہیں کہ ان میں ایک نامیاتی وحدت (Organic Unity) ملتی ہے جو نظم کے تأثر کو فزوں کردیتی ہے۔ان نظموں کی لفظیات اور ڈکشن بھی غزلوں سے الگ ہے۔چند نظموں پر تو ڈکشن اور طرزِ اظہار کی بنا پر گیتوں کا گمان ہوتا ہے کہ ان میں ہندی الفاظ اور ہندی شاعری کا رس بھی در آیا ہے۔

وقت کے اِس گہرے ساگر میں
ڈول رہی ہے جیون ناؤ
پیچھے بھی منجدھار ہے اس کے
آگے بھی منجدھار
اور اس ناؤ میں بیٹھا ہے اک سنسار
جانے کو اُس پار (راگ گیان)

سرسیّد سے لے کر اقبال تک اور غالباً آج بھی ہمارے معاشرے کی تاریخ کے اہم واقعات میں مغرب زدگی (Westernization) اور جدت طرازی (Modernization) ہیں۔یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ مغرب کی تقلید میں جدت طرازی کا جو پہلو ہے، کیا اُسے مشرق کی شکست سے تعبیر کیا جائے یا اس کے لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ:

عیب او جملہ بگفتی، ہنرش نیز بگو
(اُس کی برائیاں تو سب بیان کردیں اب کچھ اچھائیوں کا بھی ذکر ہوجائے)

مبین مرزا نئے عہد میں زندہ ہیں، نیو ورلڈ آرڈر کے کرشمے دیکھ رہے ہیں اور خود بھی جدید ذہن کے مالک ہیں، لیکن وہ اپنی وراثت، مشرقیت اور اپنی معاشرتی واخلاقی اقدار کے ضمن میں اصول پرست واقع ہوئے ہیں۔وہ ماس کلچر اور کنزیومرزم کی فضاؤں میں گم ہوکر بہ حیثیت فرد اور بہ حیثیت قوم اپنی شناخت سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔اُن کی ایک نظم کا عنوان ہے ''دشتِ امکاں میں''، اس کا ذیلی عنوان ہے ''مشرق کے لیے ایک نظم''۔اس نظم میں کن افکار اور خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، اس کا اندازہ نظم کی ابتدائی سطر ہی سے ہوجاتا ہے۔پھر نظم کے یہ مصرعے سامنے آتے ہیں:

تیری تہذیب کے اسرار تری زندہ روایات میں پوشیدہ ہیں
وہ درخشندہ روایات کہ جن پر دلِ گیتی کو سدا ناز رہا
دشتِ امکاں میں مری خاک نشینی کا حوالا تُو ہے

میرے مشرق تری نسبت سے ہے
تابندہ مرے سارے خیالوں کی جبیں
نظم کا اختتام ان مصرعوں پر ہوتا ہے:
دیکھ میں تجھ سے ہوں ایسے مجھے ناپید نہ کر
وہ حرارت جو لہو میں مرے باقی ہے ابھی سلب نہ کر
وقت کو اتنی بھی سرعت سے گزرنے کا ابھی اذن نہ دے
میرے ہونے کی نشانی نہ مٹا
یوں مجھے تند ہواؤں کے حوالے مت کر
ایسی تاریک مسافت پہ نہ بھیج
دیکھ اس طرح مجھے بجھنے نہ دے

یہ اور اس طرح کی دوسری نظمیں کسی وقتی اضطراب کا نتیجہ نہیں بلکہ شعور و آگہی کی ایک مستقل کیفیت کا نتیجہ ہیں۔ چناں چہ ایک نظم ''سے ساگر کی کتھا'' میں بھی ایسے جذبوں کا اظہار ہوا ہے۔ اس میں قرۃ العین حیدر کی انگلی تھامے اُن کے تخلیقی جہان کی سیر کرتے ہوئے، یہ احساس نظم کا اختتام بن جاتا ہے:

سال ہا سال سے درد کی سِل سینے پر رکھے
عینی آپا کی انگلی تھامے
میں تاریخ کی الجھی راہوں پر چلتا ہوں
اک احساس کی شدت سے بھیگی آنکھیں ملتا ہوں
اک ان دیکھی آگ میں جلتا ہوں
اور سوچتا ہوں
کیا یہ دُکھ کا ورثہ ہم پر آ کر ختم ہوا؟
یا اس دولت کی تقسیم ہمارے بعد بھی جاری رکھی جائے گی
کیا آئندہ نسلوں کے حصّے میں بھی تاریخ کی فتنہ کاری رکھی جائے گی
آخر کب تک آنے والی صبحوں پر گزرے وقت کی دھند مسلسل طاری
رکھی جائے گی!؟

ان نظموں کے علاوہ اس مجموعے میں شامل سبھی نظمیں لائقِ مطالعہ ہیں۔ ان میں تنوع بھی ہے اور فکریات کا پرتو بھی۔

ہر تخلیقی انسان کی زندگی خواب اور حقیقت کے درمیان بسر ہوتی ہے۔ الفاظ کے جتنے بھی تصویری پیکر بنتے ہیں وہ اسی تناظر میں اُبھرتے ہیں۔ مبین مرزا کی مجموعی شاعری ایک خاص تأثر مرتب کرتی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں، اپنے عہد کی عکاس ہیں۔ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مبین مرزا نے غزل اور نظم کے پیرایے میں زندگی کی کیسی لطیف اور نازک حقیقتوں کو تخلیقی گرفت میں لیا ہے۔ وہ شاعری کے رُموز سے واقف ہیں اور انھوں نے اپنے اس شعری مجموعے میں اسے سلیقے اور ہنرمندی سے برتا ہے۔ مبین مرزا کی شاعری کی یہ کتاب تخلیق کے کئی انوکھے زاویے رکھتی ہے اور تازہ کاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔

"نیپوٹزم"(Nepotism)

شیبا کوثر
(بہار)

زہر آلود فضاؤں میں
دائرے میں سمٹتے لوگ
پگھلتے برف کی طرح
وجود اپنا کھوتے ہوئے
موسم کی تبدیلی کے
یہ ہیں گواہ سارے
لیکن! یہ تبدیلی
بہتر نہیں کسی کے لئے
فنا ہو جائے گی
کتنی ہی بستیاں
ہیں اثرات اسکے جہاں جہاں
بہتر یہی تھا کہ
موسم نہیں بدلتے
جیسے بھی تھے جو کچھ
ویسے ہی رہتے سب کچھ
کھلا کھلا سا آسمان ہوتا
روشن ہر ایک مکان ہوتا
سارا شہر ایک جسم ایک جان ہوتا
چہرہ گلاب کوئی یوں نہ ہلکان ہوتا
بہتر یہی تھا کہ
موسم خوشنما ہی رہتا
گلاب گلاب رہتے سورج سورج ہی رہتا
اگر یہ "نیپوٹزم" نہ آتا
سکون زندگی کا یوں رائیگاں نہ جاتا۔۔۔!!

○

پہلا درویش

سلیم یزدانی

(●)

بعض لوگ سرِ راہ ملتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے مونس وغم خوار ہو جاتے ہیں۔ایک دن میں فضلی سنز کے دفتر میں گیا تو ایک صاحب کوطارق رحمٰن سے کسی ساتھ کتاب کے مسودے پر گفتگو کرتے ہوئے پایا۔طارق رحمٰن نے اُن کا تعارف مجھ سے کرایا کہ یہ مبین مرزا صاحب ہیں۔ہمارے ہاں کتابوں کی اشاعت کا شعبہ اب یہی سنبھالیں گے۔میں نے اُن سے ہاتھ ملایا، وہ اس دوران کرسی سے آدھے اُٹھ گئے۔میں نے کہا، آپ تشریف رکھیں اور میں بھی بیٹھ گیا۔

میں نے اپنا تعارف اُن سے خود کرایا۔میرا نام سلیم یزدانی ہے۔

طارق رحمٰن نے بیچ میں لقمہ دیا۔

''یہ میرے والد کے بے تکلف دوستوں میں ہیں۔ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔''

مبین مرزا نے میری طرف دیکھا۔پہلے ہی سے روشن آنکھوں میں کچھ اور چمک پیدا ہوئی۔مغل زادوں کی آنکھیں تو ویسے ہی کھنچی کمان ہوتی ہیں بس گھائل کرنے کی دیر ہوتی ہے۔مجھے ان کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔وہ دن ہے اور آج کا دن:

> ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
> سب اُسی زلف کے اسیر ہوئے

انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں اس سلیقے سے گفتگو کی اور وہ اندازِ گفتگو اختیار کیا کہ مجھے یہ بات کہنی پڑی کہ اس عمر میں اتنا knowledgeable نوجوان کا ہے کو کسی نے دیکھا ہوگا، اس کے اندر تو ایک بزرگ دانش ورسمایا ہوا ہے۔بعد میں پتا چلا کہ موصوف شاعر بھی ہیں، افسانے بھی لکھتے ہیں، تنقید کا شوق بھی بدرجۂ اتم ہے اور گفتگو کے تو بادشاہ۔جلد ہی یہ بھی پتا چل گیا کہ ذرا بد دماغ ہیں، ہر کسی کو گھاس نہیں ڈالتے، جس پر مہربان ہوں اُسی سے بات کرتے ہیں۔حافظہ خدا نے غضب کا دیا ہے۔سال ہا سال پہلے کے واقعات یوں بیان کرتے ہیں کہ جیسے کل ہی کی تو بات ہے۔کوئی بات، کوئی حوالہ، کوئی شعر ایک بار سن لیا تو بس حافظے میں محفوظ ہو گیا اور اب درست مقام اور درست وقت پر استعمال ہوگا۔چشم بد دور ذہن تو ماشاء اللہ انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں دُنیا جہاں کی چیزیں جمع ہیں اور اپنے وقت پر کام آتی ہیں۔

جب ملاقاتیں ذرا بڑھیں تو اور بھی جوہر کھلے۔بات کے ''پکے، رائے کے کھرے اور اصولوں پر لڑنے مرنے کو تیار۔لہٰذا یہ ہوتا کہ کبھی میں ان سے الجھ پڑتا اور کبھی وہ تیزی دکھانے لگتے۔ان کے آباو اجداد دہلی سے ملتان میں وارد ہوئے تھے۔ان کی ولادت ملتان میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔بعد ازاں بغرضِ تعلیم لاہور ہجرت کی اور پھر وہاں سے کراچی تشریف لے آئے۔انشورنس کمپنی میں ملازمت کی، اشتہاری کمپنیوں میں کام کیا، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروگراموں کا چسکا پہلے ہی سے لگا ہوا تھا، کراچی پہنچ کر بھی وہی کچھ کرتے رہے۔

میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ملازمت کرنا ان کی سرشت میں نہیں ہے۔ملازمت کے لیے ''یس سر'' والے مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔مبین مرزا کہاں ناک پر مکھی بیٹھنے دیتے ہیں۔غرہ یہ کہ شاہانِ مغلیہ کی مزاجی وراثت کے امین ہیں۔خفا ہو جائیں تو تلوار نکال لیتے ہیں۔حسن پرستی اُن کے خون میں ہے۔جہانگیر بادشاہِ ہند جب بنگال کے گورنر کی بیگم، نور جہاں پر فریفتہ ہوئے تو شیر افگن کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔اس کو راستے سے ہٹانے کے لیے اپنے دوست کو فوجی کمانڈر کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور وہ فوجی کمانڈر جس کا نام کوکلتاش تھا، اُن کی دوستی اور وفاداری کا حق ادا کرتے ہوئے تاریخ کے اوراق پر وفا کا نقش چھوڑ گیا۔

نور جہاں کے شوہر کا نام شیر افگن تھا۔نور جہاں کے حسن کے سارے ہندوستان میں چرچے تھے۔جہانگیر نے اُسے ملکہ بنا لیا۔کوکلتاش کے بیٹے کو، جو اس کا دودھ شریک بھائی تھا، بدایوں کا گورنر بنا دیا۔یہ بابا فریدالدین مسعودؒ کے اخلاف میں تھا۔میں اسی لیے کہتا ہوں کہ مبین مرزا کی دوستی سے بھی ڈرو اور حسن پرستی کے جذبے سے بھی کہ مبادا بے خبری میں مارے نہ جاؤ۔

یہ جو کچھ میں آپ کو سنا رہا ہوں، اصل میں یہ تین درویشوں کا ''قصہ ہے۔تینوں کا ساتھ ویسے تو دو دہائیوں کا ہے، لیکن خلوص ومحبت نے اس ذہنی اور قلبی رشتے کو صدیوں کا ساتھ بنا دیا ہے۔آج آپ ان تینوں میں سے پہلے درویش کا ''قصہ سن رہے ہیں، جس کا نام مبین مرزا ہے۔

مبین مرزا کے بارے میں یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہ درویش ہے، جو اپنی مستی میں مست ہے، دوسرا درویش سحر انصاری ہے جس کا شعر ہے:

> مسافتوں کا تسلسل زمیں پہ ختم نہیں
> کچھ اہلِ درد مسافر ہیں آسماں کے بھی

تیسرا درویش ابھی ظاہر نہیں ہوا، کسی لمحے تکیے میں وارد ہوگا اور داستانِ زیست کا تیسرا رخ سامنے آجائے گا۔اب میں اس مضمون میں مبین مرزا کو پہلے درویش ہی کے نام سے یاد کروں گا جو اس دنیا کو ایک ٹوٹے ہوئے کشکول کے سوا کچھ اور نہیں جانتا۔نہ اس میں لالچ ہے اور نہ زر کی محبت۔جہاں تک زن کا تعلق ہے...... چلیے یہ ''قصہ پھر کبھی سہی، فی الحال رہنے دیجیے۔یہ درویش اپنے آپ کو بھی کئی پردوں کے پیچھے چھپائے ہوئے ہے اور دوسرے درویشوں کی پردہ پوشی کا بھی پورا خیال رکھتا ہے۔

میں نے پہلے درویش جیسا بے لوث اور قناعت پسند شخص کم ہی دیکھا ہے۔جمیل الدین عالی بڑے وضع دار شخص ہیں۔اُن کی شاعری اور کالم نگاری دو بڑے حوالے ہیں۔دوستوں کے دوست اور ایک مہربان شخص ہیں۔وہ مبین مرزا کے بڑے قدر دانوں میں سے ہیں۔دس گیارہ سال پہلے اردو کالج جب اردو یونی ورسٹی

بنا تو انھوں نے بہت چاہا، بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ یہ پہلا درویش اردو یونی ورسٹی میں گریڈ انیس کے منصب پر براجمان ہو جائے لیکن اس کے پاس ایک ہی جواب تھا،''میں جہاں ہوں،خوش ہوں۔آپ کی مہربانی اور التفات کا شکریہ۔''

مبین مرزا کی درویشی کا صرف یہی ایک واقعہ نہیں ہے۔کئی بار ایسا ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ برسوں پہلے مسلم شمیم اور سیّد مظہر جمیل اسے سینٹ جوزف کالج جوائن کرانے کے خواہش مند تھے اور کہا کرتے تھے کہ اتنی تنخواہ تو فل پروفیسر کو ملتی ہے، جتنی آپ کو آفر کی جارہی ہے مگر پہلا درویش اپنی درویشی میں مست رہا۔ اسی طرح کچھ عرصہ پہلے فتح محمد ملک صاحب کہ وہ بھی پہلے درویش سے بہت محبت کرتے ہیں، اُسے کسی یونی ورسٹی میں ملازمت کے لیے اسلام آباد بلا رہے تھے، مگر یہ نہیں گیا۔ دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے، ایک دن رؤف پاریکھ پہلے درویش کو بڑی ہم دردی اور خلوص سے سمجھا رہے تھے کہ لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) سے جو آفر ہے، اُسے قبول کرلو۔ یہ بہت اچھی جاب ثابت ہوگی۔لیکن کیا مجال ہے کہ جو ایسی کوئی بات پہلے درویش پر اثر انداز ہو۔اسی طرح اُس کے کئی دوستوں نے جو مختلف چینلز پر کام کرتے ہیں، کوشش کی وہ چینل جوائن کرلے، کسی پروگرام کا اینکر بن جائے، مگر اس نے کسی کی نہ مانی۔مشہور نعت خواں صبیح رحمانی جو پہلے درویش کا قریبی دوست ہے، اُسے میں نے خود اصرار کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ تم اپنا سی وی تو دے دو۔اگر آفر اچھی نہ لگے تو چینل جوائن نہ کرنا،سی وی دینے میں تمھارا کیا جاتا ہے، مگر پہلا درویش اس کے لیے تیار نہ ہوا۔

ایسے کئی واقعات کے سحر انصاری اور میں عینی شاہد ہیں کہ کس طرح لوگ اُسے ملازمت کے لیے بلاتے رہے تھے اور یہ موصوف ہر بار کوئی نہ کوئی عذر پیش کرکے دُنیا کے دام سے بچ نکلے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے اپنا چھوٹا سا اشاعتی ادارہ اکیڈمی بازیافت قائم کیا تھا جو اللہ کے فضل سے اب ایک بڑا ادارہ بن چکا ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنا پہلا درویش صرف شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید کا مردِ میدان ہی نہیں، اچھا منتظم بھی ہے، ورنہ ایک باوقار ادارے کا روحِ رواں کیسے بنتا۔

یہ ادارہ بناتے ہوئے جن لوگوں نے اور جن احباب نے مبین مرزا کا ساتھ دینے اور ساتھ چلنے کے دعوے کیے تھے، اُن میں سے اکثر ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ اپنے خیال میں اسے بے یار و مددگار کر گئے تھے، لیکن یہ مغل بچہ ہمت ہارنے والا کہاں تھا۔ ماوراء النہر سے میدان مارتا دہلی آ پہنچا تو اُس نے کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمایوں جان بچا کر بھاگا۔عمر کوٹ کے صحرا میں اکبرِ اعظم کا ورود ہوا۔ ہمایوں پیچھے نہیں ہٹا، دہلی کی سلطنت واپس لی۔مغل بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ آج کل جو ادیب پورے برصغیر میں نثر لکھ رہے ہیں اُن میں پہلے درویش جیسی تہ دار اور دل پذیر نثر بہت کم لکھ رہے ہیں۔ دو اقتباسات میں پیش کرتا ہوں۔ آپ الفاظ کے انتخاب اور اسلوبِ تحریر پر غور کریں:

ویسے بھی اتنی بات تو ادب کے سبھی طالب علم جانتے ہیں کہ کسی بھی تخلیق کار کے یہاں کوئی استعارہ تشکیل پاتا ہے تو خواہ اُس کی بنیاد کتنی ہی ذاتی کیوں نہ ہو مگر اظہار کی سطح تک آتے آتے وہ بہت حد تک معاصر انسانی حقیقت کا نفسِ ناطقہ بن جاتا ہے اور سماجی نوعیت اختیار کرلیتا ہے۔سحر انصاری کے یہاں جس گھر کا ذکر ہمیں بار بار ملتا ہے، وہ کوئی چار دیواری قسم کا گھر نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی زندگی کی اُس طلب کا سوال ہے جو عہدِ جدید میں ایک بے حد گہرے المیے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ فرد سے سماج تک اور سماج سے کائنات تک معنویت کی مختلف سطحوں پر ابلاغ کرتا ہے۔اس کی ایک جہت شاعر کے، آپ کے اور میرے تجربے کو بیان کرتی ہے اور دوسری جہت انسان کے ازلی گھر یا Paradise Lost کی علامتی نوعیت کو سامنے لاتی ہے۔ لہٰذا میری دل چسپی اس امر سے ہے کہ یہ استعارہ آرکی ٹائپل سطح پر جس طلب کو ظاہر کرتا ہے، اُس کے تحت آج کی انسانی زندگی کی معنویت کو اس سے کیا فروغ ملتا ہے، فرد کے داخلی اضطراب اور محرومی کی کس شدت کو یہ ابلاغ کی سطح تک لاتا ہے اور پھر یہ کہ فرد، سماج اور کائنات کی تکون کے زاویے میں یہ استعارہ کیا کسی ایسے نکتے کی دریافت میں ہماری کوئی مدد کرتا ہے جہاں تینوں زاویے یکساں قوت سے اثر انداز ہوتے ہوں اور ہم گھر کے استعارے کو معاصر انسانی زندگی میں بے گھری کے المیے کی جو جو صورتیں ہمارے سامنے آرہی ہیں، اُن کو انسانی احساس کے مجموعی تناظر میں دیکھ سکیں۔

ملک و ملت کی انسانی صورتِ حال کے لیے تقابلی تناظر قائم کرنا ہو تو انھیں ادوارِ خلافتِ راشدہ یاد آتے ہیں——اور ابدی اصولِ حیات و کائنات کا حوالہ دینا ہو تو سلیم یزدانی کی نگاہیں قرآنِ حکیم کی جانب اٹھتی ہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا یہ طرزِ فکر اور اندازِ نگارش ایک ادیب کے لیے محض اپنے مسلمان ہونے کے اظہار کا ذریعہ ہے یا اس کے عقب میں کوئی گہری فکر اور ذہنی اسلوب موجود ہے جو حقائق کی تفسیر و تفہیم میں کوئی کردار ادا کرتا ہے؟

یہ ایک سنجیدہ اور خاصا اہم سوال ہے۔اس لیے نہیں کہ اس کے ذریعے ہم ایک کالم نویس، ایک صحافی یا ایک ادیب کے ذہنی رُجحان کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ تو خیر ہم کر ہی سکتے ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس سوال کے ذریعے ہم اُس آدرشی سوچ اور اُس کمیٹڈ ذہن کے مزاج کو جان سکتے ہیں جو اس زندگی اور اس میں واقع ہونے والے ہر عمل کو ایک اور بڑی حقیقت کے تطابق میں دیکھتا اور سمجھتا ہے۔یہ انسانوں کو اور ان کے معاشروں کو محض ان کی ارضی زندگی کے دائرے میں نہیں بلکہ کائناتی دائرے اور ان کی تقدیر کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کاوش ہے جو کہ آج ایک صحافت ہی کیا علوم و فنون کے پورے سیاق میں نایاب اگر نہیں تو کم یاب اشیا کے دائرے میں بہر حال آ چکی ہے۔ جب ہم سلیم یزدانی کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں یک گونہ خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں ابھی ایسے لوگ باقی ہیں جو اختصاص پسندی کے اس دور میں کلیت کے اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اور اس لیے بھی کہ اس گئے گزرے وقت میں بھی حقیقتِ کلی سے ارتباط اور چھوٹی سے بڑی حقیقت کی طرف جستجو کا رُجحان ناپید بہر حال نہیں ہوا ہے۔

نثر کے ان ٹکڑوں میں آپ نے الفاظ کے انتخاب، اسلوبِ تحریر کے ساتھ ایک اور چیز کو بھی ضرور نوٹ کیا ہوگا، وہ ہے پہلے درویش کی ذہانت اور بصیرت۔حمید

نسیم مرحوم پہلے درویش سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اس عمر میں اتنا وسیع مطالعہ اور ایسی بصیرت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب بھی پہلے درویش کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُس کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں اکثر اُس کی تحریر کو دیکھ محسوس کرتا ہوں کہ ایک نابغہ تشکیل پا رہا ہے۔ پہلے درویش کے بارے میں یہی رائے سحر انصاری کی اور میری بھی ہے۔

''سفید پردہ'' پہلے درویش کی وہ کہانی ہے جو ایک خاص situation میں سماجی و سیاسی جبر کی عکاسی کرتی ہے، جہاں غیر انسانی رویے سماجی قدروں کو روندتے نظر آتے ہیں۔ جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جب انسان مجبور ہو جاتا ہے، بے بس ہو جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ باپ بیٹے کے درمیان مکالمہ پوری سماجی تاریخ، ذہنی کیفیت، جبر و استبداد اور پرانی قدروں کا دم توڑتا منظر احتجاج اور پُر تشدد درّیوں کی نذر ہوتا نظر آتا ہے۔ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ اب emotions کے سامنے ہر چیز بے وقعت ہو جائے گی۔

''آپ کے بس کے نہیں رہے اب یہ۔ آپ سے زیادہ اونچی تھی ان کی آواز۔'' ابّا نے اماں سے کہا اور پھر بھائی کی طرف دیکھنے لگے، ''کیا کیا شکایتیں ہیں آپ کو ہم سے؟''

بھائی چند لمحے تو چپ رہا جیسے کچھ کہنے نہ کہنے کے بارے میں متذبذب ہو، پھر بولا، ''امتحان کے بعد سے فارغ ہوں، کوئی نوکری نہیں ہے۔ آپ کسی جگہ... ایسے ہی کب تک پھرتا رہوں گا میں۔''

''پتا ہے نا آپ کو کہ سرکاری نوکریاں بند ہیں۔ پانچ چھ مہینے پہلے ایک جگہ کچھ ویکینسیز نکلی تھیں، آپ گئے بھی تھے، نہیں ہو سکے، کیا کریں ہم؟''

''آپ چاہیں تو ہو سکتی ہے میری نوکری۔'' بھائی نے ذرا بگڑ کر کہا۔

''ہم کیوں نہیں چاہیں گے!''

''پھر آپ کہیے کسی سے۔ آپ کے کہے بغیر نہیں ہوگی۔ اُن انٹرویوز میں بھی یہی ہوا تھا۔ تھرڈ ڈویژن والوں کو مل گئی نوکری اور میری فرسٹ ڈویژن ہے، مجھے نہیں ملی۔ اس لیے کہ میری کوئی source نہیں تھی اور کوٹا سسٹم کی وجہ سے میں... حالاں کہ آپ... جس جگہ آپ ہیں اس جگہ بیٹھ کر آدمی...'' بھائی آگے کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

ابا خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر ایک دم تیز آواز میں بولنے لگے، ''تو کیا کریں، دامن پھیلائیں آپ کی نوکری کے لیے دوسروں کے آگے۔ معلوم ہے کیا ہوگا...؟'' وہ رُکے اور پھر دھیرے سے بولے، جیسے انھیں اپنی بلند آواز کا اندازہ ہو گیا ہو، ''ایک جائز کام کی سفارش کے بدلے میں ہم سے کئی ناجائز کام نکلوائے جائیں گے۔ جو کام ساری زندگی نہیں کیا ہم نے، وہ اب کرنا پڑے گا۔ اصولوں کی زندگی گزاری ہے ہم نے۔ کوئی اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا۔''

''ہاں اسی لیے تو ٹھوکریں کھا رہی ہیں آپ کی اولاد۔ آپ کو اپنے اصول زیادہ پیارے ہیں۔'' بھائی نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ لیکن یہ ڈوبتی ہوئی آواز بھی دھماکا کر گئی۔ ایک دم پورے گھر پہ سناٹا چھا گیا۔ خاموشی کے یہ چند لمحے صدیاں بن گئے۔

وہ مرزا فرحت اللہ بیگ ہوں، عصمت چغتائی ہوں، عظیم بیگ چغتائی ہوں، مرزا اسد اللہ غالب ہوں، یہ سب مغلوں کی وراثت کے امین تھے۔ ''تزکِ بابری''، ''تزکِ جہانگیری''، ''شاہجہاں نامہ'' اور زیب النسا کی شاعری کس مقامِ عظمت پر نظر آتی ہے۔ ان سب سے یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ DNA تخلیقی بہاؤ کا امین ہے اور دانش نسل در نسل منتقل ہوتی ہے۔ ہمارے پہلے درویش کی کہانی بھی ایسی ہی ہے۔ خود بہادر شاہ ظفر کیا بڑی مثال نہیں ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اپنا پہلا درویش سلطنت کا نہ سہی ادب کی قلمرو کا تو بادشاہ ہے۔

مبین مرزا کو ہم نے پہلا درویش کہا ہے۔ یہ بے وجہ نہیں ہے، بلکہ درحقیقت وہ درویشانہ صفات رکھنے والا شاعر اور ادیب ہے۔ کسی کی مدد کرنا ہو تو فوراً دامے درمے سخنے حاضر۔ ہر وقت اپنی ضرورت روک کر دوسرے کی احتیاج کو پورا کرنا وہ اپنا فرضِ اوّلیں سمجھتا ہے۔

آج کے فکری تناظر میں پہلے درویش کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں جو عصری فکر کے نمائندہ بھی ہیں اور اس کے دل کا حال بھی سناتے ہیں:

ثبوت بھی تو ملے تیرگی کی رخصت کا
ہمیں نویدِ طلوعِ سحر ہی کافی نہیں

پھر ایک روز یہ عقدہ کھلا کہ میں ہوں جہاں
وہاں تو اب مرا پُرسانِ حال کوئی نہیں

سبھی کردار اپنی وحشتوں میں ہیں یہاں گُم
سو کیا دادِ ہنر — یہ سب تماشا چل رہا ہے

اب فقط جسم نہیں روح بھی ہے محوِ طواف
ایسے بخشا ہے مری زیست کو محور تُو نے

پہلے درویش اور دوسرے درویش کی پہلی ملاقات کتابوں کی ایک دُکان میں ہوئی۔ پہلے درویش نے ذرا جھجکتے ہوئے دوسرے درویش سے مخاطب ہو کر پوچھا:

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ پروفیسر سحر انصاری ہیں؟''

''جی آپ قطعی غلطی نہیں کر رہے، خادم سحر انصاری ہے۔''

''جی جی۔'' ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے آپ کو پڑھا ہے، ملاقات کا شرف آج حاصل ہو رہا ہے۔ میں حال ہی میں کراچی منتقل ہوا ہوں، ملتان کا رہنے والا ہوں۔''

''وہاں کے مخدوم تو بہت مشہور ہیں۔ آیئے کہیں بیٹھتے ہیں۔'' دوسرے درویش نے دعوت دی۔

دونوں ساتھ ہو لیے۔ نہ کوئی خادم رہا نہ کوئی مخدوم۔ دونوں اصل میں درویش ہی تھے اور درویش ہی رہے۔ پچیس چھبیس سال پہلے ملے تھے، آج بھی

ساتھ ہیں اور آج بھی دوستی اور محبت کا وہی رنگ ہے، وہی مستی ہے۔ پہلے درویش کی عاجزی اور انکسار کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی ہو وہ اس سے نہایت تپاک سے ملیں گے اور کرسی سے پورے اُٹھ کر کھڑے ہو کر ہاتھ ملائیں گے۔ مجھ سے پہلی بار ملے تھے تو کرسی سے آدھے اُٹھے تھے۔ پہلا درویش آج بھی درویش ہے کل بھی درویش تھا اور آنے والے کل میں جذب کے بڑھنے کا بڑا امکان ہے۔ جب بھی دوسرا اور تیسرا درویش اُس سے ملنے جاتے ہیں، دفتر سے بغیر کھانا کھائے نہیں اٹھتے۔ جب کسی کو ایک ہی جگہ روٹی، کپڑا اور مکان میسر ہو تو نہ وہ در سے اُٹھے گا اور نہ کوئی اُسے اُٹھائے گا اور پھر تو کہنا ہی کیا جب مہمان اپنے میزبان کے لیے بھی باعثِ احترام ہو۔ پہلے درویش کا اپنے احباب سے ملنے کا انداز بھی الگ الگ ہے۔ جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے تو فون پر آواز پہچان کر پہلے ہنستے ہیں۔

''جی جی، بہت خوب'' (پھر ہنستے ہیں) ''جی ہاں جی ہاں۔ آپ آیئے، دیکھتے ہیں۔ جی جی، ضرور ضرور۔ یہ سامنے سلیم یزدانی صاحب بیٹھے ہیں، سلام کہہ رہے ہیں، خیریت پوچھ رہے ہیں، لیجیے آپ خود ہی بات کر لیجیے۔''

ایک اور فون بجتا ہے۔

''بھئی واہ وا کیا بات ہے صاحب! بڑی عمر ہے آپ کی۔ آپ ہی کا تذکرہ تھا۔ جی ہاں، جنابِ سحر انصاری اور جنابِ سلیم یزدانی اس وقت ہمارے ساتھ اسٹوڈیوز میں موجود ہیں۔ سلام کہہ رہے ہیں۔ نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ جلیبیاں آپ کے بغیر نہیں۔ وہ تو جب آپ آئیں گے تو ہوں گی اور برنچ بھی— یاد ہے نہ آپ کو کہ اتوار کو ہم لوگ برنچ پر اکٹھے ہوں گے۔'' فوراً پتا چل گیا کہ یہ سیّد مظہر جمیل یا باقر نقوی ہیں۔

کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ پہلے درویش کو پوری طرح جانتا ہے۔ ویسے تو یہ بات کسی بھی شخص کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، لیکن پہلا درویش چوں کہ ایک تخلیقی ذہن رکھتا ہے، اس لیے مثلِ پارے کے مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے درویش سے اس پارہ صفت شخص کے اتحاد کی بڑی وجہ جوہروں کا اتّصال ہے۔

پہلے درویش کی ایک بڑی خوبی اُن کی طبیعت کا ایثار ہے۔ تیسرا درویش اُن کی والدہ کا معالج بھی ہے، بلکہ فیملی ڈاکٹر ہی سمجھیے۔ پہلا درویش اپنی والدہ سے بہت شدید محبت کرتا ہے۔ اُن کا ہر طرح خیال رکھتا ہے اور ہر کام پر ان کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ادب میں اور زندگی میں وہ جہاں بھی پہنچا ہے، اصل میں ماں کی دعاؤں کی بدولت پہنچا ہے۔ جب وہ اپنی والدہ کو عمرے پر لے کر گیا تو بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ خوش ہونے اور جذباتی ہونے اور شکر ادا کرنے کی بات تو تھی نا۔

وہ بہت ذمہ دار آدمی ہے۔ خاص طور سے اپنی فیملی کے بارے میں۔ بس ایک یہی بات ایسی ہے کہ جو اصلی اور وڈی ہے اور مغلوں میں ناپید ہے۔ ورنہ اس معاملے میں مغلوں کا تاریخی ریکارڈ یہ ہے کہ اپنی غرض کی خاطر، حرص و طمع کی خاطر، اونچا ہونے کے لیے باپ راستے میں آ جائے یا بھائی یا بہن، راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں کرتے۔

ہم تین درویشوں کا یہ گزشتہ کئی برسوں سے چلن رہا ہے کہ ہم مہینے دو مہینے میں فائیو اسٹار ہوٹل میں برنچ سے محظوظ ہوتے ہیں۔ کھانا تو اتنا اہم نہیں ہوتا ماحول کی تبدیلی، نئی نئی شکلوں کا ظہور، حسن کے نئے نئے پرتو۔ کسی نے کتنا سچ کہا ہے:

God is beauty and beauty is God

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ادب پر گفتگو مقصود ہوتی ہے۔ برنچ کو سمٹوایا اور کافی شاپ میں جا بیٹھے۔

دوسرا درویش (سحر انصاری) ہر کس و ناکس میں اتنا مقبول ہے کہ ابھی بیٹھنے نہیں پاتا کہ چاہنے والے آ آ کر سلام پیش کرتے رہتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر اُن کی ادھیڑ عمر شاگرد خواتین ہوتی ہیں۔ سر بھی اُنھیں پہچاننے میں دیر نہیں کرتے۔ وہ سر جھکاتی ہیں اور وہ اپنا دستِ شفقت اُن کے سر پر پھیرتے ہیں۔

پھر راقم الحروف کے اصرار پر جو نئے اشعار القا ہوئے ہوتے ہیں، سنانے پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوتے ہیں۔ لوگ یقیناً رشک کرتے ہوں گے اور خاص طور سے کافی شاپ کی وہ ویٹرس (اب اس کی شادی ہو چکی ہے) جو کسی نہ کسی بہانے قریب ہونے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ ایک دن کہنے لگی کہ میں نے کبھی آپ لوگوں کے ساتھ چوتھا آدمی نہیں دیکھا۔

میں نے کہا، ''وہ ابھی چلّہ کاٹ رہا ہے، جب درویشوں کی صحبت میں رہنے کے آداب سے واقف ہو جائے گا تب ہی آئے گا۔'' وہ ہنس کر چلی گئی۔

ہم تینوں کی روزہ کشائی کی بھی بڑی طویل روایت ہے۔ ہم تینوں رمضان کے آخری تین اتواروں کو روزہ باہر کھولتے ہیں۔ روزہ ہونا شرط نہیں ہے، روزہ کھولنا شرط ہے۔ روایت اچھی ہے تو جاری رہنا چاہیے۔

کئی سال گزرے ایک بار ایسا ہوا کہ ہم تینوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تینوں الگ ورائٹی کی اشیائے افطار لے کر میز پر اکٹھے ہوں گے۔ ایک کباب، تلی ہوئی بٹیریں اور چکن تکا لے آئے دوسرا دہی بڑے، چھولے، پکوڑے لے آئے اور تیسرا فروٹ چاٹ، چکن ملائی بوٹی اور کھجوریں اور مٹھائی اور شربت کا جگ لے آئے۔ تعمیل ہوئی اور میز سج گئی، لیکن فوراً ہی تینوں کو احساس ہوا کہ یہ تو کچھ اچھا نہ ہوا۔ تینوں ڈھیر ساری افطاری دیکھ دیکھ کر شرمندہ ہونے لگے کہ یہ کیا حماقت ہو گئی لیکن جب تیر کمان سے نکل جائے تو کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔ اُس دن جو اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی سو ہوئی آئندہ کے لیے اس طور طریقے سے توبہ کر لی۔ اللہ درویشوں کی ایسی ''تگوڑی'' کو سلامت رکھے جس میں ایک شاعر افسانہ نگار، تنقید نگار اور دانش ور ہے اور ''مکالمہ'' جیسے رسالے کا ایڈیٹر ہے۔ دوسرا ماہرِ تعلیم، شاعر اور وہ دانش ور ہے جو خدا سے بات کرتا ہے۔ سحر انصاری کے تازہ شعری مجموعے کا نام ''خدا سے بات کرتے ہیں'' جو بہت خوب صورت ہے۔

نومبر ۲۰۱۲ء کے ایک روز سحر انصاری ایک تجربے سے گزرے۔ اُن کو طبیعت میں عجیب بے چینی، جسم میں کم زوری، دل میں بیٹھنے کا احساس کہ بس اب گیا کہ تب گیا والی کیفیت کا تجربہ ہوا۔ یارانِ چارہ گر کے دل و دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اُن کے سینے میں درد کی ایک لہر آتی اور ایک جاتی تھی، یوں جیسے

قیامت سی گزرتی ہے۔سانس لینے میں دِقت تھی۔سب گھبرا گئے، لے کر دل کے اسپتال پہنچے۔تشخیص یہ ہوئی کہ شدید درجے کا ہارٹ اٹیک تھا۔اللہ نے کرم کر دیا کہ جان بچ گئی۔دوادارو اپنی جگہ مگر اب بائی پاس ضروری ہے۔

سحر انصاری سے ہمارا قلبی لگاؤ، دوستی، خلوص اور ہم آہنگی اور ہم خیالی دو ایک دنوں کی نہیں، ایک دو سال کی نہیں، کم و بیش ستاون سال کی ہے۔ہم دونوں گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں ہم جماعت تھے۔جب وہ بائی پاس کے لیے اسپتال میں داخل ہوئے تو آپریشن کے مرحلے سے پہلے میں اور مبین مرزا مزاج پرسی کے لیے گئے تو انھوں نے میرا ہاتھ ہاتھ میں لے لیا۔اس لمس نے ستاون سالہ رفاقتوں، محبتوں اور فکری سفر کے منظر جگا دیے۔سحر انصاری ہمیشہ کے رقیق القلب ہیں اور آبدیدگی کی کیفیت میں رہتے ہیں۔اُس وقت بھی آنسوؤں کی پلکوں پر لرزنے لگے۔

میں نے کہا، جانِ من کس بات کی وحشت ہے تجھے۔دل تو پہلے ہی پارہ پارہ ہے۔ہارٹ سرجری کی نوبت تو اب پہنچی ہے یہ تو صد ہزار بار کا زخم ہے۔چلو اچھا ہے، اس بہانے سے کھلے زخم سل جائیں گے۔وہ مسکرائے تو ہم نے رخصت چاہی۔سر پر ہاتھ پھیرا، پیشانی کو بوسہ دیا اور چلے آئے۔

ہارٹ کی سرجری ہوگئی۔سینہ کھولا گیا، دل کیا تھا ایک صنم خانہ تھا۔صفائی اور پیوند کاری ہوئی—بعد میں فیصلہ ہوا کہ سینہ ایک بار اور کھولنا پڑے گا۔چناں چہ ویسا ہی ہوا۔یوں باقی پوشیدہ در بھی صاف کیے گئے۔اس کے بعد بھی طبیعت سنبھلنے میں خاصا وقت لگا۔مجھے ذہین شاہ تاجی کا وہ شعر بار بار یاد آنے لگا کہ:

شیخ میخانے میں آیا تو مسلماں آیا
کاش میخانے سے نکلے تو مسلماں نکلے

لیکن سحر انصاری جب بھی آپریشن تھیٹر سے باہر آئے تو صنم خانہء دل کے کسی گوشے میں ایک آئینہ پنہاں تھا جس میں زندگی کے ہزاروں روپ لرزاں تھے۔ڈاکٹر پریشان تھے، ایسا پہلے کا ہے کو ہوا تھا لیکن انھیں اپنی سی کوشش تو کرنی تھی۔دل کی شیشہ کاری کا یہ تیسرا مرحلہ تھا۔تیسری بار سینے کو کھولنے کا فیصلہ ہوا۔سحر انصاری نے حوصلہ نہیں ہارا۔بھلے شاہ نے جو کہا ہے:

بھلیا اساں مرنا نہیں
گور پیا کوئی ہور

تیسری بار ڈاکٹروں نے لرزتے ہاتھوں سے سینہ کھولا۔زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔اس سے پہلے انھوں نے موت کو تو دیکھا تھا زندگی کا کشف وکمال آج نظر آیا۔دل کیا کھلا زندگی کے بند ہوئے دروازے فشارِ خون کے ریلے سے وا ہوگئے۔ان دروازوں کے پیچھے موجود ایک بڑے شاعر کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔لہٰذا تیسری بار جو سینہ کھلا تو زندہ شاعری کا سیلاب آ گیا۔اس کے بعد سحر انصاری نے کئی خوب صورت غزلیں کہیں۔میرے بیان کی تائید میں ۸/جون ۲۰۱۳ء کی رات میں کہی گئی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

لمحے تکلفات میں برباد کیا کریں
جو یاد آ رہا ہو اُسے یاد کیا کریں
تازہ اُفق پہ جا کے ہنر آزمائیں گے
فرسودہ کائنات میں ایجاد کیا کریں
گونگے دہن ہیں اور ہیں بہری سماعتیں
ایسی فضا میں نالہ و فریاد کیا کریں
آتے ہوں جن کے درس بھی اہلِ ہوس کے کام
ان مدرسوں میں آن کے استاد کیا کریں
جب ہو خدا کی سمت سے آفات کا نزول
باشندگانِ ملکِ خدا داد کیا کریں
آتے نہیں ہیں کام سحؔر دل کے مشورے
دل پر پڑی ہو جب نئی اُفتاد کیا کریں

بہرحال آیئے واپس اپنے قصے کی طرف۔میں آپ کو بتا چکا کہ پہلا درویش مبین مرزا ہے، دوسرا سحر انصاری اور اب سنیے تیسرے کی۔تیسرا ہے یہ راقم الحروف جو کہ خاکہ نویس، ڈراما نگار، افسانہ نگار، نقاد، کالم نگار اور سیرت نگار ہے۔میرا پہلے درویش سے بیس سالہ اور دوسرے سے تقریباً ستاون سالہ دوستی کا رشتہ قائم و دائم ہے۔میں اپنے ان دونوں دوستوں کا مداح اور مزاج شناس ہوں۔میں نے ایک دن پہلے درویش کو چھیڑتے ہوئے کہا:

''آپ اپنے اس اندازِ قناعت کو اب ترک کر دیں کہ زمانہ بہت بدل چکا اور یہ ماضی کا چونچلا ہے، کیا اس سے چھٹکارا پانا اچھا نہیں ہوگا؟'' کہنے لگے، ''یہی تو شکر گزاری ہے اور یہی تو ورثہ ہے۔یہی اوپر والے کی بہت بڑی نعمت، بہت بڑا تحفہ ہے۔'' پہلے درویش کی اس بات پر مجھے اُس کا ایک شعر یاد آ گیا:

وہ میرے بزرگوں کا قبیلہ ہی الگ تھا
پہنچی ہے جو مجھ تک سو وراثت بھی سوا ہے

دوسری طرف موصوف کی ایک اور خوبی کا حال بھی سن لیجیے۔پہلے درویش کی خوش پوشی کا یہ عالم ہے کہ موصوف لباس بھی موسم کی رعایت سے زیب تن کرتے ہیں۔لڑکیاں اُن کی اس روش کی داد اس طرح دیتی ہیں کہ ان پر صدقے واری ہوتی ہیں۔میں کئی واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔ویسے یہ حقیقت ہے کہ موصوف ہر ایک کو گھاس نہیں ڈالتے۔ان کی چشمِ التفات تو صرف انارکلی کے لیے ہے، لیکن یہ مغل بچے غضب ہوتے ہیں، جس پہ مرتے ہیں اُسے مار رکھتے ہیں۔پہلے درویش کے بال کہیں آدھے سے زیادہ سفید اور کہیں زیادہ کالے اور کہیں آدھے کالے اور آدھے سفید ہیں۔چہرہ مغلوں کی طرح نوکیلا، آنکھیں حسیناؤں کی طرح روشن، گہری اور سوچتی ہوئی۔چال عسکریوں کی طرح، لگتا ہے کہ چلنے والے اُنھیں دیکھتے ہیں مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور گفتگو کا تو کہنا ہی کیا ہے۔وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

''کیا فقرہ نکالا! واہ وا'' سحر انصاری نے داد دی۔''اب تو برنچ پکا ہو گیا۔'' آواز آئی، ''جی جی! کیوں نہیں۔طے ہوا، اسی اتوار کو محفل جمتی ہے۔''

اب یہ سلسلہ تو ہمیشہ کی طرح عمرو عیار کی زنبیل کی سیر کرا کے چھوڑے گا۔ہم اپنے خاکے کو اسی فقرے پر ختم کرتے ہیں—آپ برا تو نہیں مانے۔

تابانی اور توانائی کا شاعر

ڈاکٹر علی احمد فاطمی
(الٰہ آباد)

دیارِ پاک کے مبین مرزا۔مکالمہ کے مدیر مبین مرزا۔افسانہ نگار مبین مرزا کو میں ایک طویل عرصہ سے نہ صرف جانتا ہوں بلکہ پسند بھی کرتا ہوں۔کراچی کی دو ایک تقریبات میں تنقیدی مقالہ بھی پڑھتے سنا تو میں ان کی تنقیدی ژرف نگاہی کا بھی قائل ہوا۔لیکن جب اچانک ایک دن ڈاک سے مکالمہ کے نئے شمارے کے ساتھ مبین مرزا کا شعری مجموعہ (تابانی) بھی ملا تو مسّرت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ مبین مرزا شاعر بھی نکلے۔اوراق الٹے تو پتہ چلا کہ وہ تو مدت سے شاعر ہیں اور غالباً پہلے شاعر ہی ہیں تو اس حیرت و مسّرت میں مزید اضافہ ہوا۔مبین مرزا بڑے نک سک اور رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ان کا رسالہ۔ان کا ادارہ اور ان کا گھوارا سب کے سب نپا تلا۔جانچا پرکھا۔معیاری اور طرحداری ہوا کرتا ہے۔ہر آدمی ان کا دوست نہیں ہوسکتا۔ہر شاعر ان کی نظر میں شاعر نہیں ہوسکتا۔ادیب۔نقاد نہیں اور ہر۔۔۔یہ میری خوش بختی ہے وہ مجھے اپنا دوست بلکہ ''مہربان دوست'' سمجھتے ہیں (کتاب میں یہی لکھا ہوا ہے) کتاب میں میرے تعلق سے ادیب و ناقد بھی لکھا ہوا ہے جو میں نہیں ہوں لیکن دوست ہونے میں تکلف تو کیا بلکہ مسّرت کا احساس ضرور ہے۔جو انسان بہ یک وقت ادیب۔ناقد۔مدیر۔تخلیق کار ہو تو وہ نرا شاعر یا روایتی شاعر نہیں ہوسکتا۔وہ دانشوار بھی ہوگا'مفکر اور مدیر بھی ہوگا چنانچہ جب میں تابانؔی کے اوراق الٹے تو ابتداً وقت کے چاک پر'' کے عنوان سے ان کا مقدمہ/دیباچہ پڑھا تو میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔تاریخ و تہذیب، سیاست و صارفیت میں ڈوبا یہ مقدمہ ایک شاعر کے نقطۂ نظر کو تو ظاہر کرتا ہی ہے نیز ایک دانشوار کی دانشوری۔سنجیدگی اور فکر مندی اور مبین مرزا اجازت دیں تو عرض کروں کہ ان کی روشن خیالی اور ترقی پسندی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ان کے چند جملے پیش کرتا ہوں جو آج کے عہد کا مکالمہ تو ہیں ہی۔المیہ بھی ہیں اور رزمیہ بھی۔پہلے المہ دیکھیے

''عہدِ جدید انسانی تہذیب و تقدیر پر خط تنسیخ پھیرنے پر مصر ہے۔''

''اس عہد کا مسئلہ اشتباہ ہے۔آج حق اور حق۔خیر اور خیر، سفید اور سفید کا مابین اشتباہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔''

''آج ہمیں جھوٹ ہی سچ کے لہجے میں بولتا سنائی نہیں دے رہا ہے بلکہ سچ کا بیانیہ بھی جھوٹ کا گہرا پرتو لیے ہوئے ہے۔''

اس المناک حقیقت سے کم و بیچ ہم بھی واقف ہیں اور اس سے بھی واقفیت ہے کہ کچھ لوگ انھیں حالات سے گھبرا کر مایوسانہ اور مریضانہ ذہنیت کا شکار ہو کر اپنے عہد کی تقدیر کے معالے سرخم کیے ہوئے ہیں لیکن مبین مرزا اس سے آگے بہت آگے پوری ہمت اور جسارت کے ساتھ سوال قائم کرتے ہیں جو ان کے نہ صرف پرامید بلکہ رجائی اور نشاطیہ کیفیت کو ظاہر کر کے ان کے ذہن اور وژن کو بڑا کرتا ہے جب وہ پورے اعتماد کے ساتھ یہ سوال قائم کرتے ہیں۔''کیا یہ قوتیں اپنی اس خواہش کر شرمندہ تعبیر کر پائیں گی؟''سوال کے جواب میں ایک اور خوبصورت اعتماد اور مبین مرزا کے ترقی پسندی اور روشن خیالی کو ظاہر کرتا ہے

''نہیں اس قوت تک ہرگز نہیں جب تک انسانی معاشروں میں روشن ضمیر تخلیق کار ادیب۔شاعر پیدا ہوتے رہیں گے۔''

اور یہ بھی۔۔۔''اس کے خلاف موافعت کا رویّہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے!''

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ۔۔۔''یہ اختیار ہمارے پاس ہے کہ اپنے لیے راستے اور منزل کا تعین خود کریں۔''

اس کے بعد انھوں نے شاعری، شاعری کی اثر پذیری، شاعری کی مار اور للکار پر دھیمے انداز میں معنی خیز باتیں کی ہیں جن کا ذکر آگے آسکتا ہے بس یہاں اتنا ہی کہ مبین مرزا نے اپنے آپ کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر مانا ہے اور شاید یہ سچ بھی ہے اس لیے میری بیشتر گفتگو کا انحصار ان کی غزلیہ شاعری پر ہوگا۔حالانکہ ان کی نظموں پر بھی سنجیدہ گفتگو کی ضرورت ہے۔

مبین مرزا کی شاعری اسی المیہ اور رزمیہ کے درمیان کی شاعری ہے لیکن شاعری میں اس کا اظہار یا اس کی تلاش نثر کی طرح ممکن نہیں کیونکہ غزل میں خواہ کتنی ہی ''تابانی'' ہو روانی اور جوانی ہو لیکن اس کا رومانی اور وجوانی ہونا ضروری ہوا کرتا ہے۔فراق گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عمدہ شاعری کے لیے علمِ کائنات سے زیادہ شعورِ کائنات ضروری ہوا کرتا ہے کہ یہی شعور ہی تخلیق وجدان کا ناگزیر حصّہ بنتا ہے۔مجموعہ کی پہلی ہی غزل ملاحظہ کیجئے جس میں حیرانی، طغیانی، سلطانی وغیرہ سبھی کچھ ہے لیکن اس سے زیادہ روانی ہے۔کیا رواں اور چست مطلع ہے

چلے جائیں گے سب اسباب حیرانی نہ جائے گی
کسی صورت دل و جاں کی یہ ارزانی نہ جائے گی

مطلع اور مطلع کے بعد کے شعر میں روایتی لب و لہجہ تو ہے لیکن اس کی قرأت اور ساتھ ہی اس کی معنویت غزلیہ شاعری کے پورے لطف و انبساط کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے لیکن تیسرے شعر میں فیصلہ اور گواہی اور آج کے حالات کے مدّ نظر۔تنفر اقدار کی نازک سی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اسلوب وہی ہے جس سے غزل کا آہنگ بنا رہتا ہے۔اسی طرح آخری شعر میں آسائش اور ویرانی کے تضادات و تصادمات نے شعر کو بامعنی اور بااثر بنا دیا ہے۔اسی طرح دوسری، تیسری، چوتھی غزل کو غور سے پڑھئے تو صاف اندازہ ہوگا کہ کہیں دورِ میر کا میرستان بول رہا ہے تو کہیں دور مبین کا پاکستان۔اور اب تو دنیا گلوبل ہوگئی ہے تو کیا قدیم و جدید اور کیا مشرق و مغرب۔انسان، انسانی محبت، محنت اور اس کی

حزمت اور قیامت سب گھل مل گئے ہیں لیکن عشق ہنوز جاری ہے، ظلم بھی جاری ہے۔ دیکھئے کیا عمدہ اشعار ہیں، کیا کیفیت ہے جہاں وحشت ہے قیامت بھی لیکن ساتھ ہی محبت بھی۔

عشق آباد رہے عشق میں وحشت کیسی
دل اگر دکھ بھی گیا ہے تو شکایت کیسی
لپٹی رہے گی اس طرح قدموں سے دنیا کب تلک
برپا رہے گا خاکِ جاں تیرا تماشا کب تلک
بڑے طوفان اٹھانے کے لیے ہیں
یہ آنکھیں مسکرانے کے لیے ہیں

عشق کی وحشت اور دنیا کی زحمت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ عشق کا تعلق دل سے ہے اور دنیا کا تعلق قدم سے ہے حالانکہ وہ سینہ بھی کہہ سکتے تھے لیکن ایک اچھا عاشق شاعر، دانشور اور دنیا کو قدموں میں ہی رکھ کر چلتا ہے۔ یہ عاشق کی سوغات اور جذبۂ عشق کے تصورات جہاں دنیا اکثر قدموں میں ہی رہتی ہے۔ دنیا کیا خود اپنے جسم وجاں مٹی کے ڈھیر لگنے لگتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے

مدت ہوئی ڈھوتے ہوئے اس جسم وجاں کے ڈھیر کو
اے زندگی پھرتا رہوں لے کر یہ ملبہ کب تلک

اور اس شعر میں تو آدابِ عشق اور تہذیب کے تہذیب عاشقی معیار بن کر ابھرتے ہیں۔

یہ عشق ہے تو سیکھئے آدابِ عشق بھی
یوں بزم میں نہ یار کو رغبت سے دیکھئے
وصل وفراق مت اسے گردانیئے حضور
یہ اور مرحلہ ہے سوہمت سے دیکھئے

اور یہ ہمت صرف معاملاتِ عشق اور وارداتِ قصی تک محدود نہیں بلکہ وارداتِ دنیا میں بھی ضروری ہے اس لیے ان کے ایسے اشعار میں بلا کی معنویت اور کیفیت نظر آتی ہے۔

ساتھیو! جو عہد کا باندھا ہے اسے توڑا نہ جائے
جسم میں جب تک لہو ہے معرکہ ہارا نہ جائے
میرے دکھ سکھ میرے اندر زندہ ہیں سب کی طرح
شہر کے لوگوں سے مجھ کو مختلف سمجھا نہ جائے

ان اشعار میں ساتھیو کا خطاب اور سب کی طرح کی شمولیت شاعری کو انفرادیت کے محدود دائرے سے نکال کر اجتماعیت کی دہلیز پر لا کھڑا کرتی ہے اور شعر وشاعری کا مقصد اور کینوس از خود بڑا ہونے لگتا ہے۔ غزلیہ شاعری اکثر انفرادی کیف وکم کا خود مکتفی اظہار یہ ہوا کرتی ہے لیکن سنجیدہ اور باخبر شاعر اس ذاتی کیف وکم میں زمانے کے پیچ وخم اور سرد وگرم کو بھی خلاقانہ انداز سے پیش کرتا چلتا ہے کہ شاعری آپ بیتی ہوتے ہوئے بھی جگ بیتی بن جاتی ہے اور صرف اپنی ذات کی پکار نہیں بلکہ عہد کا پکار بن کاتی ہے کبھی کبھی للکار بھی۔ لیکن یہ مستحق عمل بھی اسی وقت ممکن ہے جب شاعر تصورِ عشق کے محدود دائروں سے نکل کر حیات کائنات پر کمندیں ڈالتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نرم ونازک غزل کا شاعر ہمہ وقت مقصدیت، خارجیت کی باتیں نہیں کرسکتا ہے کبھی کبھی تو شاعر کے وجدان کو علم وآگہی بھی مطمئن نہیں کرتی۔ تہذیب وتمدن کی نشونما کی انیک جہتیں ہوا کرتی ہیں شاعری میں اس کے اظہار کی مختلف قسمیں ہوا کرتی ہیں۔ یہاں اضطراب کو احساس میں اور معلوم کو محسوس میں بدلنا پڑتا ہے اور تکلم کو ترنم میں گفتار ارتعاش میں نظر آنے لگے۔ زندگی کا ہر تجربہ اضطراب سے اساس اور احساس سے ادراک میں تبدیل ہوجائے لیکن یہ لمحے ایک فنکار کی زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں اسی کو کولررج نے Best moment of best life کہا ہے۔ تخلیق بصیرت اور لاشعوری وجدان کی یہ وہ منزل ہوتی ہے جب معشوق کی پلکوں کے زیروبم میں دنیا کے سرد وگرم دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مبین مرزا نے بھی ابتدا میں ایک مقام پر لکھا ہے۔۔۔''یہ وقت کی دیوار کے اس پار دیکھنے کے لیے نگاہ فراہم کرتی ہے۔ یہ ماروا کو محسوس اور بعید از قیاس کو قابلِ فہم بناتی ہے۔۔۔شاعری معجزہ ہے۔ جزوی است از پیغمبری اور حرف کن کی تاثیر سے معمور'' اور پھر یہ بھی۔۔۔''یہی نگارِ بزار شیوہ میرے لیے زندگی کا سرو ساماں ہوتی۔۔۔'' سروساماں تک ہوتی تو شاید سفر دور تک نہ جاتا لیکن مبین مرزا کی بعض غزلوں کا جو معیار ومذاق ہے جو رنگ وآہنگ ہے اور جو جمال وجلال ہے وہ سروساماں کو نقد جاں اور افتخار جاں بناتا چلتا ہے۔ چند اشعار اس نوع کے دیکھئے

کچھ ایسے مرحلے بھی عشق کی منزل میں آتے ہیں
کہ جب خود افتخار جاں کے پہلو دل میں آئے ہیں
کچھ ایسا ہے غم تنہائی در پیش
کہ اک عالم کو اپنا کر رہے ہیں
بکھرتی رت سے نئی آرزو ہر آن ملی
یہ زندگی ہمیں دکھ سکھ کے درمیان ملی
میں دن بھر پہلے اس دنیا کی جولانی میں رہتا ہوں
مگر پھر رات بھر دل کی بیابانی میں رہتا ہوں
مجھے ہر روز یہ دنیا نئی صورت میں ملتی ہے
میں پیہم اس شناسائی کی حیران میں رہتا ہوں
حقیقت ہے کہ اک دھوکہ ہے دنیا
جو ہے بس حسنِ اندازہ ہے دنیا

حسنِ اندازہ۔ افتخار جاں۔ پیہم شناسائی وغیرہ کی ترکیبیں محض لفظی دروبست نہیں ہیں بلکہ اس میں واقعتاً زندگی کی جہتیں۔ پرتیں ہیں جس کو پورے شعور واحساس کے ساتھ شاعر نے شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مبین مرزا نے تخیل

وتصور کے شاعر نہیں وہ ایک بامقصد اور باعمل انسان ہیں اس لیے مقصدیت اور عملیت کے جو مشاہدات وتجربات معیاری و بامعنی شاعری کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں وہ ان کے یہاں تفکر، تعقل اور تخیل کے طور پر رچ بس گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کے خیالات اور سوالات میں خارجی نوعیت کی تھرتھراہٹ تو ہے لیکن اس کے اندازوں میں ایک مخصوص قسم کا جمالیاتی ارتعاش بھی ملتا ہے جو شعر وشاعری سوال کو جمال میں بدلتا چلتا ہے۔ شاعری کی یہ منزل آسان نہیں ہوتی۔ یہاں زندگی کے خارجی تجربات کو قلبی واردات میں ڈھالنا پڑتا ہے، شعری وجدان کا حصّہ بنانا پڑتا ہے۔ اسی لیے اکثر یہ ہوتا ہے جو خالص سماجی وخارجی شاعری کرتے ہیں اور ان کے پاس احساس کی نزاکتیں کم کم ہوتی ہیں یا نہیں ہوتی ہیں ان کی شاعری کوری نعرہ زنی بن کر رہ جاتی ہے لیکن جو لطیف احساسات اور شعر کی نزاکتوں ولطافتوں پر نظر رکھتے ہیں وہ سماجیت اور خارجیت کو بھی نہاں خانوں میں جذب وپیوست کر کے اعلان کو وجدان حقیقت کو رومان میں تبدیل کر دیتے ہیں اور پھر نعرہ زنی، احساس واضطراب آنی بن جاتی ہے جو فیض نے کیا۔ جذبی نے کیا اور جو کافی پہلے غالب اور مومن نے کیا اس کے لیے صرف نظریاتی وابستگی کافی نہیں بلکہ والہانہ سپردگی کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ شاعر کی پوری ہستی تخلیق میں تحلیل ہو جائے۔ مکمل سپردگی میں خوابناکی کی کیفیت ہوتی ہے جو تکلم، ترنم اور تفکر میں ضم ہو کر ایک نئی حقیقت کو جنم دیتی ہے پھر اس وقت بقول فراق۔۔۔ ''ہر چیز اس وقت سہاگن ہو جاتے ہے اور ساتھ میں اس کے ابدی کنوارپن کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔''

مبین مرزا نے اپنے دیباچے میں جس طرح آج کے حالات، حادثات اور تغیرات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے چند جملے پھر پیش کرنا چاہتا ہوں

''آج وقت کی طنابیں کھنچی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔''

''جنگی جارحیت۔ استحصال حربوں۔ معاشی عدم مساوات۔ مذہبی، نسلی ادارے فی تقسیم کے باوجود وہ دنیا آج کی طرح آتش فشاں کے دہانے پر بارود کے ڈھیر پر آباد نہیں تھی۔''

''عہدِ جدید انسانی تہذیب وتقدیر خطِ تنسیخ پھیرنے پر مصر ہے۔''

اب ذرا ان کی طویل غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

حقیقت ہے کہ اک دھوکہ ہے دنیا
جو ہے بس حسن انداز ہ ہے دنیا
نیا ہے ہر گھڑی نظارہ اس کا
کسی محبوب کا شیوہ ہے دنیا
کھلا یہ راز اس کے نغمے سن کر
کوئی بے انت سناتا ہے دنیا
بتاتی ہے یہ اس کی بے ثباتی
کسی کا مضطرب جلوہ ہے دنیا
ہٹاؤں کسی طرح میں دھیان اس سے
مکمل ایک اندیشہ ہے دنیا

اشعار اور بھی ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور مختلف جہاتی پیش کی گئی ہے کہ دنیا کہیں جلوہ ہے تو کہیں اندیشہ، کہیں افسانوی چشم تو کہیں خواب کا ٹکڑا۔ میرے نزدیک سب سے مشکل شاعری وہ ہوتی ہے جو وقت اور زندگی پر ہوتی ہے اس لیے کہ یہ دونوں ہی چھلاوہ ہوتے ہیں ان کا کوئی مستقر نہیں کوئی محور نہیں لیکن جن کی تاریخ وتہذیب پر نظر ہوتی ہے جو انسانی اور زمینی حقیقتوں پر نظر رکھتے ہیں وہ ان کی صدیوں کی بوالعجبی کو نگاہِ خلق میں جذب کر کے اس کی مبہم صداقتوں اور مشکوک حقیقتوں کو بہرحال اپنے اپنے مشاہدات وتجربات کے حوالے سے پیش کرنے کی تخلیق جسارت کرتے ہیں اور شاعری میں اپنے قاری کو ہم نظر اور ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کبھی یہ کوشش بھی محض شاعرانہ نوعیت کی ہوتی ہے تو پھر شاعر کہہ اٹھتا ہے

سب امیدیں عبث ہیں اے دل اس سے
یہ دنیا میری جاں دنیا ہے دنیا

ایسے بامعنی مشاہدات وتجربات سے پر مبین مرزا کی شاعری روایتی لب ولہجہ سے نکل کر آج کی دنیا میں آجاتی ہے تو آج کی جدید شاعری کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ان کی شاعری کا ایک اور نیا رنگ ہے جہاں غزل نرم ونازک صنف سخن بھی زندگی کی بھٹی میں تپ کر ایک نئی ہیئت، صوت اختیار کر لیتی ہے تبھی صحرا انصاری جیسا اندیدہ دانشوار یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ''ہر تخلیق انسان کی زندگی، خواب اور حقیقت کے درمیان بسر ہوتی ہے۔ الفاظ کے جتنے بھی تصویری پیکر بنتے ہیں وہ اسی تناظر میں ابھرتے ہیں۔''

ذیل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں تلخ تجربات اور بالیدہ نظریات کتنی آسانی سے غزل کے مصرعوں میں ڈھل گئے ہیں

اک عمارت کہ اٹھانی ہے سرِ دشت وجود
سو غمِ جاں تجھے بنیاد کیا ہے ہم نے
میں کب سے محوِ دنیا تھا مگر اک دن مجھے کو د پر
کیا ہے منکشف جس نے وہ آئینہ مرا دل ہے
خواہش دنیا تو کیا یہ دھیان تک آتا نہیں
دل نے ایسے محوِ کارِ جستجو رکھا ہمیں
جو آگیا سرِ دنیا تو پھر سہولت سے
وہ چھوڑ کر یہ تماشا کہیں نہیں جاتا

دیکھیے اس میں دنیا کے کتنے روپ آئے ہیں لیکن بیشتر جگہوں پر بس دنیا کو سمجھنے کی خواہش ہے اسے حاصل کرنے کی نہیں۔ اس کے تئیں بیگانگی۔ بے نیازی مبین مرزا کے تصورِ دنیا کو ہی نہیں تصورِ شعر وشاعری کو بھی پیش کرتی چلتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس حد تک کہ وہ یہ تک کہہ اٹھتے ہیں

یہی ہے اور یہی ہوگی تو زندگی پر خاک
جیے جو اس کی طلب میں اس آدمی پر خاک

اس زعم میں وہ روشنی اور آ گہی پرخاک ڈالتے چلے جاتے ہیں۔پوری غزل میں خاک صرف ردیف نہیں بلکہ غزل کا کلیدی لفظ بن کر ابھرتا ہے جو بڑے سلیقہ سے معنوی ابصار میں جذب ہوتا چلتا ہے۔انسانی۔انسان کے کمالات، دنیا کے تغیرات، حادثات سے پرمبین مرزا کی شاعری ذات اور کائنات قدیم وجدید کا سنگم بن جاتی ہے اس پرمرزا کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ اظہارِ حقیقت میں شعری لطافت اور جمالیاتی کیفیت پرآنچ نہیں آنے دیتے۔انھیں معلوم ہے کہ کون سی بات کس طرح افسانہ میں کہی جاسکتی ہے۔اداریوں میں لکھی جاتی ہے اور پھر کس طرح وہ سلیقہ وہنرمندی سے شعری پیکر میں ڈھلتی ہے۔ان کی بعض اشعار تو ایسے ہیں جن میں کلاسکیت بڑے سلیقہ سے جدیدیت میں سما گئی ہے اور ایک نئی تابانی پا گئی ہے۔اس تابانی میں قدردانی ہے اور جذبۂ انسانی بھی اور ایسے اشعار بھی۔

زیست ہر آن تغیر کا نشاں ہے لیکن
یار کل تک جو رہے آج رکھیں اغیار نہ کو
ان بدلتے ہوئے رنگوں کے تماشے پہ نہ جا
یہ جو دنیا ہے تو اپنا اسے معیار نہ کر

اشعار اور بھی ہیں۔ابقاد بھی اور جن پرگفتگو کی ضرورت ہے۔ان کی نظمیں بھی خصوصی توجہ کی مستحق ہیں ان پر بھی باتیں ہونی چاہئے۔یہ کوئی باقاعدہ تنقیدی مضمون نہیں محض ایک تبصرہ ہے یا سرسری جائزہ اور یہ کہنے میں مجھے ذرا بھی تکلف نہیں کہ اس کے سرسری مطالعہ نے مجھے سرشار کیا ہے۔مالا مال کیا ہے۔عرصہ کے بعد ایک ایسا شعری مجموعہ ہاتھ آیا ہ جس کی تابانی میں صرف قصہ کہانی نہیں ہے یا پھر محض اپنی ذات کا رونا نہیں یا معشوق کے روایتی گلے شکوے بھی نہیں بلکہ زندگی کی۔وقت کی ایسی تصویریں ہیں جو آج کے انسان کی تقدیر بنی ہوئی ہیں۔آج کے حالات کی تعبیر وتفسیر۔۔۔لیکن ان میں بھی اچھی بات یہ ہے جو کم از کم مجھ جیسے ترقی پسند قاری کو متوجہ کرتی ہے وہ یہ کہ ان سب دگرگوں حالات کے باوجود مبین مرزا نے قلم۔ذہن، وژن، شاعر اور شاعری کی جس حرمت، عزت اور عظمت کا ذکر کیا ہے اور اپنے یقین اور اعتماد کو بحال رکھا ہے وہ آج کی شاعری میں خال خال بلکہ شاید مکمل طور پرنظر نہیں آتا جس سے ان کی شاعری میں ایک مخصوص نشاطیہ وطربیہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے جس سے ان کی شاعری میں فطری اور فکری دونوں سطح پرسنجیدگی اور بالیدگی آ گئی ہے۔ہم شاعری اس لیے نہیں پڑھتے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہوا ہوائی ہوجائیں۔لحاتی لطف وانبساط میں ڈوب جائیں۔جو لوگ شعروداب سے دلجوئی اور تفریح کی توقع رکھتے ہیں وہ ادب کی عظمت وحرمت سے واقف نہیں۔مجھ جیسا قاری اس لیے پڑھتا ہے کہ وہ مجھے موت کی کتاب کم لگے اور زندگی کی دستاویز زیادہ۔۔۔تاریخی وتہذیبی دستاویز زیادہ جس سے آنکھیں روشن ہوں زندگی کی رمق اور للک پیدا ہو۔جینے کی آرزو اس میں وصال کی آرزو بھی ہو تو کوئی حرج نہیں کہ آرزوئے وصال بھی آگے بڑھ کر ارزوئے جمال بنتی ہے۔ہمارے تصورات آلودہ ہونے کے بجائے پاکیزہ ہوتے ہیں ایک مبہم تصور کو روشن حقیقت میں بدلتے ہیں۔اسی لیے شاعری کو بھی ایک مقدس عمل کہا جاتا ہے۔عبادت گذار نہ عمل۔سچی عبادت بھی روحانی اور وجدانی کیفیت سے دوچار کرتی ہے حقیقی شاعری بھی اس منزل تک لے جاتی ہے جہاں شاعر، شاعر نہ ہوکر فرشتہ بن جاتا ہے یا پیغمبر۔یہ فرشتگی اور پیغمبری علم سے کم شعور واحساس اور جذبہ سے زیادہ پیدا ہوتی ہے۔علم پرانے ہوسکتے ہیں لیکن جذبہ پرانا نہیں ہوتا۔اسی لیے غالب اور شیکسپئر آج بھی زندہ ہیں۔

مبین مرزا کی شاعری کا مطالعہ ہیں ایک رجائی احساس سے دوچار کرتا ہے اور شعر وادب کے بڑے مقصد کو چھوتا ہے۔نفسیات، جمالیات، شعریات بے تعلق نہیں ہوا کرتے۔یہ بھی انسانی جذبات وتصورات کی شاخیں ہیں جن کی جڑیں اسی دنیا کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں بس شاعری رکھ رچاؤ، لطافت اور نزاکت چاہتی ہے، غزلیہ شاعری بطور خاص۔۔۔اس لیے کہ جمالیاتی شعور موضوع کو گہرائی وبلندی عطا کرتا ہے۔مبین مرزا اس ہنر سے واقف ہیں اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں مقامیت اور آفاقیت بھی۔نزاکت بھی اور لطافت بھی۔توانائی ہے اور تابانی بھی۔۔۔میں ان کو اس خوبصورت شعری مجموعہ کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

''لمبی جماہی''

ایک مولوی صاحب کسی گاؤں پہنچے۔انھیں تبلیغ کا شوق تھا۔ جمعہ کا خطبہ پورے ایک ہفتے میں تیار کیا لیکن قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ جمعہ کے دن صرف ایک نمازی مسجد میں آیا۔مولوی صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔انھوں نے اس شخص سے کہا کہ تم واحد آدمی ہو جو مسجد آئے ہو۔بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وہ شخص بولا۔مولوی صاحب! میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔مجھے اتنا پتا ہے کہ میں اگر بھینسوں کے لیے چارہ لے کر پہنچوں گا اور وہاں صرف ایک بھینس ہو تو میں اسے چارہ ضرور دوں گا۔مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔انھوں نے بھی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔اس کے بعد انھوں نے دیہاتی سے پوچھا کہ بتاؤ خطبہ کیسا تھا؟ دیہاتی نے لمبی جماہی لی اور کہا۔مولوی صاحب! میں ایک دیہاتی آدمی ہوں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر میرے سامنے ایک بھینس ہوگی تو میں ساری بھینسوں کا چارہ اس کے آگے نہیں ڈالوں گا۔

(نصاب تعلیم مرتب کرنے والوں کے نام)

مبین مرزا کی شاعری

ڈاکٹر تحسین فراقی
(لاہور)

مبین مرزا صاحب سے میری پرانی یاد اللہ ہے، اُس وقت سے، جب وہ انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے اور میں ایم اے او کالج میں اردو کا لیکچرر تھا۔ تب یارِ عزیز مرحوم سراج منیر کا دفتر وہ سنگم تھا جہاں ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں جو جلد ہی گہری دوستی میں ڈھل گئیں۔ اس دوستی پر اب کم و بیش تیس برس ہونے کو آئے۔ تب سے اب تک ہماری گفتگو بہت سے موضوعات پر رہی، لیکن اس کا بنیادی حوالہ ادب رہا ہے۔ ادب اور مسائل و متعلقاتِ ادب سے ان کی گہری وابستگی، زندگی کے عام رویوں میں صاف گوئی، بے ساختگی اور بے تکلفی اور مثبت اقدارِ حیات سے ان کا لگاؤ ان کے اور میرے درمیان نقطۂ اشتراک ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ادب کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے بلکہ متعدد اکابرینِ ادب مثلاً مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ، محبّ عارفی، حمید نسیم، جمیل الدین عالی اور ڈاکٹر جمیل جالبی وغیرہ سے بھی انھیں بہت لگاؤ رہا اور اپنی شخصیت کی تعمیر میں انھوں نے ان تازہ کار و یادگار افراد سے کسبِ فیض کیا۔

ادبی و علمی حلقوں میں مبین مرزا کی زیادہ تر پہچان ان کی عمدہ افسانہ نگاری، مجلّہ ''مکالمہ'' کی ادارت اور اُس گہرے تنقیدی شعور کے باعث ہے جس کے مظہر ان کے مقالات ہیں۔ گو کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی شاعری بعض رسائل و جرائد میں بھی اپنی جھلک دکھاتی رہی ہے، مگر میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ حضرت، شاعری کا ایک پورا مجموعہ بغل میں دبائے بیٹھے ہیں۔ چند ہفتے پہلے انھوں نے اپنی غزلوں، نظموں کا مسودہ مجھے اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ میں اسے پڑھ کر مشورہ دوں کہ مجموعہ چھپنا چاہیے کہ نہیں۔ اگر میرا جواب اثبات میں ہو اور اگر پسند آئے تو اس پر کچھ لکھوں بھی۔ میں اسے پڑھتا گیا اور میری حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شخصیت کی طرفہ بے ساختگی ان کی شاعری میں بھی گھلی ملی نظر آتی ہے اور یہ بے ساختگی اور برجستگی قاری کے دل پر پائیدار نقش ثبت کرتی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان کی شاعری پر ایک مختصر تاثر لکھ کر انھیں بھجوا دوں مگر مسئلہ یہ کہ اُن کی دوستی اور محبت اختصار اور قناعت پر کیوں کر آمادہ ہو۔ مبین مرزا مغل بچے ہیں۔ ان کے پاس تلوار کٹار نہ سہی وہ میرزا منشی تو بہرحال ہے جس کی تاب لانا آسان نہیں۔ اسی خوف سے میں نے اب اپنے عمومی تاثر کو ذیل کی مختصر تحریر میں ڈھال دیا ہے۔

عموماً دیکھا جا رہا ہے کہ ہمارے عہد کے اردو شاعروں نے خود کو بہت محدود کر لیا ہے۔ کچھ صرف غزل یا زیادہ تر غزل کہتے ہیں، کچھ نظم میں مہارت دکھاتے ہیں۔ بعض نے صرف نثری نظم کو شاعری کی معراج سمجھ رکھا ہے۔ کم شعرا ایسے ہیں جو غزل اور نظم دونوں میں یکساں میلان و مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ مبین مرزا کی غزل اور نظم دونوں میں تاثر آفرینی کا یکساں جوہر موجود ہے۔ ان کی غزلیں بھی دامنِ دل کھینچتی ہیں اور نظمیں بھی، اور ان دونوں پر ان کی شائستہ شخصیت اور وسعتِ مطالعہ کی چھاپ جا بجا نظر آتی ہے۔ پہلے ان کی غزل کا اجمالی تجزیہ کرتے ہیں۔

مبین مرزا کی غزل پر نگاہ ڈالیں تو چند حاوی موضوعات فوراً قاری کی توجہ جذب کر لیتے ہیں، مثلاً عشق کی کرشمہ کاریاں، اس کے پیدا کردہ محسوسات اور انسانی باطن میں ان کے اتار چڑھاؤ کے نقشے اور مد و جزر کی کیفیتیں، کہیں کہیں مبارز طلبی کا رنگ، جذب و جنون کی تحلیل اور کیفیاتِ فراق کا حزن آمیز بیان۔ بات یہ ہے کہ شاعری غزل کی ہو یا نظم کی اس میں رنگ آمیزی، کسک، کشش اور دل کے تاروں کو چھونے اور ان میں ارتعاش پیدا کرنے کی ادا تو ''گسستن'' سے پیدا ہوتی ہے، ''پیوستن'' سے نہیں۔ ''پیوستن'' تو ایک لمحۂ گزراں ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اس لمحۂ گزراں کا تجربہ بھی ضروری ہے کیوں کہ اسی کے بطن سے یادوں کے ایک نا مختتم سلسلے کا صدور ہوتا ہے جو شاعری کے نو بہ نو پیرایوں میں ڈھلتا ہے اور ''بشنو از نَے چوں حکایت می کند'' کی حشر سامانی ارزانی کرتا ہے۔ مبین مرزا کے ہاں بھی ''گسستن'' اور ''سوختنِ ناتمام'' کے مظاہر جا بجا نظر آتے ہیں۔ ''ہاڑ جلے جیوں لاکڑی، کیس جلیں جیوں گھاس'' کا یہ منظر نامہ بہر نوع اداس کر دینے والا ہے۔ اس تجربۂ محبت میں بڑی سپردگی اور والہیت ہے۔ طالب کی تمام تر نیاز مندی اور فیضانِ عشق کی کیمیا گری کے نتیجے میں مٹی سے سونا بن جانے اور مطلوب کے ناز و تمکنت اور غرورِ عزّ و جاہ کا کسی قدر نشاط آمیز بیان جو بہرحال اس کا خاصہ ہوتا ہے، ان اوراق میں کئی جگہ نظر آتا ہے۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ کیجیے:

میں ایک دشت تھا خود اپنے ہی سراب میں گم
بس ایک موج نے دریا بنا دیا ہے مجھے

خاک کے ڈھیر کو جذبوں کی حرارت بخشی
اور جذبوں کو بنایا زر و گوہر تو نے

وہ زخم کیا کہ جسے وقت مندمل کر دے
وہ شمع کیا جو فروزاں کفِ ہوا پہ نہیں

تری محفل میسر ہے نہ دل لگتا ہے دُنیا میں
سنا ہے تیرے دیوانے بڑی مشکل میں آئے ہیں

پھر اُس کے بعد کسی شے میں دل لگا ہی نہیں
بس ایک بات پر ایسے اداس ہو گئے ہم

یاداوراس کی کسک مبین مرزا کی غزلوں میں اکثر تو زیریں رووں کی صورت میں اور کہیں کہیں مٹتی بنتی موجوں کی مانند ظہور وخفا کا منظرنامہ تشکیل دیتی نظر آتی ہے۔ان غزلوں میں دوپہر کی دھوپ نہیں جھٹپٹے کا ملگجا پن ہے اور اہلِ دل جانتے ہیں کہ شام کا یہ ملگجا پن- دن اور رات کا یہ برزخ- کتنا اداس کر دینے والا ہوتا ہے۔ یہ شاعری تیز بارش کا جھالا نہیں، شبنم کی لطافت اور بے زبانی سے عبارت ہے، ایسی بے زبانی جو کچھ نہیں کہتی مگر بہت کچھ کہتی ہے۔ یہ حواس کو گرفت میں لیتی ہے اور دل میں میٹھے درد کا جادو جگاتی ہے۔ ان اشعار کا پیرایۂ اظہار دیکھیے:

وہی اک مسئلہ جس کی خلش سے جاں بہ لب ہوں میں
اِدھر کہہ بھی نہیں سکتا ، اُدھر کہہ بھی نہیں سکتا

اک عمر کی کاوش سے ہم نے تو یہی جانا
سب کام سنورتے ہیں اس دل کے سنورنے سے

قرینے زیست میں تھے سوختہ جانی سے پہلے
بہت آباد تھے ہم خانہ ویرانی سے پہلے
اِنھی خوش ذوق لوگوں میں بہت چرچے رہے ہیں
ہماری خوش لباسی کے بھی عریانی سے پہلے
جو یارِ مہرباں نالاں ہے اب میری طلب سے
اُسے شکوہ تھا میری تنگ دامانی سے پہلے
بڑا زیرک بہت دانا تجھے ہم جانتے تھے
دلِ ناداں تری اس حشر سامانی سے پہلے
یہاں اک باغ تھا جس میں چہکتے تھے پرندے
یہیں اس قریۂ جاں کی بیابانی سے پہلے

الگ جب اُس نے کیا تھا حصارِ جاں سے مجھے
نجات دی تھی غمِ عمرِ جاوداں سے مجھے
جو اضطراب پھراتا ہے مجھ کو دشت و دمن
ملا ہی دے گا وہ اک روز کارواں سے مجھے
میں خاکِ عشق ہوں میرا نصیب دربدری
گلہ زمیں سے نہ شکوہ ہے آسماں سے مجھے
مرے مزاج سے واقف تھا وہ جبھی اُس نے
نہال ایسے کیا رنجِ بے نشاں سے مجھے

مبین مرزا نے اپنا تمام سروکار دل اور کاروبار دل سے رکھا ہے اور ان کا ایقان ہے کہ سب کام سنورتے ہیں اس دل کے سنورنے سے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ شاعری محض درد و گداز کی سرمایہ دار ہوتی تو بہر طور یک رُخی ہوتی۔ مبین مرزا نے اس کے دوش بدوش حوصلہ مندی اور ایک سنبھلا ہوا پُرتمکین رویہ بھی اپنایا ہے جس کے مظاہر اس مجموعے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ غزلیں زیادہ تر سادہ اور سہل پیرایۂ بیان لیے ہوئے ہیں۔ مبین مرزا نے مرکبات کا استعمال کیا ہے مگر کم۔ رمزی اور ایمائی پیرائے کی حامل ان غزلوں کو کہیں کہیں گہری حقیقت پسندی، رواقی طرزِ فکر اور نفسیاتی نکتوں نے بھی تاثیر بخشی ہے۔ بعض مطلع بڑے برجستہ اور بے ساختہ ہیں اور ان سے غزل کی تاثیر بڑھ گئی ہے۔

بکھرتی رُت سے نئی آرزو ہر آن ملی
یہ زندگی ہمیں دُکھ سکھ کے درمیان ملی

یہی ہے اور یہی ہوگی تو زندگی پر خاک
مرے جو اس کی طلب میں اس آدمی پر خاک

دل دیا اور دل سے گرمِ آرزو رّکھا ہمیں
رکھنے والے نے ہمیشہ سرخ رُو رّکھا ہمیں

اک خواب کو آنکھیں رہن رکھیں، اک شوق میں دل ویران کیا
جینے کی تمنا میں ہم نے مرنے کا سبھی سامان کیا

کبھی خدا کبھی خود سے سوال کرتے ہوئے
میں جی رہا ہوں مسلسل ملال کرتے ہوئے

اک نقش بگڑنے سے اک حد کے گزرنے سے
کیا کیا نہیں مرجاتا اک خواب کے مرنے سے

زیرِ نظر مجموعے کی غزلیں تو اثر آفریں ہیں ہی، اس میں شامل نظمیں بھی اپنی ایک تاثیر رکھتی ہیں۔ چونکہ مبین مرزا کلاسیکی اور معاصر شاعری کا عمدہ ادراک رکھتے ہیں اور انگریزی ادب کا بھی بالاستیعاب اور گہرا مطالعہ ہے، لہٰذا جذب و اثر پذیری کے شواہد ان کی شاعری میں لودیتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جہاں غزل میں میر، فیض، ناصر کاظمی اور یاس یگانہ کے اثرات قبول کیے ہیں وہیں نظم میں میرا جی، راشد اور مجید امجد سے فیض اندوز ہوئے ہیں مگر یہ فیض اندوزی خواہ غزل میں ہو خواہ نظم میں تقلیدی نہیں، تنقیدی، تخلیقی اور معروضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا رنگِ سخن ان کا اپنا ہے۔

ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظمیں بھی سیدھے سبھاؤ کی پر اثر نظمیں ہیں جن پر ابہام کی پرتو افشانی کہیں نہیں ملے گی۔ غزلوں کی طرح درد و گداز کی تہ دار موجیں ان کی نظموں میں بھی ورق در ورق دیکھی جاسکتی ہیں۔

انسانی تقدیر اور اس کی بوالعجبیوں، واہمہ شکنیوں، محبت کی کیمیا گری، اخلاص اور رواداری کے کوچ کر جانے کے المیے، پستی سے بلندی کی طرف وجودِ انسانی کے سفر، مشرق میں ظہور کرنے والی تہذیبوں کے تنوع اور قوسِ قزح کی سی رنگ آفرینی نیز تحت الشعوری یادوں سے ان نظموں کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔ غزلوں کی طرح مبین مرزا کی ان نظموں میں بھی آندھیوں کا رجز اور برق و رعد کی حشر سامانی نہیں، نسیمِ صبح کی آہستہ خرامی ہے جو سرگوشیاں کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور دل کے ٹیکتے زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ مبین مرزا اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کائنات کا گہرا سناٹا دراصل ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور انقلاباتِ زمانہ کی اوّلیں نمود سرزمینِ دل پر ہوتی ہے۔ بعض نظموں مثلاً ''رسید'' میں لپٹی اداسی یاس کی حدوں کو چھونے پر بھی ''روشنی، میری جاں روشنی'' کی طلبگار رہتی ہے:

اب تو دامن میں اپنے نہ ارض و سما اور نہ دُنیا و دیں
وہ خوشی اب نہ تیرے قریں اور نہ میرے قریں
ولولے جن سے تھی زیست خندہ جبیں
کھو گئے راستے میں کہیں
جان و تن کا یقیں
اب نہیں

روشنی
میری جاں....
روشنی!

اور یہی وہ مثبت رویہ ہے جو ناکامیوں سے کام لینے کا محرک بنتا ہے اور نظم ''ابھی کچھ خواب زندہ ہیں'' میں بھی اپنی مسحورکن جھلکی دکھاتا ہے:

مجھے وہ منزلیں آواز دیتی ہیں
جہاں ہر سُو اُمیدوں کا اُجالا ہے
جہاں پیڑوں میں جھولے پڑتے ہیں
[جن پر تمنا جھولتی ہے]
اور پرندے چہچہاتے ہیں
جہاں بارش برسنے سے
دلوں کا میل دُھلتا ہے
جہاں تازہ ہوا کا لمس
جوشِ زیست کو مہمیز کرتا ہے
جہاں پر خوف سے آزاد ہو کر
زندگی جاتے ہوئے موسم کے ریشم سے
پرندوں کے لبوں پر گیت لکھتی ہے
پھر ان گیتوں کو سن کر مسکراتی ہے

اس مجموعے کی جو نظمیں خاص طور پر دامنِ دل کو چھوتی اور مشامِ جاں کو معطر کرتی ہیں وہ ہیں: ''سمندر گیت گاتا ہے''، ''لمحوں کے اسرار''، ''الٹا زینہ''، ''دشتِ امکاں میں''، ''موسم بدلتا ہے''، ''خود کلامی''، ''وہ دل حیراں نہیں ہوتے''، ''رسید''، ''اُداس لمحوں کی ایک نظم''، ''زندگی کی خاطر ہم''، ''بے اماں''، ''ابھی کچھ خواب زندہ ہیں'' اور ''سمے ساگر کی کتھا''۔ ہاں اس فہرست میں ''وداع'' نامی نظم کو بھی شامل کرنا چاہیے جو دیر تک سماعتوں میں رس گھولتی ہے۔ ''وہ دل حیراں نہیں ہوتے'' ایک اور اعتبار سے بھی متاثر کن ہے۔ اس نظم سے یہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مبین مرزا کیسی عمدہ اور ناقابلِ فراموش تمثالیں بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔

مجھے تم مسکرا کے اِذنِ رخصت دو
کہ یہ خندہ لبی میری مسافت کو مقدس دُکھ بنائے گی
یہ ہستی دائروں کا اک سفر ہے
دائرے بھی ایسے جن کے محوروں کا بھید ہرگز کھل نہیں پاتا
مگر اس سے کسے انکار ہے یہ راہ چلنے والے پھر اک بار ملتے ہیں
یونہی اک موڑ پر کچھ خواب بُنتے ——
اور کچھ ان دیکھی شکستہ خواہشوں کا دُکھ اٹھانے کے لیے
دشتِ وفا میں پھر ملیں گے ہم
ملیں گے اور آپس میں سفر کے دکھ کہیں گے ہم!
(وداع)

مرے اندر ہزاروں میل تک گہرا دُھواں پھیلا ہوا ہے
مناظر جو کبھی روشن تھے، اب وہ بجھتے جاتے ہیں
نجانے کتنی موجیں چشمِ طوفاں میں اُمڈتی ہیں
مجھے معلوم ہے لیکن...
کہ صدیوں کے دُکھوں پر جو نہ چھلکے ہوں
وہ آنسو اس قدر ارزاں نہیں ہوتے ——
جو سرد و گرمِ دُنیا دیکھ بیٹھے ہوں...
ہوا کا رُخ بدلنے پر وہ دل حیراں نہیں ہوتے!

مناسب طوالت اور اختصار کی حامل یہ نظمیں بات کو سلیقے، رمزی پیرائے اور سہل اسلوب میں ابلاغ کرنے کی مہارت کی مظہر ہیں اور ان نظموں نیز غزلوں کا خالق ایک ایسے شاعر کی صورت میں ظہور کرتا ہے جس کی شخصیت خوب منجھی اور کڑھی ہوئی ہے، جو انسانوں اور تہذیبوں کا ہمدرد ناظر ہے، جو عشق کو ایک آرزو انگیز اور انقلاب خیز قوت سمجھتا ہے اور شکستِ خواب کے باوجود خواب دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے کہ خواب ہی دراصل سچے ادب و تمدن کے نقش گر اور نقش بند ہوتے ہیں اور تاریخ کو ایک نئی کروٹ اور نئے فلسفے کا آہنگ دیتے ہیں۔

مبین مرزا صاحب بطور شخصیت

ڈاکٹر عنبریں حسیب عنبر
(کراچی)

مبین مرزا صاحب عہدِ حاضر کی نہایت اہم ادبی شخصیت ہیں۔ دیکھا جائے تو مروّجہ ستائش کے رویے میں کسی بھی شخصیت کے بارے میں لکھنا بے حد آسان ہے، کیوں کہ کرنا صرف یہ ہوتا ہے کہ تمام تر بہترین شخصی اوصاف جمع کر کے ایک لبادہ تیار کیا جائے اور اسے اُس شخصیت کو اوڑھا دیا جائے، اللہ اللہ خیر سلا، مگر یہ طرزِ ستائش، بلکہ پرستش اُس شخصیت اور ادب دونوں کے ساتھ زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔ کیوں کہ ایک طرف تو ایسی کوئی بھی خاکہ نگاری دراصل شخصیت سازی کی بے تکی کوشش ہوتی ہے جس میں اپنی پسند اور خواہشات کے تمام رنگ بھر کے اصل شخصیت کو بے رنگ و بے معنی کر دیا جاتا ہے، بلکہ بعض خاکہ نگار تو عموماً شخصیات کو فرشتہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور اپنی دانست میں اس شخصیت کی قامت میں اضافہ کر رہے ہوتے ہیں، مگر اس کاوش میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ:

ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

دوسری طرف ایسی تحریروں سے وہ بصیرت بھی حاصل نہیں کی جا سکتی جس کا موقع غیر رسمی اور براہِ راست شخصی مطالعہ فراہم کرتا ہے۔ لٰہذا گہری معنویت سے عاری ایسی شخصیت پرستانہ تحریریں ادبی مطالعے میں معاون ثابت نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس وہ خاکے جو گہرے مشاہدے اور تجزیے کی صلاحیت کے حسن سے مزین ہوں، وہ شخصیت کو ایسے نکھار کے سامنے لاتے ہیں کہ ایک جیتا جاگتا حقیقی انسان ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ ایسے خاکے ہمارے ادب کا اہم حصہ ہیں اور توجہ سے پڑھے جاتے ہیں، بلکہ ایسے ہی عمدہ خاکوں کا ایک اہم انتخاب خود مبین مرزا صاحب نے تین جلدوں میں مرتب بھی کیا ہے۔

مبین مرزا صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ دنیاے ادب انھیں افسانہ نگار، شاعر، نقاد، مدیر ''مکالمہ''، مترجم اور اشاعتی ادارے اکادمی بازیافت کے روحِ رواں کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اس لیے ان کی شخصیت اور تحریر کو متعدد زاویوں سے دیکھا جانا چاہیے جو کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں۔ ویسے بھی ہمارا ماننا ہے کہ سوچنے، لکھنے والی حساس شخصیت جو معاشرے کی شکست و ریخت اور انسانی رویوں سے براہِ راست متاثر ہوتی ہو وہ ساری زندگی بننے کے ارتقائی مراحل سے گزرتی رہتی ہے۔ پھر لکھنے والے کا اپنا احساس، اپنی شخصیت، تعلق کی نوعیت، حالات اور ملاقات کے وقت دونوں کی عمریں بہت سے گوشے وا کرتے ہیں۔ لٰہذا یہ مضمون لکھتے ہوئے ہمیں خاکہ نگاری کا کوئی دعویٰ نہیں، ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اُسے موضوعِ گفتگو شخصیت کے حوالے سے ہمارا ذاتی تأثر اور رائے سمجھا نا چاہیے۔

مبین مرزا صاحب کا نام ہم نے اپنے والدِ محترم پروفیسر سحر انصاری صاحب کے دوست کی حیثیت سے گاہے گاہے سنا تو ضرور تھا، مگر وہ ان احباب میں شامل نہیں تھے جنھیں ہم اکثر و بیشتر والد صاحب کے ملاقاتیوں میں اپنے گھر پہ پاتے تھے۔ لٰہذا ہم نے مرزا صاحب کو غالباً ۲۰۰۳ء میں پہلی بار آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کی ایک ادبی تقریب میں دیکھا جس کی نظامت نہایت عمدگی سے انیق احمد صاحب کر رہے تھے۔ اُن کے بھرپور اور مخصوص جوشیلے تعارف کے بعد مرزا صاحب ڈائس پر تشریف لائے۔ مناسب قد و قامت، خوش لباس، سلیقے سے بنائے ہوئے کھچڑی بال اور آنکھوں پر عینک والی اس شخصیت کی دو خصوصیات بڑی نمایاں تھیں، ایک تو چہرے پر ذہانت کی چمک، متانت اور بردباری اور دوسرے مضمون سے عیاں ہوتی اُن کی علمیت۔ تقریب کے اختتام پر اُن کے گرد جمع ہونے والا ہجوم بتا رہا تھا کہ ہماری طرح بیشتر لوگوں کو اُن کا مضمون بے حد پسند آیا ہے۔ ہم چوں کہ اپنی نشست سے اٹھ کر سیدھے گھر روانہ ہو گئے اس لیے اس دن تو ان سے ملاقات نہیں ہوئی، لیکن بعد میں اپنے شوہر کے ہمراہ مرزا صاحب کے دفتر میں ایک آدھ ملاقات اور گاہے گاہے ادبی تقریبات اور والد صاحب کے دوسرے شعری مجموعے ''خدا سے بات کرتے ہیں'' کی اکادمی بازیافت سے اشاعت کے دوران گفتگو ہوتی رہی۔ اس گفتگو سے مرزا صاحب کی علمیت اور شائستگی کا اظہار ہمارے پہلے تأثر کو جلا بخشتا رہا۔

تاہم مرزا صاحب کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ہمیں ۲۰۱۰ء میں تب ملا جب شہر میں ہواے ناپرساں چل رہی تھی۔ وقت تو کچھ کٹھن ہی معلوم ہو رہا تھا اُس وقت، لیکن اس کا تعمیری پہلو یہ تھا کہ ہمیں وہ فرصت نصیب ہوئی کہ ہم اپنے دیرینہ خوابوں کی تکمیل پر توجہ دے سکیں۔ لٰہذا ایک طرف ہم پی ایچ ڈی کی تحقیق میں مزید وقت صرف کرنے لگے تو دوسری طرف ادبی پرچہ نکالنے کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے شوہر سیّد حسیب احمد سے مشاورت کا موقع مل گیا، مگر ہمیں ادبی پرچے کی اشاعت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لٰہذا حسیب صاحب نے مرزا صاحب سے بات کی اور یہ طے پایا کہ پرچے کی تالیف، تدوین اور ترتیب وغیرہ کا سارا کام ہم کریں گے اور اشاعت مرزا صاحب کے ادارے سے ہوگی۔ یوں مرزا صاحب ہمارے مشکل وقت کے ایسے ساتھی بن گئے جن سے دوستی اور رہنمائی دونوں کے مواقع حاصل ہوئے۔

یوں تو مرزا صاحب پہلے بھی گفتگو کے دوران ہماری بے پناہ ادبی سرگرمیوں سے بیزار محسوس ہوتے تھے، بلکہ ایک بار تو ڈپٹ کر کہا بھی، ''کیا ساری ذہانت اور قابلیت تقریبات میں صرف کرنے کا ارادہ ہے یا کوئی سنجیدہ کام بھی کرو گی؟''

''کیا مطلب؟'' ہم نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

''مطلب یہ کہ فون اس لیے کیا ہے کہ ہم اکادمی ادبیات کا خاص نمبر مرتب کر رہے ہیں۔ اُس میں قیامِ پاکستان کے بعد آنے والی نئی نسل کی شاعری پر مضمون تم لکھ رہی ہو۔''

ابھی ہم اس عزت افزائی پر پوری طرح پھولے بھی نہ سمائے تھے کہ آواز آئی، ''کب تک لکھ لو گی؟''

''مہینہ تو لگے گا۔'' ہم نے اپنے مزاج کو مدِنظر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمھاری؟ کوئی مہینہ نہیں، دس دن ہیں تمھارے پاس۔ کچھ دن گھر بیٹھو اور لکھ کر بھیجو، خدا حافظ۔''

''یہ اچھی زبردستی ہے۔'' ہم منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئے تھے۔ اب مرزا صاحب تھے اور بار بار کی یاددہانی سو، مرتے کیا نہ کرتے کہ مصداق دس دن میں مضمون لکھ کر بھیج بھی دیا تھا، مگر اب جب مرزا صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو احساس ہوا کہ وہ تو صرف ٹریلر تھا، ''یعنی اصل اور پوری پکچر ابھی باقی ہے میرے دوست۔''

جی ہاں فعالیت مرزا صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ نہ خود فارغ بیٹھتے ہیں اور نہ کسی کارآمد یا قابل شخص کو بیٹھنے دیتے ہیں، اور اس سلسلے میں ڈانٹ ڈپٹ، دھونس دھمکی کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ خوش گوار اچھنبے کی بات تھی، کیوں کہ مرزا صاحب کو گفتگو کا ملکہ حاصل ہے اور وہ خود بھی جانتے ہیں کہ فکری تسلسل اور بھاری بھرکم مدلل گفتگو سے محفل لوٹنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ یہ صلاحیت اور اس کا ادراک انسان کو گفتار کا غازی بنا کر رکھ دیتا ہے اور انسان اپنی آواز سے محبت کرنے لگتا ہے، مگر یہاں مرزا صاحب اس حقیقت سے بخوبی آشنا نظر آتے ہیں کہ بولے ہوئے الفاظ سے زیادہ عمر لکھے ہوئے کی ہوتی ہے، لہٰذا انھوں نے اردو ادب میں قابلِ رشک رفتار سے کام کیا ہے۔ دو افسانوں کے مجموعے ''خوف کے آسمان تلے'' (۲۰۰۴ء) اور ''زمینیں اور زمانے'' (۲۰۱۵ء)، شاعری کا ایک مجموعہ ''تابانی'' (۲۰۱۵ء)، تنقید کی مسلسل کتاب ''سعادت حسن منٹو''، اس کے ساتھ ''مکالمہ'' جیسے مؤقر ادبی جریدے کے تقریباً اکتالیس شمارے، بہت سے وقیع تنقیدی مضامین، کتابوں کی compilation، کئی اہم ادبی جرائد میں معاون مدیر کے فرائض اور اہم انتخاب کی دستاویز میں معاونت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انھوں نے گفتگو کے نشے میں خود کو رائگاں ہونے نہیں دیا ہے۔ تاہم ہمیں تعجب یہ ہوتا ہے کہ موصوف صبح سے شام تک دفتری اور کاروباری معاملات نمٹاتے ہیں، مہمان نوازی اور ٹیلی فون پر دوستوں کی دل داری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ تھکے ہارے گھر روانہ ہوتے ہیں اور پھر گھر میں بھی ماشاءاللہ جوائنٹ فیملی سسٹم کی رونق میں حصہ لیتے ہیں، مگر اگلے دن مضمون لکھے بیٹھے ہوتے ہیں، اور ستم یہ کہ سوال ہوتا ہے کہ ''ہاں بھئی! تمھارا مضمون کہاں ہے؟''

کئی بار جی میں آیا کہ کہہ ڈالیں، ہم انسان ہیں، جن نہیں۔ مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہے کہ مرزا صاحب جن بن کر دکھانا بھی جانتے ہیں اور اس میں خطرہ یہ ہے کہ اگلے دن ہماری فاتحہ ہو رہی ہوگی۔

جو مضمون مرزا صاحب لکھ چکے وہ تو پہلا ڈرافٹ ہے۔ اب مضمون کی کمپوزنگ اور قطع برید کا آغاز ہوتا ہے اور یہ علم ہوتا ہے کہ موصوف ہر کام میں خلوص، ایمان داری اور محنت کے قائل ہیں۔ اسی لیے پورے اعتماد سے یہ کہتے ہیں کہ:

میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اپنی دانست میں احساسِ ذمے داری کے ساتھ لکھا ہے اور لکھتے ہوئے کسی خیال تو کجا محض لفظ سے بھی دست بردار ہونا مجھے گوارا نہیں۔

(''خوف کے آسمان تلے''، ابتدائیہ، ص۱۱)

اتنا ہی نہیں، بلکہ جہاں انھیں محسوس ہو کہ ان کے احباب میں بھی کسی نے لکھتے ہوئے تساہل سے کام لیا ہے تو نہایت تہذیب اور شائستگی سے اصرار کرتے ہیں کہ ''صاحب ہمارا خیال ہے اسے مزید بڑھا لیجیے۔'' اس معاملے میں وہ ہمیں نیاز فتح پوری کے ہم خیال نظر آتے ہیں کہ ''دوست کی تحریر کو دشمن کی نظر سے پڑھیے۔'' ہمارے معاملے میں رعایت کا لفظ اُن کے پاس نہیں ہے اور اس کا جواز ہماری عمر ہے۔ اس لیے احکام جاری ہوتے ہیں:

یہ مضمون تین دن میں لکھ لاؤ۔

پرچے کا سارا میٹر فلاں تاریخ تک دے دو بس۔

پروف ریڈنگ دو دن میں ہو جائے ورنہ ہم دوسرا کام لگوا دیں گے۔

جواباً اگر ہم کاہلی یا مجبوری سے کوئی عذر تراشیں تو کوئی ٹکا سا جواب ملتا ہے، ''ارے تم تو جوان آدمی ہو، اس عمر میں تھکن کا تو احساس بھی نہیں ہوتا۔ کام کرو کام۔'' اور ہم منہ بسورے حکم کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں، کیوں کہ ایسے موقعے پر اس احتجاج میں ہمارا ساتھ دینے کے بجائے والدِ محترم اور شوہرِ نامدار یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں کہ ''جب وقت پر کام کر لوگی تو سب سے زیادہ خوشی بھی تم کو ہی ہوگی۔''

مبین مرزا صاحب پختہ شخصیت اور مثبت سوچ کے مالک ہیں، لہٰذا جرأت اور اثباتِ ذات کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ اپنی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی واقف ہیں اور دونوں سے تعمیری کام لینا جانتے ہیں اور یہی وصف کسی شخصیت کو شخص سے ممتاز کرتا ہے۔ مرزا صاحب بنیادی طور پر مہذب آدمی ہیں، بات ناگوار گزرے تو شدید غصے کا اظہار کرتے ہیں، بات اچھی لگے تو کھلے دل سے خوش ہوتے ہیں، مگر ہر اظہار اس قدر تہذیب کے دائرے میں ہوتا ہے کہ ہمیں تو کبھی کبھی افسانوی ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے تہذیب کے نام پر تکلّفات کی اونچی فصیلیں اپنے گرد کھڑی کر رکھی ہیں کہ کوئی اُن کے اندر نہ جھانک لے۔ کبھی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت کے ساتھ جھانکنے والی شرارت گواہی دیتی ہے کہ ایک نہایت شوخ و شریر شخصیت کو تدبر کی دبیز چادر کے تلے چھپا دیا گیا ہے جس تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ وہ گہری شخصیت کے حامل انسان ہیں، زندگی کے تمام فیصلے دماغ سے کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اگر دنیا میں کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ مرزا صاحب کو سو فی صد جانتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ انھیں ایک فی صد بھی نہیں جانتا۔ مرزا صاحب اپنے احباب کے احوال سے حتیٰ الامکان واقف رہنا پسند کرتے ہیں اور ہمہ وقت تعاون اور دل جوئی کو تیار بھی رہتے ہیں، مگر اپنے تمام معاملات میں حد درجہ راز داری برتتے ہیں جو ان کے قریبی دوستوں کو یقیناً بسا اوقات ناگوار گزرتی ہے۔ سحر صاحب نے ایک آدھ بار ہنس کر کہا بھی، ''صاحب آپ اپنے نام میں ایک ایم کا اضافہ کر لیجیے، یعنی Mysterious Mubeen Mirza۔'' جواباً مرزا صاحب خوش دلی سے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا، مگر مجال ہے کہ اطوار میں کوئی رتی بھر بھی فرق آیا ہو۔

مرزا صاحب کی زندگی ملتان، لاہور اور کراچی میں بسر ہوئی ہے۔ اس زندگی کے سفر میں مرزا صاحب کی جن شخصیات سے قربت اور دوستانہ مراسم رہے اُن میں اس عہد کے تقریباً تمام بڑے اور اہم نام شامل ہیں، جیسے احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، ڈاکٹر عرش صدیقی، ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر عاصی کرنالی، بیدل حیدری، سراج منیر، مشتاق احمد یوسفی، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، جمال پانی پتی، سحر انصاری، سلیم یزدانی، سیّد مظہر جمیل، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، قمر جمیل اور ضمیر علی بدایونی، شمیم حنفی، باقر نقوی، زبیر رضوی، رضی مجتبیٰ، رؤف پاریکھ اور صبیح رحمانی۔ ان تمام شخصیات نے مبین مرزا صاحب کی ذہانت، تخلیقی صلاحیتوں اور علمیت کا برملا اعتراف بارہا کیا ہے۔ دوسری طرف مرزا صاحب بھی کشادہ دلی سے اپنے دوستوں کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھیں تمام تر خوبیوں اور شخصی کم زوریوں کے ساتھ نہ صرف قبول کرتے ہیں، بلکہ پورا own بھی کرتے ہیں۔ دوست دشمن بنانے کا جواز مرزا صاحب کے پاس بڑا دل چسپ ہے، ''بھئی دوست کوئی بھی ہوسکتا ہے، جو اچھا لگ جائے یا جس کی شخصیت پسند آجائے، مگر دشمن ہونے کے لیے تو کوئی ایسا ہو جسے کہا جاسکے کہ ہاں یہ دشمن ہوسکتا ہے، دشمن بننے کے لیے تو qualify کرنا پڑے گا۔''

اور مزے کی بات یہ ہے کہ اب تک کوئی ایسا آیا ہی نہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ مرزا صاحب کا مقابلہ بس اپنے آپ سے ہے کہ بہتر سے بہتر کام کیا جائے، دوسروں سے مقابلہ تو دور کی بات ہے، کہیں کوئی بہتر کام نظر آجائے تو کھلے دل اور نہایت اعلیٰ ظرفی سے اُس کے غیاب میں بھی اُس کی تعریف کریں گے اور خوش ہوں گے، مگر مرزا صاحب کو کسی سرسری کام سے خوش نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے معاملے میں بھی جب محنت سے کوئی تحریر مکمل ہوجائے تو خوشی اور اطمینان اُن کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ مرزا صاحب کا اپنے کام سے خلوص اور محنت ہی ہے جسے سراہتے ہوئے شبنم شکیل صاحبہ نے ایک بار ہم سے کہا تھا (جب ہم نے اپنا پہلا شعری مجموعہ شبنم صاحبہ کے فلیپ کے ساتھ انھیں پیش کیا تھا)، ''یہ تمھاری پہلی کتاب ہے، پذیرائی سے رک مت جانا۔ یہاں اکثر لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی آگے نہیں بڑھتے اور جو اس پذیرائی کو منزل نہیں بناتے وہ بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ شاعری میں اس کی سب سے بڑی مثال زہرا نگاہ ہیں۔ زہرا کی شاعری میں بہت واضح ارتقا نظر آتا ہے، آج وہ جیسی نظمیں لکھ رہی ہیں، اس کے لیے انھیں داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ اُس نے بہت محنت کی ہے اور یہی حال مبین مرزا کا ہے۔ اس نے اپنے مطالعے اور تحریر دونوں پر بہت محنت کی ہے۔ اس کے ہاں بھی بہت نمایاں ہے ارتقا، حالاں کہ نثر میں تو یہ بہت مشکل کام ہے، مگر اس نے کر دکھایا۔ یہ سیکھنے والی بات ہے۔''

ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم نے مرزا صاحب سے بہت سی باتیں سیکھی ہیں اور ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنی تمام تر بد دماغی کے باوجود ہماری نالائقیوں، ہٹ دھرمیوں اور نازک مزاجی کو حتی الامکان برداشت کرنے کی ہمیشہ کوشش ضرور کی ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ادب، احترام، تعلق، دوستی، استادی شاگردی سب اپنی جگہ، مگر جہاں ہم اپنی دانست میں درست ہوں، وہاں ڈٹ جانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایسے میں مرزا صاحب کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم اُن کے بڑے ہونے کا احترام کریں (کیوں کہ وہ بھی اپنے بڑوں کے ساتھ یہی کرتے ہیں اور اس احترام میں درست ہوتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں)، مگر ہماری جہالت ہمیں یہ دلیل دے کر بحث پر اکساتی ہے کہ یہ کون سا ہمارے چھوٹے ہونے کا لحاظ کر رہے ہیں، لہٰذا بحث طویل ہوجاتی ہے۔ اگر اختتام میں مرزا صاحب کو غصہ آچکا ہو تو کھری کھری سنا دیتے ہیں، ورنہ ہنس دیتے ہیں، بلکہ قہقہہ لگاتے ہیں اور یہ کہہ کر بات ختم کردیتے ہیں، ''یار! تم بہت بے ہودہ آدمی ہو۔'' تاہم ہارنا مرزا صاحب نے نہیں سیکھا۔ لگتا ہے کہ مغل خون یہ تہیہ کر چکا ہے کہ جتنی جنگیں ہارنی تھیں ہار چکے، اب اور نہیں۔ لہٰذا ہمیں یگانہ کا یہ شعر بار بار اُن کی نذر کرنا پڑتا ہے کہ:

چت بھی میری ہے ، پٹ بھی میری ہے
میں نہیں ہار ماننے والا

دورانِ گفتگو مرزا صاحب اگر کوئی ایسا واقعہ یا فقرہ دُہرائیں جو کسی اور کا ہو تو اُس شخصیت کا حوالہ ضرور دیتے ہیں اور ہمیں اُن کی یہ دیانت داری ہمیشہ اُن کے احترام پر مائل رکھتی ہے، ورنہ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر اوقات سینئر بن جانے والے اپنے بعد آنے والوں کو ایسے واقعات اور فقرے اپنے نام سے سنا سنا کر مرعوب کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں، یا ہم عصروں پر دھاک جماتے ہیں، مگر مرزا صاحب کسی اور کا کریڈٹ اپنے نام کرنے کے قائل ہی نہیں۔ جب جہاں انھیں محسوس ہو کہ یہاں اُن کی ضرورت ہے فوراً فرد یا ادارے کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں نہ انھیں عہدہ چاہیے، نہ نام اور نہ کوئی ستائش، مگر کام وہ صرف اپنے مزاج، اپنے طریقے اور اپنی شرائط پر کرتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن نظر نہ آئے تو خاموشی سے خود کو اس معاملے سے الگ کر لیتے ہیں۔

اپنی شرطوں پہ زندگی گزارنے کی جرأت مرزا صاحب کی پختہ شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ بڑی سے بڑی بات ہو یا چھوٹی سے چھوٹی، مرزا صاحب اپنی شرائط سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگر بظاہر آپ کو یہ محسوس ہو کہ آپ اپنی شرائط پر انھیں آمادہ کرنے میں کامیاب ہوچکے ہیں تو خوش نہ ہوں، کیوں کہ یہ آپ کی معصومیت تو ہوسکتی ہے حقیقت نہیں۔ کتاب کی اشاعت کا معاملہ ہو یا تعلقات کا، کھانے پینے کی بات ہو یا پہننے اوڑھنے کی، مرزا صاحب کا اصول یہی رہتا ہے۔ کاروبار کم ملے یا ''مکالمہ'' تاخیر سے آئے، مگر چھاپیں گے وہی جس پر مزاج آمادہ ہو۔ سب سے دل چسپ صورتِ حال کھانے کی ہے۔ مرزا صاحب کھانے دوسروں کو کھلانے کے شوقین ہیں، مگر صرف انھیں جن کے لیے وہ خود آمادہ ہوں۔ مہمان نوازی کے آداب سے بخوبی واقف ہیں، مگر اس سارے عمل میں آفس بوائے یا ویٹر کے لیے آزمائش ہوتی ہے کہ وہ مرزا صاحب کے سارے احکامات یاد رکھے، جو عموماً کچھ یوں ہوتے ہیں:

''بیٹا بھاگ کے جاؤ اور جلدی سے کباب لے آؤ۔ کباب گرم ہونے چاہییں بالکل اور ساتھ لال آٹے کی خوب سکی ہوئی گرم روٹی لے آنا۔

کباب کی ایک ایک پلیٹ الگ بندھوانا۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی جگہ ساری پلیٹیں بندھوالاؤ۔ بیٹا، سلاد کے لیے ککڑی کھیرا بھی لے آؤ، مگر کل جیسا مت اٹھالانا۔ دیکھ کر ہرے رنگ کا ہو اور بیج چھوٹے ہوں۔ پکا ہوا کھیرا نہ ہو۔ کل کھیرا کہاں سے لائے تھے؟'' جواب سن کر کہیں گے، ''نہیں بیٹا، روڈ کراس کر کے فلاں مسجد کے سامنے ایک ٹھیلے والا کھڑا ہوگا، اس کے پاس کھیرا، ککڑی کٹے رکھے ہوں گے وہاں سے لانا، اور میٹھے میں ربڑی لے آؤ۔ کہاں سے لاؤ گے؟ فلاں دکان سے لانا، کہیں اور سے مت اُٹھالانا۔ بس بیٹا اب جاؤ اور فوراً آنے کی کرو۔''

''بیٹا! چائے لے آؤ۔ چائے گرم اور تیز ہو۔ ہماری چائے میں دودھ کم ڈالنا اور چینی الگ سے ساتھ لے آنا، ہم خود ڈال لیں گے۔''

کھانا چنتے وقت بھی ہدایات جاری رہیں گی:

''بیٹا پہلے مہمانوں کے سامنے رکھو۔ سحر صاحب کو پہلے پلیٹ دو۔''

''پانی لے آؤ۔ سنو! گلاس اچھی طرح دھو کر لانا۔''

اب کھانا آغاز ہوا، اگر کھانا ان کی منشا کے مطابق ہوا تو لانے والے کو داد ضرور دیتے ہیں، ورنہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ لگتا ہے یہ نوجوان کہیں اور سے اٹھالایا ہے۔

کھانا کتنا ہی لذیذ کیوں نہ ہو، جہاں طبیعت سیر ہوئی، ہاتھ روک لیتے ہیں۔ اب مجال ہے کہ کوئی ایک نوالہ بھی کھلا کر دکھا دے۔ تاہم کھانا کھاتے ہوئے بھی دوسروں کا خیال مسلسل کرتے ہیں کہ کوئی تکلف سے کام نہ لیں۔ ٹھنڈا کھانا، روٹی یا چائے اُن کے حلق سے بالکل نہیں اُترتے۔ یہاں تک کہ مہمان کو بھی منع کر دیتے ہیں کہ ''چھوڑ دیں، گرم منگواتے ہیں۔''

جہاں تک ہمارا مشاہدہ ہے مرزا صاحب کا مزاج اور اصول گھر میں بھی وہی ہیں جو باہر ہیں۔ شریکِ حیات نہایت سلجھی ہوئی باوقار خاتون ہیں اور بچے مہذب ہیں۔ بہن، بھائی بھی والدین کی عمدہ تربیت کی گواہی دیتے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے مرزا صاحب کو گھر میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اپنی والدہ، بیوی، بہن، بھائی، بچوں اور اُن سے وابستہ لوگوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کے اہلِ خانہ بھی اُن سے بے حد محبت کرتے ہیں، اور احترام بھی۔ اس محبت کا ایک عملی مظاہرہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور روح تک سرشار ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ مرزا صاحب کو اُن کی فیملی کے ساتھ خریداری کے لیے بازار جانا تھا۔ طے یہ ہوا ہوگا کہ وہ سب آفس آجائیں گے، وہیں کھانا کھا کر پھر بازار جائیں گے۔ لہٰذا بیگم اور بچے آفس آ گئے۔ ہم اپنے پرچے کی تیاری میں مصروف تھے، لہٰذا ہمیں بھی کھانے میں شریک کر لیا گیا۔ مرزا صاحب کی ہدایات کے عین مطابق کھانا آ گیا، مگر اس اثنا میں وہ ہاتھ دھونے چلے گئے (یہ مرزا صاحب کا معمول ہے کہ کھانا ہاتھ دھو کر کھاتے ہیں)۔ اب ہم سب نے کھانا پلیٹوں میں نکال لیا۔ مرزا صاحب آئے اپنی مخصوص کرسی کی پشت پر ڈالے تولیے سے ہاتھ پونچھے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں بیٹی نے کچھ بتانا شروع کیا۔ ہم منتظر تھے کہ یہ لوگ کھانا شروع کریں تو ہم بھی کھائیں، کہ ہمارے ہاں سب کے ساتھ کھانے کی روایت زندہ ہے، اچانک مرزا صاحب کی بیگم کی آواز آئی، ''بہت بھوک لگ رہی ہے، بس اب جلدی سے کھانا شروع کرا دیجیے۔'' ہم نے حیران ہو کر اُن کی طرف دیکھا تو بہت محبت، لاڈ اور احترام کے ساتھ بولیں، ''ہم سب لوگ کھانا ایک ساتھ شروع کرتے ہیں، پہلا نوالہ سب ایک ساتھ منہ میں رکھتے ہیں۔'' سبحان اللہ! سبحان اللہ! آج بھی جب یہ منظر یاد آتا ہے تو مارے خوشی کے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، کیوں کہ ہوتا یہ ہے کہ ہم سب اقدار کے بدلنے، ٹوٹنے اور ختم ہوتے جانے پر ملول نظر آتے ہیں۔ اس پر بار بار بات بھی کرتے ہیں، مگر غور کریں تو اکثریت اقدار میں یقین اور ان کے اثبات کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔ وہ ان اقدار کو اپنے تجربے میں سمونے اور ان کا اثبات کرنے کی صلاحیت کھو رہے ہیں۔ ایسے میں یہ احساس دل خوش کر دینے والا ہے کہ کہیں کہیں اب بھی قدر شناسی زندہ ہے۔ مرزا صاحب اقدار کے پابند انسان ہیں اور اس پر افسوس بھی کرتے ہیں کہ ''میں نے اور میرے، ہم جلیسوں نے تہذیب و معاشرت کے جس منطقے کی نرم گرم صبحوں میں شعور کی آنکھ کھولی تھی، عمر کی ڈھلتی ہوئی اس شام میں آج ہم اِسے وحشت و دہشت کے دھوئیں سے کس طرح حبس دم ہوتے دیکھتے ہیں۔''

(''تابانی''، ''وقت کے چاک پر''، صفحہ ۱۸)۔

مگر اس تہذیب و معاشرت کو اپنے تئیں زندہ رکھنے کی مرزا صاحب کی کاوشیں لائقِ تحسین ہیں۔

لائقِ تحسین تو مرزا صاحب اپنے نظم و ضبط کے لیے بھی ہیں۔ دفتر ہو یا کوئی تقریب، وقت کی پابندی کرتے ہیں، اور اگر کسی سے وقت طے ہوا اور دوسرا وقت کی پابندی نہ کرے تو حسبِ مراتب بے چینی، کوفت، ناگواری یا غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ منظم اتنے ہیں کہ شاعر، ادیب برادری پر لاپروائی اور بے ترتیبی کے لگنے والے تمام الزامات کے جواب میں انھیں بطور مثال پیش کر کے کل برادری کی عزت بچائی جاسکتی ہے۔ چیزیں ہوں یا کتابیں، نہایت ترتیب سے رکھتے ہیں اور وہ ترتیب یاد بھی رکھتے ہیں۔ برسوں گزر گئے ہوں، مگر حافظے میں رہتا ہے کہ کون سی چیز، کاغذ یا کتاب کہاں ہے اور واقعی مطلوبہ چیز وہیں سے مل بھی جاتی ہے۔ مرزا صاحب حساب کتاب کے پکے ہیں اور حساب کتاب کے معاملے میں صرف اپنے حافظے کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ دوسرے کی تسلی کے لیے ایک رجسٹر میں سب کچھ درج ہوتا ہے۔ آپ جب، جتنے عرصے بعد چاہیں اُس پرانے رجسٹر کی مدد سے تمام حساب کتاب آپ کے سامنے رکھ دیں گے اور ہر اُس بدمزگی سے آپ کو بچا لیں گے جو عموماً حساب کتاب میں ہو جایا کرتی ہے۔

لکھنے کو تو ہم نے مرزا صاحب کے بارے میں اپنی ذاتی رائے اور تأثرات لکھ دیے ہیں اور اس کا بھی امکان ہے کہ ہماری کچھ باتیں مرزا صاحب کو ناگوار بھی گزریں گی، مگر ہمیں یقین ہے کہ وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دیں گے کہ ''یار! تم بہت بے ہودہ آدمی ہو۔'' سچ پوچھیے تو یہ عافیت کسی شخصیت کے بارے میں لکھنے پر ہی رہتی ہے، شخص کے بارے میں لکھنے پر یہ سہولت ممکن نہیں ہوتی۔

مبین مرزا اُس وقت افسانے کے دیار میں داخل ہوئے جب علامتی اور تجریدی افسانے کا تجرباتی دور اُردو افسانے کو تکنیک اور اسلوب کے سلسلے میں متعدد نئے پہلوؤں اور زاویوں سے روشناس کرانے کے بعد منظرِ عام سے غائب ہو چکا تھا اور بیانیہ افسانہ دوبارہ فکشن کے اسٹیج پر جدید روپ میں نمودار ہو چکا تھا۔ علامتی و تجریدی افسانے نے روایتی افسانے سے منسلک جزئیات نگاری، سراپا نگاری، منظر اور جذبات نگاری جیسے کئی گوشوں کو حدِ اعتدال میں لانے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح خود کلامی، دروں بینی اور تفکر کے تاگے بھی افسانے کی بنت میں شامل ہوئے۔ ۱۹۸۰ء اور بعد کی دہائیوں کے افسانہ نویسوں نے ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

مبین مرزا کے افسانوں کے مجموعے ''زمینیں اور زمانے'' میں شامل افسانے عموماً طویل ہیں، مگر اُن کا مطالعہ کرتے ہوئے قطعاً اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی ایک بڑی وجہ افسانہ نویس کا سادہ و سلیس اور رواں دواں اسلوبِ بیاں ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتا ہے۔ طویل افسانے میں قاری کی دل چسپی کو ٹھہرائے رکھنا اور اُس کی توجہ اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ دینا ایک فن ہے اور مبین مرزا اس فن میں تاک ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے کے متعدد افسانوں میں یادِ ماضی کو مرکزیت حاصل ہے۔ یہ ناسٹلجیائی کیفیت افسانوں کے بعض کرداروں کی گہرائی میں اتر کر انھیں کچوکے لگاتی ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ ''بھولی بسری عورت'' کا مرکزی کردار طارق کم و بیش چھبیس سال کے بعد امریکا سے ملتان واپس آتا ہے اور اُسے یہاں کا تبدیل شدہ ماحول ایک ذہنی جھٹکے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ دوسری طرف لالی بھی اس کے ماضی کا حصہ ہے۔ وہ اُسے دوبارہ دیکھنے کا متمنی بھی ہے، مگر اس ڈر سے سہما ہوا ہے کہ ایک زمانہ گزر جانے کے بعد اب وہ نجانے کیسی لگتی ہوگی۔ زن، زر اور زمین کا حصول ایک سدا بہار بیانیہ ہے جو ہر دور میں موجود رہتا ہے۔ اس کی صورتیں، ہیئتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، مگر اس کی مثلث برقرار رہتی ہے۔ زمین خود ایک طرح سے زَن کا اعلامیہ ہے اور زمین کی زرخیزی زر ہی کی ایک جداگانہ شکل ہے، یعنی عورت کا وجود زمین بھی ہے اور زَر بھی جو تخلیقیت سے عبارت ہے۔ یوں لالی کے وجود کی معنویت دوچند ہو جاتی ہے۔ ملتان آ کر طارق کو صاف محسوس ہوتا ہے کہ شہر کی گلیاں، محلے بازار، عمارتیں، سڑکیں اور مجموعی ماحول تبدیلی کی زد پر آ چکا ہے، مگر ماضی کے دور کی جھلکیاں، نقوش اور نشانیاں بھی جا بہ جا بکھری پڑی ہیں۔ چنانچہ اُن جگہوں اور مقامات کا ذکر کرتے ہوئے خوشی اور تأسف کے جذبات باہم ملے جلے نظر آتے ہیں۔ طارق اپنی زمینوں کے معاملات نبٹانے آیا ہے اور امریکا واپس جانے سے قبل لالی کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے۔ شاید یہ جاننے کے لیے کہ نوجوانی کے دنوں کی چاہت کی کوئی لہر یا رمق اُن دونوں کے بھیتر میں موجود رہی ہے یا نہیں، مگر لالی کو دیکھ کر ماضی کے تصورات پر استوار شیش محل چکنا چور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ وقت کے منہ زور تھپیڑوں اور تباہ کاریوں کا نقشہ ابھر آتا ہے۔ لالی اس کے ماضی کا ایک دل فریب سپنا تھی جو ایک بھولی بسری یاد بن چکی تھی۔ تاہم اُس سے وابستہ یادوں کی گلابی پتیاں طارق کے دامن سے چمٹی ہوئی تھیں۔ وقت کا پنڈولم زندگی کے مسلسل تحرک کا اشاریہ ہے اور اس سفر کے دوران میں خیالات، ماحول، وجود تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تبدیلیاں آہستہ آہستہ رونما ہوتی تھیں، مگر اب ایک عشرے کے بعد ہی حیران کن تبدیلیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ ''تبدیلی کا آ جانا'' اس افسانے کا بنیادی خیال ہے۔

افسانہ ''اجنبی موسم'' کا منور بھی امریکا کا رہائشی ہے جو شادی کے بندھن کو بوجھ سمجھتا ہے۔ مغربی معاشرے میں رہنے کے باعث وہ ''اپی کیورین'' طرزِ زیست یعنی کھاؤ پیو، موج اڑاؤ کے فلسفے کا پیروکار بن چکا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے اُس دور کو فراموش کر بیٹھا ہے جب اُسے کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر قدم پر تگ و دو کرنا پڑی تھی، مگر کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ مثبت قدروں کو اپنانے کے بجائے آوارگی اور ہوس گیری کی زندگی کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ فرخندہ جو ایک زمانے میں اس کی کولیگ رہی تھی، جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ منور امریکا سے واپس آ گیا ہے تو اس کے اندر خوابیدہ چاہت کی راکھ ہولے ہولے دوبارہ سلگنے لگتی ہے۔ اب بھولا بسرا تعلق بیداری کے جذبے سے ہم کنار ہونے لگتا ہے، مگر جب منور سے اس کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو اُس کے رویے اور باتوں سے اُس کے دل کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔ مشرقی روایات سے منور کا انقطاع فرخندہ کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوتا ہے اور وہ اُسے ہوٹل کے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر گھر واپس چلی جاتی ہے۔ اس افسانے میں مغربی معاشرت کی بے راہ روی اور وہاں کے فیملی سسٹم کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کرنے کی کاوش کی گئی ہے جس سے وہاں کے معاشرتی ڈھانچے کو زک پہنچ رہا ہے۔

''دُہری سزا'' ایک عمدہ افسانہ ہے۔ اس کا موضوع حساس نوعیت کا حامل ہے۔ احتشام اپنی دوسری چچی افشاں سے پہلے نفرت کرتا ہے اور پھر اُس کے اچھے رویے کے سبب اس کے قریب آنے لگتا ہے۔ عمر کے اعتبار سے افشاں اُس سے عمر میں زیادہ بڑی نہیں تھی، لہٰذا اُن دونوں کے درمیان بے تکلفی کا پیدا ہو جانا فطری عمل تھا۔ اس کے چاچا جی نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے افشاں سے عقد کر لیا تھا، مگر وہ پھر بھی اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ احتشام کی اپنی دوسری چچی سے بے تکلفی بتدریج چاہت کا روپ دھارنے لگتی ہے، مگر اُن کے درمیان ابھی کوئی غیر اخلاقی تعلق نظر نہیں آتا، مگر ایک شام چاچا جی نے جب

اُن دونوں کو کوٹھی کے باغیچے میں ایک دوسرے کے گلے میں بازو حمائل کیے ہوئے دیکھ لیا تو ایک دم زندگی کا پانسہ پلٹ گیا۔ احتشام کو ہاسٹل بھجوا دیا جاتا ہے۔ بعد میں وہ طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یو کے روانہ ہو جاتا ہے اور پھر وہیں مستقل طور پر قیام کر لیتا ہے۔ احتشام کے چاچا جی اس واقعے کے بعد بھی اس سے لاتعلق نہ رہے اور بالواسطہ طریق سے اس کی مالی اعانت کرتے رہے۔ وہ ان کے مرحوم بھائی کی اکلوتی اولاد تھا۔ احتشام کے جانے کے کچھ عرصے بعد چاچا جی نے اپنی دوسری زوجہ افشاں کو کچھ شرائط کا پابند رکھتے ہوئے طلاق دے دی۔ عدت پوری ہوتے ہی اُس کی شادی ہو جاتی ہے۔

ایک طویل مدت کے بعد جب چاچا جی کے بلانے پر احتشام برطانیہ سے وطن واپس آتا ہے تو اُسے پتا چلتا ہے کہ چاچا جی کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اُن کے پاس زندگی کی مہلت بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ وہ احتشام کو شادی کرنے کا کہتے ہیں، جب کہ وہ تجرد کی زندگی گزارنا چاہتا ہے، مگر اس کے چاچا جی اُسے مجبور کرتے ہیں کہ خاندان کی بقا کے لیے اس کا شادی کرنا ازبس ضروری ہے۔ علالت کے باوجود چاچا جی میں اپنی بات منوانے اور اس پر عمل کرانے کا ارادہ بڑا مضبوط دکھائی دیتا ہے۔ ایک مثبت نوٹ پر افسانے کا اختتام ہوتا ہے۔

افسانہ ”واٹس ایپ“ کا کردار شیخ مجیب عالم ایک کامیاب کاروباری آدمی ہے۔ وہ معاشرے میں ایک مقام اور مرتبے کا حامل ہے۔ عمر کے اعتبار سے وہ پچپن چھپن سال کا ہے۔ زندگی کے کئی رنگ روپ اور اتار چڑھاؤ دیکھ چکا ہے۔ ایک دن اچانک اس کے موبائل فون پر ایک اجنبی نمبر سے میسج آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پہلے تو وہ ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا، مگر بعد میں اس کے دل میں واٹس ایپ نمبر سے پیغام بازی کرنے والی ہستی کے بارے میں جاننے کی خواہش بیدار ہونے لگتی ہے جو اسے بے چین کیے رکھتی ہے۔ بالآخر جب میسج کرنے والی ہستی اُسے میسج کر کے بتاتی ہے کہ اس کا نام روبینہ ہے تو وہ اُسے پہچان لیتا ہے اور پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ روبینہ اُس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے جسے شیخ مجیب عالم بخوشی قبول کر لیتا ہے، مگر جب روبینہ بالواسطہ انداز میں اُسے آگاہ کرتی ہے کہ اُس کی نوعمر بیٹی پنکی کی شکل شیخ مجیب عالم سے ہو بہو ملتی ہے تو اَن کہی خود بخود آشکار ہو جاتی ہے۔ تاہم شیخ مجیب عالم یہ سوچ کر اندر سے دہل جاتا ہے کہ کہیں روبینہ، پنکی کا کارڈ کھیل کر اُسے بلیک میل کر کے اُس کی دولت ہتھیانا تو نہیں چاہتی۔ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا رہتا ہے۔ افسانے کے آخر میں روبینہ اُسے بتاتی ہے کہ وہ صرف اپنی نوعمر اکلوتی بیٹی کی ملاقات اُس سے کروانا چاہتی تھی، اس لیے کہ وہ فیملی سمیت ملک چھوڑ کر کینیڈا مستقل طور پر منتقل ہو رہی ہے۔ یہ جان کر شیخ مجیب عالم ہکا بکا رہ جاتا ہے، مگر وہ کون سی وجہ تھی کہ روبینہ نے شیخ مجیب عالم سے مراسم قائم کیے، پھر اُسے چھوڑ دیا اور اس تعلق کی یادگار — ایک بچی کو جنم دیا، جب کہ وہ خود شادی شدہ تھی اور خوش حال خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تمام پہلو افسانہ نویس نے پردۂ اخفا میں رکھے ہیں اور قاری کو اپنے تئیں سوچنے اور قیافہ لگانے کی دعوت دی ہے۔ یہ افسانہ ہمارے معاشرے کی تڑختی ہوئی اخلاقیات کی جانب بھرپور توجہ دلاتا ہے۔

افسانہ ”ٹھہرے ہوئے وقت میں“ کی صدف نام کی لڑکی خالد شیخ کو جو ایک نامی گرامی صحافی اور تجزیہ نگار ہے، اپنے دامِ الفت میں گرفتار کر لیتی ہے۔ اس لڑکی کا تعلق امریکا سے ہے۔ بعد میں وہ شیخ خالد کو بغیر کسی ڈر یا دباؤ کے خود ہی بتا دیتی ہے کہ اس کا اصلی نام پشمینہ ہے اور وہ ایک بین الاقوامی خفیہ ایجنسی کی ایجنٹ ہے جسے خالد شیخ کی جاسوسی کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ وہ اُسے اس بات سے بھی باخبر کرتی ہے کہ خفیہ ایجنسی کی نظروں میں خالد شیخ ایک ناپسندیدہ شخص ہے جو بعض طاقتوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہا ہے اور ایسے لوگوں کو عموماً راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ اُس کا باس، اُس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں، لہٰذا اُسے ہیڈ کوارٹر حاضر ہونے کے احکامات مل چکے ہیں اور اب وہ مزید یہاں قیام نہیں کر سکتی۔ پشمینہ کے چلے جانے کے چند ماہ بعد شیخ خالد پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہو جاتا ہے، مگر مرنے سے بچ جاتا ہے۔ یہ افسانہ بین الاقوامی خفیہ ایجنسیوں اور اُن کی گھناؤنی کارروائیوں پر سے پردہ اٹھانے کی ایک کوشش ہے جسے افسانے کے پیکر میں کامیابی سے ڈھالا گیا ہے۔

افسانہ ”یہی تو ہے زندگی“ کا نسوانی کردار نتاشہ بھی امریکی شہری ہے۔ اس کے شوہر کو مذہبی انتہا پسندوں یعنی طالبان وغیرہ کو مالی امداد مہیا کرنے کے الزام میں تفتیش کے لیے پابند کر دیا جاتا ہے جس کے باعث وہ اپنی بیوی نتاشہ کے ہمراہ اپنے چھوٹے سالے کی شادی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ نتاشہ سے شادی کرنے کے بعد بھی اُس کے دوسری عورتوں سے مراسم قائم رہتے ہیں۔ وہ امریکی کلچر کے مطابق زندگی گزار رہا تھا۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد اس میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ وہ سابقہ طرزِ زندگی ترک کر کے مذہبی راستہ اختیار کر لیتا ہے اور مزید شادیاں بھی کرتا ہے، مگر نتاشہ نے اُس کے ساتھ زندگی کا سفر جاری رکھا۔ وہ ایک نہایت ثابت قدم اور صبر کرنے والی خاتون کی حیثیت سے افسانے میں اُبھری ہے۔ وہ اپنے شوہر سے طلاق لینے کے بارے میں بھی سوچتی ضرور ہے، مگر صرف اُس صورت میں جب اس کے شوہر پر انتہا پسندوں کی مالی اعانت کرنے کا جرم واقعی ثابت ہو جائے۔ افسانے میں نتاشہ کی اپنے والد سے گہری جذباتی وابستگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ بہرکیف یہ افسانہ مغربی دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ طویل عرصے سے رکھے جانے والے غیر مساوی سلوک اور رویوں کے ردِعمل کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

”یخ رات کا ٹکڑا“ ایک اور کامیاب کاوش ہے جس میں ڈھکے چھپے انداز میں محبت کی کتھا سنائی گئی ہے۔ یہ افسانہ ایک خالص مشرقی گھریلو ماحول کا ترجمان ہے جس میں نوجوان لڑکی فہمی جس مرد کی محبت میں گرفتار ہے وہ نہ صرف عمر

میں اُس سے بیس سال بڑا ہے، بلکہ وہ رشتے میں اُس کی بڑی بہن کا جیٹھ بھی ہے، شادی شدہ اور عیال دار بھی ہے۔ ان دونوں کرداروں کے باہمی لگاؤ کو افسانہ نویس نے اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے جو اس افسانے میں پیش کردہ ماحول اور صورتِ حال کا تقاضا بھی تھا۔ افسانے میں فہمی پر کسی آسیب کا قبضہ دکھایا گیا ہے جسے عامل صاحب بھگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے زاویے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لڑکی جذباتی گھٹن کے باعث ہسٹریا کی مریضہ بن چکی ہے۔ وہ اپنی شادی شدہ ہمشیرہ کے ساتھ کافی دنوں سے رہ رہی ہے۔ آخر اُس کے والدین اُسے واپس بلا لیتے ہیں تو کچھ دنوں کے بعد اس کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے۔ یہ راز بعد میں کھلتا ہے کہ اُس لڑکی کے بھائیوں کو جب اپنی چھوٹی بہن کے اُس بے تکے معاشقے کی خبر ہوئی تو انھوں نے مکان کی دوسری منزل کی چھت کی کھڑکی سے اُس دھکا دے کر نیچے گرا دیا جس کے نتیجے میں اُس کی موت واقع ہو گئی، مگر اس سارے واقعے پر خاموشی کا دبیز پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ایک ایسا المیہ تھا جس نے دونوں خاندانوں کو غم زدہ کر دیا تھا۔ فہمی جس ہستی سے محبت کرتی تھی، وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سعودی عرب چلا جاتا ہے اور باقی زندگی وہیں گزار دیتا ہے۔

افسانہ ''پرچی اور داستان'' میں داستانی پیرایۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے جس میں ملک کے حاکم طبقے کے استحصالی رویوں، ناانصافیوں اور اخلاقی گراوٹ پر بھرپور طنز کی گئی ہے۔ افسانے میں داستان گو کا کردار، کچلے ہوئے، معتوب اور جبر کی چکی میں پسنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہم اسے علامتی طرزِ اظہار کے حامل افسانے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ داستان گو کی صاف گوئی اور بے باکی جب ڈراما ہال میں موجود حاکم طبقے کے نمائندہ افراد کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو اُسے اپنی زبان بند رکھنے کا حکم نامہ بار بار پرچی کی صورت میں بھجوایا جاتا ہے، مگر داستان گو پینترے بدل بدل کر حاکم طبقے کی خامیوں، مکاریوں اور ناانصافیوں کو پنڈال میں موجود لوگ کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ اس کی یہ ہٹ دھرمی، حاکم طبقے کو برافروختہ کر دیتی ہے اور زندگی کے اسٹیج پر ہونے والے اس ڈرامے کے ڈراپ سین میں ''داستان گو'' کو زبردستی اسٹیج سے ہٹا دیا جاتا ہے اور اسٹیج کی بتیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ بالالفاظِ دیگر سچ بولنے اور سچ دکھانے کے تار کاٹ کر بلیک آؤٹ کر دیا جاتا ہے۔

افسانہ ''امانت'' میں ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کی کیفیت ملتی ہے۔ افسانے کا واحد متکلم افسانہ ''بھولی بسری عورت'' کے طارق کی طرح ایک طویل عرصے کے بعد شہر ملتان میں آتا ہے اور یہاں اُسے بہت کچھ بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح طارق ماضی کی یادوں میں مبتلا تھا بعینہٖ ''امانت'' کا مزمل بھی ملتان کی پرانی گلیوں، بازاروں، کوچوں کی تصویر کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ موجود عمارتوں، گلیوں، بازاروں کی صورتِ حال سے ماضی کے ماحول کا موازنہ بھی کرتا ہے۔ افسانے میں مزمل اپنی والدہ کے بار بار اصرار پر خالہ (جو سگی نہیں ہے) کو ملنے اس کے گھر جاتا ہے، جس کی ایک امانت، مزمل کی والدہ کے پاس ایک طویل مدت سے پڑی ہے جسے وہ اب واپس لوٹانا چاہتی ہے، کیوں کہ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کی زندگی کی شام ہو چکی ہے اور سانسوں کا ٹمٹماتا ہوا دیا کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ مزمل بالآخر خالہ کا گھر تلاش کر لیتا ہے اور اپنی والدہ کی بھجوائی پوٹلی، خالہ کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے۔ اس پوٹلی میں کیا تھا اسے صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں خالہ کا کردار بظاہر ٹائپ معلوم ہوتا ہے، مگر افسانہ نویس نے اسے راؤنڈ کردار کی صورت عطا کرنے کی سعی کی ہے اور اس میں انھیں کامیابی بھی ملی ہے۔ مذکورہ افسانے میں روحانی تعلق کی کیفیت بھی موجود ہے۔ آنے والے واقعات کے بارے میں القا ہونے اور ٹیلی پیتھی کا عنصر بھی اس افسانے میں موجود ہے۔ دراصل رشتوں ناتوں کی ڈور کو تھامے رکھنا، اس سماج کا اٹوٹ انگ تھا جو اب قریب المرگ ہے۔ اُس زمانے میں لوگ باگ بغیر کسی ذاتی مفاد، حرص، طمع یا غرض کے ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ خوشیوں غموں میں شامل ہوتے تھے۔ افسانہ نویس نے بالواسطہ انداز میں اس سماجی تبدیلی کی نشان دہی کرتے ہوئے درحقیقت اُس مٹتی ہوئی روایت کو بچانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانوں کے زیادہ تر کردار شہری زندگی سے وابستہ ہیں۔ دوسری طرف متعدد افسانوں میں محبت کا المیہ یا حزنیہ انجام اجاگر ہوا ہے۔ پھر یہ کہ ان افسانوں کے اکثر کردار غیر ممالک میں جا کر آباد ہو چکے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو وہاں جانے کے لیے کمربستہ ہیں۔ یہ پہلو اس جانب واضح اشارہ کرتا ہے کہ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے اور خاص طور پر برِصغیر پاک و ہند کے لوگوں کا عرب اور مغرب کے ممالک میں جا بسنے کا رجحان افزوں تر ہو گیا ہے۔ گویا زمینی فاصلے سمٹ رہے ہیں، مگر ذہنوں اور رشتوں کے درمیان دوریاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ المختصر اس مجموعے میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زمینیں اور زمانے بدلتے رہتے ہیں، مگر انسانی رشتوں کی اساس ''محبت'' ہر زمین اور ہر زمانے میں برقرار رہے گی۔

''انجیلا مورکل''

جرمنی میں اساتذہ کو سب سے زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے، پچھلے دنوں ججز، ڈاکٹر اور انجینئرز نے احتجاج کیا اور اساتذہ کے برابر تنخواہ کا مطالبہ کر دیا۔

یہ خبر جرمنی کی چانسلر تک پہنچی تو جرمن چانسلر انجیلا مورکل نے بڑا ہی خوبصورت جواب دیا:

''میں آپ لوگوں کو ان کے برابر کیسے کر دوں جنھوں نے آپ کو اس مقام تک پہنچایا ہے''

افسانے چہروں اور آوازوں سے لکھے جاتے ہیں، لفظوں سے نہیں۔ چہرے زندہ لوگوں کا عکس ہوتے ہیں اور ان سے ہمارے اردگرد کی دنیا جاگ اٹھتی ہے اور آوازیں ان کے اندر سانس لیتی کائنات کی خبر دیتی ہیں اور اس طرح افسانہ نگار اپنے تخلیقی آئینے میں جیتی جاگتی زندگی کے نقوش سجاتا ہے۔ یہ کام مبین مرزا نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ دورِ جدید کے ایک ہنرمند افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زمین اور زمانے کی تمام نشانیوں، علامتوں اور صداقتوں کو لفظوں کے سانچے میں ڈھال کے پیش کیا ہے۔

مبین مرزا ۱۹۸۰ کی دہائی میں نمایاں ہونے والی افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے علامت و تجرید کے رجحانات کی دیوارِ چین پار کر کے زندگی کی نئی سچائیوں سے آراستہ قرینۂ حیات کی عکاسی کا بیڑا اٹھایا۔ ابتک 'خوف کے آسمان تلے' اور 'زمین اور زمانے' کے نام سے ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نئی دنیا کی سنگلاخ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ان کے تازہ مجموعے 'زمینین اور زمانے' کے افسانوں میں کچھ ایسی کہانیاں شامل ہیں جو ماضی کی گود سے ابھری ہیں مگر ان سے ان افسانوں کے کردار اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ گزرا زمانہ بھلائے جانے کے باوجود ان کے ذہن و دل پر دستک دیتا رہتا ہے۔

''یہ سب چہرے، مناظر اور آوازیں تو جیے گئے زمانوں کی گونج تھے، وہ زمانے جو دور بہت دور کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔'' افسانہ: بھولی بسری عورت۔ ماضی کے ایوانوں میں دھندلاتے مناظر ان کی کئی کہانیوں میں زندگی کی بعض بڑی حیرتناک اور پیچیدہ صورتیں دکھاتے ہیں اور انسانی جذبات اور احساسات کے بہت سے بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ یادوں کی ان پوٹلیوں میں کیا نہیں ہوتا، بھولی ہوئی محبتیں، پرانے خواب اور تازہ امنگیں۔ جہاں 'یخ رات کا ایک ٹکڑا' میں خالہ فہمی اپنی آسیبی کیفیت کے سہارے اپنی پراسرار محبت کا راز آشکار کرتی ہے وہاں 'امانت' کی اماں اور خالہ نجو اپنی دیرینہ رفاقت اور یگانگت کو خوابوں کے تعلق سے ظاہر کرتی ہیں اور وہ پراسرار پوٹلی جسے اماں خالہ انجو کی امانت سمجھتی ہیں محبتوں کے پرانے تعلق کی علامت بن کے سامنے آتی ہے۔

اس مجموعے کی ایک کہانی 'پرچی اور داستان' بالکل مختلف مزاج کی تحریر ہے، تیکنیک اور متن دونوں اعتبار سے۔ یہ جدید دور کے ایک داستان گو کی کہانی ہے جو بادشاہوں کی پرانی روائیتی کہانی کو اس طرح بدل کے سناتا ہے کہ وہ نئے دور کا قصہ لگنے لگتا ہے، عصری زندگی کی سچائیوں اور صعوبتوں کے ذکر سے بھرپور۔

''عزیزو! ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ، ایک تھا بادشاہ اور وہ بادشاہ بھی اپنی زندگی میں ویسا ہی پارسا، پاک طینت اور نیک نام تھا جیسے ہمارے تمھارے آج کے بادشاہ ہیں۔ ہاں عین مین ایسا ہی۔ اس کے فرمان بھی رعایا کی بھلائی اور آسودگی کا پیام لئے ہوئے آتے تھے، جیسے آج ہمارے بادشاہ کے فرمان آتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، اس زمانے میں بھی آج کے تھر کی طرح بعض علاقوں میں کوئی وبا پھیلتی اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں نومولود لقمۂ اجل ہو جاتے یا پھر مملکتِ خداداد میں کہیں بٹ ماروں کے جتھے کسی آفتِ سماوی کی صورت آج کل کی طرح علاقوں پر قابض ہو جاتے اور لوگوں کو لوٹتے پھرتے جیسے آج ہم اپنے محلوں، گلیوں، بازاروں اور شاہراہوں پر اٹھائی گیروں اور بھتہ خوروں کو یہی کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں.... لیکن یہ سچ ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس میں کسی درویش صفت بادشاہ کا بھلا کیا دوش؟''

داستان گو کی نئی داستان اہل اقتدار کے نمائندوں کو پسند نہیں آتی اور وہ پرچیوں کے ذریعے اسے اپنے بیان کو بے ضرر بنانے کی تنبیہ کرتے ہیں مگر داستان گو اپنی داستان کو مزید دل خراش بنانے سے باز نہیں آتا۔ ایک مرحلے پر اس نے بڑھتی ہوئی صعوبتون اور آفتوں کے باوجود لوگوں کی بےبسی اور بےحسی کا بیان اس طرح کیا۔ ''مسجدوں اور امام بارگاہوں میں دھماکے ہوتے۔ اسکول اور یونیورسٹی کے معصوم نونہالوں کو مسل کے پھینک دیا جاتا۔ بازاروں میں بم پھٹتے اور لوگ گاجر مولی کی طرح کٹ کے گر جاتے، لیکن چند گھنٹوں کے بعد عوام نارمل ہو کے دوبارہ اپنی زندگی کے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ یہ بہت حیرت ناک بات تھی، لیکن اس کی وجہ اور کچھ بھی نہ تھی، بس یہ کہ لوگوں نے صبر کی، برداشت کی، بےنفسی کی زندگی کو اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔''

جیسے جیسے داستان آگے بڑھتی ہے لوگوں کو دورِ حاضر کے حکمرانوں کا اصل چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس سے حاضرین میں بیچینی میں پھیل جاتی ہے اور ان میں شامل اہلِ اقتدار کے نمائندے ناراض ہو کے داستان گو کی سرکوبی پر تل جاتے ہیں اور تقریب کو یہ کہہ کر ختم کر دیا جاتا ہے کہ ''تیکنیکی خرابی کی وجہ سے پروگرام کو جاری رکھنا ممکن نہیں!''۔ یہ افسانہ جہاں یہ ثابت کرتا ہے کہ مبین مرزا عصری حقیقتوں کی عکاسی کی پوری جرائت رکھتے ہیں وہاں اس بات کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ تازہ کاری کے لئے وہ افسانے میں تیکنیک کے تجربے کرنے کے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔

مبین مرزا کو کردار سازی اور ماحول کی تصویر کشی میں بڑی مہارت حاصل ہے جس سے ان کی قوتِ مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔ 'بھولی بسری عورت' کی لالی ہو، 'دہری سزا' کے چاچا جی اور افشاں، 'مانوس' کی نیلم، 'واٹس ایپ' کی روبینہ اور 'امانت' کی خالہ ناجو، مبین مرزا نے انھیں بہت پر کشش چہرے اور کردار عطا کئے

ہیں اسی طرح ان کے پہلے مجموعے 'خوف کے آسمان تلے' میں 'گمشدہ لوگ' کے کردار انجلی اور رئیس، 'خوف کے آسمان تلے' کے پروفیسر کیانی اور آخری افسانے 'قید سے بھاگتے ہوئے' کی ملکان بی بی، شبو اور مراد نے انسانی رنگ و روپ میں آ کے افسانہ نگار کی اس صلاحیت کو آشکار کیا ہے کہ وہ عام لوگوں کے ہجوم میں سے ایسے چہروں کو اپنی کہانیوں کے لئے منتخب کر لیتے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف زندگی کے بعض ان دیکھے گوشوں تک رسائی ممکن ہوتی ہے بلکہ ایسے جذبات و احساسات سے بھی آشنائی ہوتی ہے جن کا اظہار صرف مخصوص حالات میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 'گم شدہ لوگ' کی انجلی اپنے مخصوص حالات کے تحت ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتی تھی، ''سب لوگ اپنی اپنی گولڈن آرک کی تلاش میں رہتے ہیں، اس نے سوچا، رئیس اور وہ دونوں گم شدہ افراد ہیں اور دونوں کسی اپنے کی تلاش میں ہیں۔''

'خوف کے آسمان تلے' کے پروفیسر کیانی بھی مخصوص حالات کے زیر اثر ایک گم شدہ فرد ثابت ہوتے ہیں اور ایک باضمیر انسان ہونے کے باوجود سر پر منڈلانے والے خطرے سے گھبرا کے وہ کر گزرتے ہیں جو وہ کبھی نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے بعد جب وہ گھر کے لئے پلٹے تو ''ان کے پاؤں تلے اطمینان کی ٹھوس زمین تھی لیکن انھیں لگ رہا تھا جیسے ہر ہر قدم پر وہ نیچے اور نیچے۔۔۔ پاتال میں لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔''

اسی طرح 'قید سے بھاگتے ہوئے' کا مراد بھی جان جانے کے ڈر سے اس راہ پہ چل پڑتا ہے کہ آخر میں یہی ندا اس کے کان میں آتی ہے کہ ''جاؤ اب دفع ہو جاؤ!'' یہ کہانیاں ایک مردہ سماج میں موت سے پہلے موت کو گلے لگا لینے والوں کی کہانیاں ہیں۔ دیکھا جائے تو مبین مرزا اپنے افسانوں میں اس سماج میں جہاں لحہ لحہ فرد کی موت کا اعلان ہوتا رہتا ہے زندہ انسانوں کو تلاش کرنا چاہتے ہیں اور جہاں جہاں انھیں ایسے باہمت اور مشکلات کے آگے ہتھیار نہ ڈالنے والے افراد نظر آتے ہیں وہ ان کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ شہر میں ہنگاموں کی ایک شام 'خوف کے آسمان تلے' والے پروفیسر کیانی پر جو گھر لوٹتے ہوئے کسی سواری کے موجود نہ ہونے سے پریشان تھے، کیا گزری اس کا بیان دیکھئے۔

''گھر تو انھیں ہر صورت پہنچنا تھا، سو چلے جا رہے تھے، اتنے میں ایک موٹر سائیکل قریب آئی جس پر تین آدمی سوار تھے۔

''کہاں جائیں گے؟''

''نارتھ کراچی''۔ انھوں نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

''آ جایئے ہم لوگ بھی وہیں جا رہے ہیں!'' موٹر سائیکل رک گئی۔

''لیکن آپ تو... مطلب ہے پہلے ہی تین آدمی۔''

''آ جاؤ بھائی آ جاؤ، کوئی مسئلہ نہیں ہے، دل میں جگہ ہو تو موٹر سائیکل پر بھی جگہ بن جاتی ہے، اللہ ہم سب کو خیریت سے گھر پہنچا دے گا!''

اسی طرح 'بے خواب پلکوں پہ ٹھہری رات' میں موت کی سیاہ پرچھائیوں میں لپٹا ایک نوجوان اقبال جسے دشمنوں کی طرف سے جیتے رہنے کے لئے تین دن کی مہلت دی گئی ہے، آہنی جرائت و ہمت کا نمونہ بن کے ایک جیتے جاگتے انسان کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ مبین مرزا کے لفظوں میں اس کی تصویر دیکھئے۔

''انکل...!'' اقبال نے بے حد مستحکم آواز میں کہا، ''ہو سکتا ہے یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہو، میں آپ سے ایک فرمائش کرنا چاہتا ہوں!''

''میرے دل پر گھونسہ لگا۔'' خدا تمھاری حفاظت کرے بیٹے، سلامت رہو، خوشیاں دیکھو، ایسا کیوں سوچتے ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟''

''کافی کا کپ ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ میں رعشہ آ گیا ہے۔''

''انکل جب آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ مجھے تین دن کی مہلت دی گئی ہے تو میں اب آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں نے اب تک یہ بات ابا کو اس لئے نہیں بتائی تھی کہ وہ پریشان ہو جائیں گے۔ میں جانتا ہوں میرے ساتھ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ابا مجھے چاہے کہیں بھی چھپا لیں، جب انھیں مجھ تک پہنچنا ہوگا، وہ پہنچ جائیں گے۔ ان کے ہاتھ لمبے ہیں۔ انھیں زمین کے خداؤں کی حمایت حاصل ہے، وقت آج ان کا ہے لیکن اگر آج ہم اپنے حقوق سے دستبردار ہو گئے تو ہمارا کل بھی ہمارا نہیں ہوگا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں جو مہلت انھوں نے مجھے دی تھی وہ پوری ہو گئی ہے.. مگر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں وہ جھوٹا بیان نہیں دوں گا جو وہ مجھ سے لینا چاہتے ہیں۔ میرے اس انکار کا کیا نتیجہ نکلے گا، میں جانتا ہوں اور میں اس کے لئے تیار بھی ہوں۔''

مبین مرزا کے افسانوں میں ہمیں اپنے مردہ معاشرے کی نت نئی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں، خوف و دہشت کی پرچھائیوں میں لپٹی ہوئی بستیاں اور زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے ہوئے لوگ۔ 'دامِ وحشت' کے شیخ سخاوت علی جیسے نمازی جنھیں دوسرے نمازی پر دہشت گرد کا گمان ہوتا ہے اور 'سفید پردہ' کا خالد جو تنظیم کا رکن نہ ہونے کے باوجود موت کے جال میں آ پھنسا تھا اور واپسی کے سب دروازے بند ہو چکے تھے۔ ذرا اس منظر کو افسانہ نگار کی آنکھوں سے دیکھئے۔

''کیا ٹائم ہوا ہے خالد؟'' منّور نے پوچھا۔

''ہم وقت کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور گردن گھما کے منّور کو دیکھا۔ وہ ایسے ہی گردن پیچھے ڈالے بیٹھا تھا۔

''ہیں منّور! سن رہا ہے، خوش خبری ہے یہ کہ ہم....!''

''نہیں خوش خبری نہیں تو بری خبر سنا رہا ہے تو، وقت کی قید سے آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم موت کی قید میں آ گئے ہیں۔'' منّور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تو اتنا ڈپریس کیوں ہے؟''

''موت کو سامنے دیکھ کر آدمی ڈپریس نہیں ہوتا تو کیا بھنگڑا ڈالتا ہے؟''

باقی صفحہ نمبر ۶۰ پر ملاحظہ کیجیے

''احساس کی رنجشیں''

(مبین مرزا کے نظمیہ کلام سے بصد اہتمام)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

وہ دل حیراں نہیں ہوتے

ہوا اور دھوپ کا قرنوں پرانا ساتھ ہے
اور زندگی موجِ رواں ہے
وہ کسی پل رُک نہیں سکتی
نجانے کتنے برسوں کی یہ پُراسرار تنہائی
مرے دل میں
کھجوروں کے درختوں کی طرح یوں ایستادہ ہے
کہ اُجڑے قرطبہ کے سارے منظر
میری آنکھوں میں لرزتے ہیں
نجانے کتنے برسوں کی اُداسی کے
اندھیرے گنبدوں میں گونجتے جاں سوز اندیشے
مسلسل مجھ پہ یورش کرتے ہیں
اور اُندلس کے کوچہ و بازار اور باغوں کو
فولادی سموں سے روندتے گھوڑوں کی ٹاپوں سے
مرا سینہ دھمکتا ہے
مرے احساس کی یہ رنجشیں اور روح کے یہ دُکھ
کسی اک ساعتِ سفّاک نے مجھ کو نہیں سونپے......
کہ یہ تو اصل میں وہ جال ہے
تاریخ کی مکڑی جو صدیوں سے مرے اندر کہیں
چپ چاپ بُنتی ہے
ہوا اور دھوپ میری زندگی کے منظروں میں
بے ثباتی کی علامت ہیں
زمیں کی گردشوں سے تیز ہے حالات کی گردش
اسی نے میرے سر میں خاک ڈالی ہے
یہی تو میری آنکھوں میں
پگھلتی برف کی دیوار چنتی ہے
یہ کس کی بات سنتی ہے
مری سانسوں میں غرناطہ کی دُھول اُڑتی ہے
اور خاموش دِلّی کی ہوائیں سرسراتی ہیں
مرے اندر ہزاروں میل تک گہرا دُھواں پھیلا ہوا ہے
مناظر جو کبھی روشن تھے، اب وہ بجھتے جاتے ہیں
نجانے کتنی موجیں چشمِ طوفاں میں اُمڈتی ہیں
مجھے معلوم ہے لیکن......
کہ صدیوں کے دُکھوں پر جو نہ چھلکے ہوں
وہ آنسو اِس قدر ارزاں نہیں ہوتے ——
جو سرد و گرمِ دُنیا دیکھ بیٹھے ہوں
ہوا کا رُخ بدلنے پر وہ دل حیراں نہیں ہوتے!۔

☆

اُلٹا زینہ

یوں دُھندلکے نہ تھے
ایسی مدقوق اور اِس قدر مضمحل
ہم نے دیکھی نہ پہلے کبھی روشنی
اور مشکل نہ تھی اِس قدر زندگی
مختلف رنگ تھے
مختلف دائرے
صوفیہ تھے یہاں اور یہیں تھے رِشی
جن کے منڈل الگ اور الگ زاویے
اِس طرف گیان تھا اُس طرف آگہی
پھر نجانے اچانک یہاں کس طرح
وقت نے جست لی
اور پھر بند ہونے لگے راستے
زندگی جو کبھی شارعِ عام تھی
اُس پہ باڑھیں اُٹھیں
آگہی جو خداوندِ عالم کا انعام تھی
صرفِ وحشت ہوئی
روشنی نذرِ دہشت ہوئی
راستے بٹ گئے
خوف سے، موت سے اَٹ گئے
اور اب ہر قدم ہے دوراہا یہاں
تھی جو نعمت کبھی دوسراتھ
اب نہیں اس کا خواہاں کوئی
آدمی اپنے سایے سے ڈرنے لگا
وقت تہذیب کا
اُلٹا زینہ اُترنے لگا
اور تاریخ کا
خواب پھر سے بکھرنے لگا
درد حد سے گزرنے لگا

☆

ہر خواب کو اک دن ٹوٹنا ہے

اک یاد سی لہریں لیتی ہے
اک درد سا بہتا آتا ہے
اُس خواب کی اور چلا ہے دھیان
جس خواب کی چلمن کے اُس پار
اک دل کا نگر تھا جھلمل سا
وہ خواب جزیرہ دُور تلک
نغموں کی مہک سے روشن تھا
درپن میں وہاں اک درپن تھا
اک باغ تھا باغ کے اندر بھی
اُس باغ کے ہر اک گوشے میں
سو رنگ شگوفے ہنستے تھے
آکاش سے ناتا جوڑے ہوئے
نظارے کی پہنائی میں
سو رنگ اُجالے کھلتے تھے
سب پھول نرالے کھلتے تھے
اک روز مگر خاموشی سے
پھر وقت نے یوں کروٹ بدلی
اک آن میں جیسے کچھ نہ رہا
سب پل کا طلسم تھا ٹوٹ گیا
اُس خواب کے ٹوٹ بکھرنے پر
اِس جاں پہ قیامت گزری ہے
اِس دل میں اندھیرا چھایا ہے
وہ خواب جو ٹوٹ کے بکھرا ہے
اُس خواب کے ریزے ریزے سے
آواز یہ ہر پل آتی ہے
جیون کے مسلسل دھوکے میں
کیوں یاد تمھیں رہتا ہی نہیں
ہر خواب کو اک دن ٹوٹنا ہے......
ہر ساتھ کو اک دن چھوٹنا ہے—!

رسید

روشنی!
روح کی سرخوشی
کھوگئی ہے کہاں—زندگی
کس طرح چھاگئی اس قدر بے دلی
کچھ بتا— کیا ہوئی دلبری، کیا ہوئی بندگی
راکھ کے ڈھیر میں کیسے آخر ڈھلی دل کی وارفتگی

مہرباں
وقت ہے اب کہاں
کیوں نہیں کوئی جائے اماں
ایسے بدلے ہیں کیوں یہ زمیں آسماں
دل کی مجبوریاں کیسے پہنچیں کراں تا کراں
درد کے آبِ گُم میں ہے کیوں بے نشاں دولتِ جسم وجاں

سلسلہ
منقطع ہو چلا
سوچ کا رستہ کھوٹا ہوا
روح تھکنے لگی اور دل بجھ گیا
روز بڑھتا ہی جاتا ہے یہ بیچ کا فاصلہ
وہ محبت ریاضت تھی کیوں گر یہی اپنا انجام تھا
کیا خبر کیا ہوا شوق کا پیرہن آرزو کا لباس
جس گھڑی ہے ضرورت، نہیں کوئی بھی آس پاس
یوں کہ رگ رگ میں اُترا ہے خوف وہراس
دل میں باقی نہیں کوئی آس
خواہشیں بے حواس
ناسپاس

جب کہ اپنے ہی رنگوں میں بجھنے لگیں سارے نقش ونگار
اور ڈھلنے لگے روح کی سرخوشی کا خمار
کیا ہو اس وقت کی وحشتوں کا شمار
جان وتن جب کہ ہوں بے حصار
پھر کہاں وہ بہار
کامگار

اب تو دامن میں اپنے نہ ارض وسما اور نہ دُنیا و دیں
وہ خوشی اب نہ تیرے قریں اور نہ میرے قریں
ولولے، جن سے تھی زیست خندہ جبیں
کھو گئے راستے میں کہیں
جان وتن کا یقیں
اب نہیں

روشنی
میری جاں......
روشنی!

☆

اہلِ ہنر بے کار ہوئے

اک عمر کی کاوش سے ہم نے
جو کارِ تمنّا سیکھا تھا...
دُنیا کے نئے بازار میں اب
کچھ مانگ نہیں باقی اُس کی
اے زعمِ محبت کیا کیجے
ہم اہلِ ہنر بے کار ہوئے!

☆

جواز

بدلی رُتوں میں کھوئے ہوئے موسموں کی یاد
آتی ہے جیسے بچھڑی ہوئی خوش بوؤں کی یاد
وابستہ جن سے تھیں کبھی جینے کی خواہشیں
زندہ ہیں دل میں آج بھی اُن صحبتوں کی یاد
لیکن وہ خواب کیا کہ جو تعبیر پاسکے

ہر خواب کے جلو میں ہیں برسوں کے رتجگے
ہر سینۂ گلاب میں ہیں داغ بے شمار
ہر آرزو کی تاک میں ہیں مرحلے ہزار
ہر زندگی کے باغ میں بے انت خارزار
ممکن ہوا یہ کس سے کہ قسمت جگا سکے

ہر دشتِ آرزو میں سرابوں کے سلسلے
ہر اہتمامِ زیست میں باریکیاں بہت
ہر نغمگی کے بطن میں بے انتہا خروش
ہر روشنی کی اوٹ میں تاریکیاں بہت
زندہ یہاں وہی ہے جو خود کو مٹا سکے

ہر دل لیے ہوئے ہے بجھی حسرتوں کی آگ
ہر روح کو جلاتی ہے کچھ وحشتوں کی آگ
احساس ہو نہ پائے کسی کو یہ اور بات
صدیوں کو پھونک ڈالتی ہے ساعتوں کی آگ
لمحوں کی زد سے کوئی نہ کچھ بھی بچا سکے

ایسے میں جب کہ زیست سراپا الم ہوئی
اُس پل جب آرزو کوئی مشقِ ستم ہوئی
جب دل سے اٹھ گیا سبھی رشتوں کا اعتبار
جب ہر اُمیدِ صبح اندھیروں میں ضم ہوئی
ایسے میں جب کہ دل کو یہاں راس کچھ نہیں

دُنیا کی رونقوں سے بھی اب آس کچھ نہیں
باقی نہ رہ سکی کوئی جب لاگ یا لگن
جب جیتے جی بھی جینے کا احساس کچھ نہیں
اے دوست ہم کہ دل میں وہی جستجو لیے
کیا کم ہے جی رہے ہیں تری آرزو لیے

☆

احساس

خواہشوں کی منزل پر
حسرتوں کے رستے میں
دلبری کے پربت پر
وحشتوں کی وادی میں
بےخودی کے صحرا میں
آگہی کے دریا میں
وقت کے جھمیلے میں
روز وشب کے ریلے میں
دل پہ جو گزرتی ہے
وہ اِسی حقیقت کا
انکشاف کرتی ہے
ہر مقام ومنزل پر
آدمی اکیلا ہے

☆

آپ کیسے ہیں سرکار والا!

کیا ہم آپ کو کبھی یاد آتے ہیں؟

واٹس ایپ پر آنے والے دو سطروں کے اِس میسیج نے شیخ مجیب عالم کو مخمصے میں ڈال دیا۔ دیکھا جائے تو ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن سوچا جائے تو کچھ خاص ضرور تھا۔ ان کی چھٹی حس نے پھڑک کر اصل میں ساری مشکل پیدا کی تھی۔ وہ تو روزمرہ کے معمول کے مطابق سب کچھ کر رہے تھے جیسا کہ اب کئی برس سے اُن کی عادت بن گئی تھی، کچھ ایسے ہی انداز سے جیسے ایک مشین یا کوئی روبوٹ سب کچھ دی گئی کمانڈ کے مطابق آٹومیٹک طریقے سے کیے چلا جاتا ہے۔ کسی رُکاوٹ اور ہچکچاہٹ کے بغیر۔ روزمرہ کی یکسانیت پر انھوں نے کئی بار اپنے اندر کسی کو کلبلاتے ہوئے محسوس کیا تھا جو دھیرے سے ان سے کہتا تھا:

زندگی جیسے ٹھہر سی گئی ہے۔

شیخ مجیب عالم نے آج بھی اندر کی یہ آواز سنی، ایک لمحے کے لیے سوچا اور کوفت محسوس کی۔ واقعی دن رات ایک ڈھرے پر آ گئے تھے۔ مخصوص وقت پر صبح ہوتی اور طے شدہ کاموں میں دن گزر تا۔ ایک خاص وقت پر شام ہو جاتی اور اس کے بعد اسی طرح رات۔ دن میں دفتر کے معمولات بھی ایک ہی انداز سے چلتے رہتے۔ رات کو گھر آ کر تھوڑا وقت بچوں اور بیوی کے ساتھ، کچھ دیر ٹی وی کے سامنے اور بس دن رات کا دائرہ پورا ہو جاتا۔ بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی مصروفیات تھیں اور زندگی گزارنے کا ایک انداز بن گیا تھا۔ بیوی نے خود کو گھر کے کاموں، ٹی وی اور نماز روزے میں مصروف کر لیا تھا۔ شیخ مجیب عالم کا ایک چھوٹا سا سوشل سرکل بھی تھا جس کے لوگ آپس میں فون اور میل کے ذریعے رابطے میں تو رہتے مگر ملنے ملانے کا موقع کم کم ہی نکلتا۔ دفتر کے ملازم نے ان کے لیے چائے لا کر رکھی تو شیخ مجیب عالم نے اخبار کو ایک طرف کیا اور لیپ ٹاپ کو سرکاتے ہوئے سامنے کر لیا۔ ایسا کرتے ہوئے کی بورڈ پر کہیں ہاتھ لگنے سے لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن ہو چکی تھی۔ انھوں نے میل چیک کرنے کے لیے گوگل کروم پر کلک کیا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

یکسانیت کا احساس پچھلے کئی دن سے مسلسل بور کر رہا تھا، لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ انھیں سوجھ نہیں رہا تھا۔ اصل میں سب سے بڑا مسئلہ تو آدمی کی زندگی میں وقت پیدا کرتا ہے، وہ اکثر سوچتے۔ بس اس کے ساتھ ہی سوالوں اور خیالوں کا سلسلہ چل نکلتا، مثلاً یہ کہ وقت ہے کیا؟ ایک بہت ایب سرڈ چیز۔ اسے چھوا جا سکتا ہے نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے گھومتے ہوئے پہیے کو روکا نہیں جا سکتا، الٹا نہیں پھیرا جا سکتا، اس کی رفتار کو گھٹایا تک نہیں جا سکتا۔ وقت کے ساتھ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ آپ کے ساتھ سب کچھ کرتا ہے۔ آپ کے اندر ہوا بھر دیتا ہے اور آپ بادلوں پر سفر کرنے لگتے ہیں۔ یہ آپ کو بلندی پر لے جاتا ہے اور پھر یہ دُنیا، یہ زمین، اس کی سب چیزیں آپ کو چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ آپ ہوا میں تیرتے رہتے ہیں۔ کششِ ثقل آپ کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی، اپنے سارے زور کے باوجود آپ کو نیچے نہیں لا پاتی۔ قوسِ قزح کے رنگ کبھی آپ پر برستے ہیں اور کبھی آپ کے اندر سے پھوٹتے اور آسمان پر پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ زمین آسمان دونوں پر آپ کا تصرف قائم ہوتا ہے۔ آپ کی پسند، آپ کا اختیار ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کسی اور کی زندگی میں ایسا ہوا یا نہ ہو، کم سے کم شیخ مجیب عالم کی زندگی میں تو ایسا ہی ہوا تھا۔

یہ تو گئے دنوں کی بات ہے۔ انھوں نے اپنا پاس ورڈ ٹائپ کرتے ہوئے سوچا۔ اب تو وقت اُن کے ساتھ بھی وہی چال چل چکا تھا جو سب کے ساتھ چلتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے سامنے کوئی بادشاہ ہے یا فقیر اور نیک ہے یا بد۔ وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ شیخ مجیب عالم کے ساتھ بھی کر چکا تھا۔ اس نے اُن کے اندر جو ہوا بھری تھی، وہ خود ہی دھیرے دھیرے نکال دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ نیچے آتے چلے گئے اور اب پورے زمین پر تھے۔ وہ سب کچھ جو پہلے بہت چھوٹا اور ناقابلِ توجہ نظر آتا تھا، اب اپنے اصل حجم میں ان کے سامنے تھا۔ وہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی تھے۔ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ سامنے آنے والے حقائق کو تسلیم کرتے چلے گئے۔ کچھ باتوں کو ماننے میں تکلیف تو ضرور محسوس ہوئی، لیکن وہ جانتے تھے کہ مانے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے انھوں نے ماننے والی ہر بات کو بہر حال مان لیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ زندگی کے دھکوں سے بچ گئے۔ بس اب یہ تھا کہ کبھی کبھی بوریت اور یکسانیت کا احساس ستانے لگتا۔

اپنے اِن بوکس پر نظر دوڑاتے ہوئے شیخ مجیب عالم نے طے کیا کہ کون سی میل پہلے دیکھنی ہے اور پھر ایک ایک کر کے دیکھتے اور ریپلائی کرتے چلے گئے۔ ایک میل ذرا تفصیلی جواب مانگتی تھی، اس لیے انھوں نے اسے آخر میں رکھا تھا۔ جواب دینے کے علاوہ کچھ اٹیچ منٹس بھی اس کے ساتھ بھیجنی تھیں۔ شیخ مجیب عالم نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ کو ایک طرف کیا اور دوبارہ نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جما دیں۔ عین اسی لمحے ہلکی سی بیپ کے ساتھ ان کے موبائل فون کی اسکرین پر میسیج والی روشنی پل بھر کو ابھری اور پھر غائب ہو گئی۔ ان کا ہاتھ بے اختیار موبائل کی طرف بڑھا۔ انھوں نے اسکرین پر اپنا پیٹرن بنا کر موبائل کو اَن لاک کر کے میسیج دیکھا۔ وہی ٹیکسٹ دوبارہ واٹس ایپ پر آیا تھا۔

جس نمبر سے میسیج کیا گیا تھا وہ شیخ مجیب عالم کے فون میں نام سے محفوظ نہیں تھا۔ انھوں نے کئی بار نمبر پڑھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ نمبر کچھ مانوس ہے مگر کوئی نام ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے ایک بار پھر میسیج دیکھا۔ یہ انداز کسی ایسے شخص کا معلوم ہوتا ہے جس سے کوئی تعلق رہا ہو، بلکہ ذرا بے تکلفی کا رشتہ۔ انھوں نے سوچا۔ مسئلہ

یہ تھا کہ ان کی زندگی میں تو درجنوں ایسے رشتے آئے اور اپنا اپنا وقت پورا کرکے رخصت ہوگئے۔ چھپن برس کی عمر تک آتے آتے جیون رستے میں کتنے ہی موڑ آئے تھے جہاں وہ رُکے تھے، جہاں کسی رنگ نے ان کا دامن تھاما تھا یا کسی آواز نے انھیں اپنے آنچل میں سمیٹ لیا تھا۔ کہیں کوئی خوش بوا چانک راہ میں آئی تھی اور پھر پل کی پل میں ٹوٹ کر ان پر برسی تھی۔ آدمی کے ساتھ زندگی میں کیا کیا ہوتا ہے، یہ سوچتے ہوئے بہ یک وقت کئی چہرے ان کے ذہن کی اسکرین پر چمک اٹھے۔ دل میں ابھرتی ہوئی کئی آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگیں۔ رنگوں کی برکھا برساتے ہوئے کئی لمحات اور کئی مناظر آن کی آن میں آنکھوں کے آگے سے گزر گئے۔ شیخ مجیب عالم کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے، لیکن پل بھر میں ہنس کر سیدھے ہوئے اور بلند آواز میں خود سے کہا، اچھی ہی گزر گئی زندگی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ موبائل اب تک ان کے ہاتھ میں تھا۔ آخر یہ کون ہوسکتا ہے؟ انھوں نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو سر میں پھیرتے ہوئے خود سے دریافت کیا پھر سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولے، پہلے ذرا یہ ہاتھ کا کام نمٹا دیا جائے پھر دیکھتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر متوجہ ہوگئے۔

کام سے فرصت پاکر انھوں نے موبائل اٹھایا۔ ایک بار پھر میسیج پڑھا، فون نمبر پر غور کیا، لیکن دماغ بس یہ کہہ رہا تھا کہ نمبر کچھ جانا پہچانا ہے۔ اس سے آگے خاموشی تھی۔ انھوں نے ایک مدت سے کوئی ٹیلی فون انڈیکس نہیں بنائی تھی، البتہ ٹیبل ڈائری پر کچھ فون نمبرز کو کبھی کبھی نوٹ کرلیا کرتے تھے۔ ویسے ضرورت کے سب نمبرز تو اب موبائل میں ہی محفوظ تھے۔ خیال تو نہیں تھا کہ یہ نمبر ٹیبل ڈائری پر کہیں نوٹ کیا گیا ہوگا، لیکن پھر بھی انھوں نے ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا۔ نمبر کہیں درج نہیں تھا۔ ذہن الجھ رہا تھا کہ آخر یہ کس کا میسیج ہے، مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

دوسرے دن زندگی پھر اپنے معمول کے مطابق شروع ہوئی۔ گزرے دن کی الجھن ذہن سے رفع نہیں ہوئی تھی، مگر انھوں نے اب اس سے توجہ ہٹالی تھی۔ دفتر کے کام خود اتنے ہوتے ہیں کہ ایک بار آدمی ان میں مصروف ہوجائے تو پھر اِدھر اُدھر کی چیزوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ اسی انداز سے دن گزر رہا تھا۔ ساڑھے تین بجے وہ لنچ کے لیے اٹھے تو پھر اس میسیج کا خیال آیا۔ دفتر کے ایم ڈی اور ساتھی ڈائریکٹر کے ساتھ مل کر وہ لنچ کرتے تھے۔ وہ تینوں ذرا دیر سے لنچ کے عادی تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکلے تھے کہ اسی وقت دوسرے ڈائریکٹر صاحب بھی اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ دونوں ایم ڈی صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ گپ شپ کھانے کے ساتھ چلتی رہی۔ دفتر کی اور دُنیا کی کتنی ہی باتیں ہوجاتی تھیں اس وقفے میں۔

کھانے کے بعد واپس کمرے میں آ کر ایک فائل پر فنانس ڈائریکٹر کا نوٹ پڑھتے اور چائے پیتے ہوئے موبائل کی میسیج بیپ سن کر انھوں نے فون اٹھایا۔ اسی نمبر سے میسیج تھا جسے پڑھتے ہوئے ان کے چہرے سے تشویش کی لہر گزری:

ایم ڈی کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اب اپنے کمرے میں آ کر آپ چائے پی رہے ہوں گے اور اطمینان سے کوئی فائل دیکھ رہے ہوں گے۔

آخر یہ کون ہے جو اُن کے معمولات سے اتنا واقف ہے کہ اسے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ انھیں الجھن بھی ہوئی، لیکن ساتھ ہی اپنائیت کا احساس بھی ہوا۔ واٹس ایپ کے اس اکاؤنٹ کے ساتھ پروفائل فوٹو نہیں آ رہا تھا، بلکہ اس کی جگہ برف پوش پہاڑوں کا منظر لگایا گیا تھا۔ انھوں نے سوچ کر ذہن میں لانے کی کوشش کی کہ ایسا ذوق کس دوست کا ہے، لیکن ذہن کا میجک بورڈ بالکل کورا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ جوابی میسیج کرکے پوچھیں کہ کون ان سے مخاطب ہے، لیکن یہ اُن کی عادت نہیں تھی۔ وہ کسی نامانوس نمبر سے فون کال ریسیو کرتے تھے اور نہ ہی ایسے کسی نمبر کے میسیج کو رپلائی کرتے۔ انھوں نے سوچا، کسی تجسّس کے اظہار کی کیا ضرورت ہے؟ جو بھی ہے اسے خود اپنا تعارف کرانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ میسیج کرنے سے تو رُک گئے مگر اب ذہن پر مسلسل ایک بار سا ہوگیا تھا۔

تیسرے دن شیخ مجیب عالم خود اس نمبر سے میسیج کے منتظر تھے، لیکن شام ہوگئی اور اس طرف مکمل خاموشی تھی۔ ہفتے کے اختتامی دن یوں تو دفتر کے اوقاتِ کار ذرا پہلے ختم ہوجاتے تھے، لیکن وہ اس دن بھی روز کے وقت تک ہی بیٹھتے تھے کہ یہاں سے اٹھ کر وہ بڑی بہن کے یہاں جاتے۔ وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹا گزارتے اور پھر اپنے گھر روانہ ہوجاتے۔ اس اضافی وقت میں اگر آفس کا کام نہ ہوتا تو ان کا وقت کمپیوٹر یا موبائل کے ساتھ ہی گزرتا۔ اس وقت جوں ہی انھوں نے موبائل اٹھایا عین اسی لمحے ایک میسیج کودگیا۔ انھوں نے سوچا، شاید اسی نمبر سے میسیج ہو۔ واقعی اسی نمبر سے تھا:

آج تو آپ کو بڑی بہن کے ہاں جانا ہوگا۔ یقیناً بہت خوش قسمت ہیں وہ کہ انھیں آپ جیسا خیال رکھنے والا بھائی ملا ہے۔ ہم بھی کبھی ان لوگوں میں تھے جنھیں آپ کی توجہ حاصل ہوتی تھی۔

شیخ مجیب عالم چکرا گئے۔ ارے بھئی ایسا کون ہے یہ شخص کہ جسے میرے بارے میں ہر بات معلوم ہے۔ اضطراری کیفیت میں انھوں نے ڈائل پیڈ کھولا اور نمبر ڈائل کرنے کا سوچا، لیکن پھر سر جھٹک کر فون رکھ دیا۔ کون ہے یہ جو اس طرح پہیلیاں بھجوائے جا رہا ہے اور اپنی واقفیت جتائے جا رہا ہے۔ یہ سب باتیں تو کوئی ایسا ہی شخص جان سکتا ہے جو بہت قریب رہا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ضرور کوئی خاتون ہیں۔ اپنی اس رائے پر انھیں خود ہنسی آ گئی۔ گویا وہ کہہ رہے تھے کہ اُن کے اتنے قریب کوئی عورت ہی آ سکتی تھی مرد نہیں۔ خیر جو بھی ہے، سامنے کیوں نہیں آ رہی وہ۔ انھوں نے جھنجھلا کے سوچا۔ موبائل نے پھر بیپ دی۔ اسی نمبر سے ایک اور میسیج تھا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے فون میں ہمارا نام اور نمبر محفوظ نہیں ہے۔ آپ نے بھلا دیا ہمیں۔ حالاں کہ ہم یوں بھلا دینے والے تو نہیں تھے۔

وہ ابھی یہ میسیج پڑھ کر ہی بیٹھے تھے کہ ایک اور میسیج ٹپک گیا:

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اس اجنبی نمبر کے میسج سے اب الجھن ہو رہی

ہوگی۔اگر یہ نمبرآپ کے موبائل میں نام کے ساتھ محفوظ ہوتا تو آپ یقیناً رپلائی کر چکے ہوتے۔ہمارے کسی میسیج کا جواب اس لیے نہیں آیا کہ آپ کسی اجنبی نمبر کو رپلائی نہیں کرتے۔سوچیے جب ہم آپ کے بارے میں اتنی باتیں جانتے ہیں تو ضرور آپ کے بہت قریب رہے ہوں گے نا۔

یہ میسیج پڑھ کر شیخ مجیب عالم واقعی پریشانی میں پڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی کوفت پیدا کر رہا تھا کہ اگر واقعی کوئی ایسا شخص ہے جس سے قریبی تعلق رہا ہے تو یہ خفت کی بات ہے کہ ذہن میں شخصیت اور موبائل میں نمبر کچھ بھی محفوظ نہیں۔اتنی دیر میں ایک اور میسیج آ گیا:

چلیے خیر،کوئی بات نہیں۔یہ دُنیا ہے اور یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔

میرا نام روبینہ ہے۔

خدا کے لیے اب یہ نہ پوچھ لیجیے گا،کون روبینہ؟

نام پڑھتے ہی شیخ مجیب عالم کو کرنٹ لگا،لیکن پھر اگلے ہی لمحے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور ایک پل میں سارا ذہنی تناؤ ختم ہو گیا۔تھینک گاڈ! انھوں نے بلند آواز میں کہا۔عورتیں، چہرے یا نام—— کچھ بھی کہا جائے، اِس حوالے سے اُن کی زندگی بہت بھرپور گزری تھی۔عمر کا ہر موڑ حسین چہروں سے سجا ہوا تھا۔ان کے یہاں یہ ایک طویل تاریخ، ایک بڑا ریکارڈ تھا۔اس طویل تاریخ میں،لیکن روبینہ ایک ہی تھی۔ یہ صرف نام ہی ایک نہیں تھا، بلکہ روبینہ کی شخصیت،فکر اور والہانہ پن سب کچھ سب سے الگ تھا۔انھوں نے سوچا،کسی سوشل گیدرنگ یا کسی پروفیشنل میٹنگ میں ملنے اور پھر قربت کے لمحات تک پہنچنے والے چہروں اور جسموں کی ساری چکاچوند مختصر ہوتی ہے۔عام طور سے چند بار یا چند ہفتے اور اگر بہت زیادہ بھی چلے تو چند ماہ۔اس کے بعد ایسے سیّارے کسی نہ کسی وجہ سے مدار بدل لیتے ہیں۔اس کے بعد جانے والے کو کوئی دیر پا رنج ہوتا ہے نہ پیچھے رہ جانے والے کو دائمی ملال۔اپنے اپنے نئے مدار کی کہکشائیں دونوں کو پچھلا سب کچھ بھلا کر نئے دودھیا راستوں کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں۔روبینہ کی شخصیت کی طرح اس کا معاملہ بھی مختلف ثابت ہوا۔ چند ہفتے، چند مہینے نہیں، یہ تعلق کئی برسوں تک چلا اور ایسے چلا کہ بس۔کیسا زور تھا کہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔کیسی کشش تھی کہ ماند ہی نہ پڑتی تھی۔شیخ مجیب عالم کی آنکھوں کے آگے سے ایک ایک کر کے رنگ بہ رنگی ہنستی بولتی تصویریں گزرنے لگیں۔انھوں نے میسیج رپلائی کرنے کے لیے فون اٹھایا،لیکن پھر نمبر ڈائل کر کے بات کرنے لگے۔

فون پر گفتگو اچھی رہی۔وہی شائستہ آواز اور وہی اپنی طرف کھینچتا ہوا لہجہ۔ برسوں کی دُھند سے ایک ایسے چہرے کا اُبھر آنا جس کی خوش بو تیز بارش کے جھالے کی طرح ایک عرصہ ان پر برستی رہی تھی، شیخ مجیب عالم کو اچھا لگا۔ایسے سب رشتوں کی طرح یہ رشتہ بھی فیڈ آؤٹ تو شکایتوں کے غبار ہی میں ہوا تھا،لیکن دوسروں کے برخلاف ایک بار پھر ابھر آیا تھا اور دوبارہ ابھرتے ہوئے اس پر کسی شکایت کی گرد تھی نہ کسی تردّد کا غبار۔وہ دوبارہ ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرنے لگے،تب انھوں نے سوچا کہ ساری باتیں ہوئیں،لیکن ملاقات کی خواہش یا فرمائش کا اظہار کسی طرف سے نہیں ہوا۔ ؔچھپن سال کا مرد ایک دم ایکسائیٹڈ نہیں ہوتا۔انھوں نے خود سے کہا اور ہنس دیے۔

روبینہ سے اب روز چیٹنگ ہو رہی تھی۔ یکسانیت اور بوریت شیخ مجیب عالم کی زندگی سے ایک دم بالکل غائب ہو گئی تھی۔اس کا اظہار اُن کے طرزِ عمل سے بھی ہو رہا تھا،جبھی تو کل ایم ڈی نے ان سے کہا تھا کہ آج کل آپ زیادہ چارجڈ اور چیئرفل نظر آ رہے ہیں۔مرد کی کیمسٹری بھی عجیب ہوتی ہے۔ایک مہربان عورت اسے مکمل طور پر بدل کر رکھ دیتی ہے۔انھوں نے سوچا۔روبینہ سے چیٹنگ میں بہت ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی،جس میں کسی رومان کا کوئی رنگ نہ ہوتا،جسمانی قربت کے خیال کا تو سوال ہی کیا،لیکن پھر بھی شیخ مجیب عالم کو اس رشتے کا بحال ہونا اچھا لگ رہا تھا۔روبینہ دو تین دن کے بعد واٹس ایپ پر لگایا گیا پروفائل فوٹو بدل دیتی۔ پہلے برف پوش پہاڑ تھے، پھر پھولوں کا تختہ لگا،اس کے بعد سمندر کی طوفانی موجیں آ گئیں۔

شیخ مجیب عالم نے پوچھا،''آپ پروفائل میں اپنی تصویر نہیں لگاتیں؟''

جواب آیا،''لگاتی ہوں۔''

''انھوں نے لکھا،''لگایئے نا پھر، میں نے بہت دن سے آپ کو نہیں دیکھا۔''

چند منٹ بعد جواب آیا،''لیجیے۔''

شیخ مجیب عالم نے دیکھا،تصویر میں وہی دل کش چہرہ تھا۔تصویر تازہ معلوم ہو رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سینتیس اڑتیس برس، انھوں نے عمر کا اندازہ کرتے ہوئے سوچا اور پوچھا،''کب کی ہے یہ تصویر؟''

جواب آیا،''پچھلے ہفتے کی۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ پہلے سے زیادہ حسین اور قاتل ہو گئی ہیں۔''

جواب میں ایک لمبا قہقہہ آیا۔

شیخ مجیب عالم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔خود سے بولے،خوب صورت ہی نہیں، بہت زندہ دل بھی ہے یہ عورت۔

تین دن بعد میسیج پڑھتے ہوئے شیخ مجیب عالم نے غور کیا کہ پروفائل فوٹو پھر بدل گیا تھا۔ یہ تصویر تو کسی اور کی ہے، انھوں نے سوچا۔ بڑی کر کے دیکھی تو ایک دم جھٹکا لگا۔نظریں تصویر پر جم کر رہ گئیں۔یا خدا! کیا مطلب، یہ کیا ہے؟ وہ بڑبڑائے اور اُن کا ہاتھ بے اختیار پیشانی کی طرف بڑھا۔وہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے تھے،لیکن پیشانی پر پسینہ تھا۔نگاہیں تصویر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ یہ ایک چھ سات برس کی بچی تھی جو بالکل اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی جیسی لگ رہی تھی۔عفت کی چند برس پہلے کی یہ تصویر روبینہ کے پاس کیسے پہنچ گئی؟ یہ تصویر تو اُس کے فیس بک البم میں بھی نہیں ہے۔انھوں نے سوچا۔اس دُبدھا میں انھوں نے فیس بک لوگ اِن کی۔جلدی سے بیٹی کے اکاؤنٹ پر گئے اور اس کا فوٹو البم

چیک کیا۔ یہ تصویر اس میں نہیں تھی۔ سخت اچنبھا تھا کہ یہ تصویر روبینہ کے ہاتھ کیسے لگی؟ صرف یہی ہے یا ایسی کچھ اور بھی چیزیں... یہ سوچتے ہوئے اچانک ایک خیال نے انھیں جھٹکا دیا اور شیخ مجیب عالم کا ہاتھ بے اختیار فون کی طرف بڑھا مگر اگلے ہی لمحے وہ رک گئے۔ اطمینان سے میسیج دوبارہ پڑھا، اس کا جواب بھیجا پھر فوراً ایک اور میسیج بھیجا جس میں پوچھا کہ یہ تصویر کس کی ہے؟

ترنت جواب آیا، ''کیا آپ پہچان سکتے ہیں؟''

وہ ایک لمحے کو چکرائے، کیا جواب دیں پھر بہت سنبھل کے لکھا، ''مجھے معلوم ہوتا تو پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ویسے بہت سویٹ، بہت کیوٹ سی بچی ہے۔''

''کچھ اندازہ لگائیے نا۔ ویسے آپ کا یہ خیال درست ہے کہ بچی واقعی بہت کیوٹ ہے۔'' جواب آیا۔

''تو پھر اسے آپ کی بیٹی ہونا چاہیے۔''

''بالکل درست۔ میں اس کی ماں ہوں۔''

''ارے زبردست! بہت بڑی خبر ہے یہ۔ پارٹی ہونی چاہیے۔''

''ضرور، آپ جب کہیے پارٹی ہو جائے گی۔''

''بہت شکریہ۔ ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔ اور کتنے بچے ہیں؟''

''یہی ہے اکلوتی۔''

''ماشاء اللہ! سلامت رہے۔''

''شکریہ۔ لیکن آپ نے آدھا پہچانا ہے ابھی، یعنی ماں کا بتایا ہے، ذرا باپ کو بھی پہچانیے۔''

شیخ مجیب عالم بہت سنبھل کر اور نورمل نظر آنے کی کوشش میں چیٹنگ کر رہے تھے، لیکن اندر سے وہ خوف زدہ تھے اور سارا خوف اسی ایک سوال کا تھا۔ انھیں ایک لمحے تو سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا جواب دیں پھر ذرا سنبھلے اور لکھا، ''ہاہاہاہا! ارے آپ کے خیال میں کیا ہم آپ کے شوہرِ نامدار کو بھول چکے ہیں؟''

''نہیں، وہ نہیں ہیں۔'' مختصر اور سنجیدہ جواب آیا۔

''ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ایسا مذاق کرتے ہیں بھلا؟''

''میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ یہ آپ کی بیٹی ہے۔ تصویر کو ایک بار ذرا غور سے دیکھیے، آنکھیں، ماتھا، ناک، ہونٹ سب کتنے ملتے ہیں آپ سے۔ آپ کے پاس اپنے بچپن کی کوئی تصویر ہو تو اس سے ملا کر دیکھیے۔''

''ہاہاہا! اتنا بڑا کریڈٹ دیا جا رہا ہے مجھے۔''

چیٹنگ ختم ہو گئی تھی مگر شیخ مجیب عالم دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے، اس لیے کہ ان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی، یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہونے جا رہی تھی۔ اوہ مائی گاڈ! یہ معاملہ آگے کہاں تک پہنچے گا، اس خیال سے ہی سر چکرا گیا۔ کمرہ گھومتا ہوا نظر آنے لگا۔ کیا چاہتی ہے یہ عورت؟ کیا یہ اب مجھے بلیک میل کر کے رقم ہتھیانا چاہتی ہے؟ کتنی رقم؟ اِس کا منہ بند رکھنے کے لیے اگر میں ایک بار رقم دے بھی دوں تو کیا یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟ نہیں، یہ تو عمر بھر کی بلیک میلنگ کا معاملہ ہے۔ جوان اولاد، خاندان، سماجی حیثیت، عمر کا یہ حصّہ — اُفوہ! انھیں جھرجھری آ گئی۔ اچھا تو یہ عورت اتنے برسوں کے بعد اس لیے رابطے میں آئی ہے مجھ سے۔ اُن کا دل بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں انھیں کیسی اور کتنی قیمت چکانی پڑے گی، انھوں نے سوچا۔ کیا انھیں یہ ماننے سے انکار کر دینا چاہیے کہ اُن کا اس عورت سے کبھی ایسا کوئی رشتہ رہا ہے کہ جس کا یہ نتیجہ نکلے؟ لیکن کیا ان کے انکار سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ لوگ ان کی بات کا یقین کر لیں گے؟ کیا یہ عورت اُن کے مکر جانے پر مایوس ہو کر بیٹھ جائے گی؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ زخمی ناگن بن جائے۔ ان کا سوشل اسٹیٹس تو اس مسئلے کو میڈیا کے لیے خبر بنا دے گا۔ اگر بات ڈی این اے چیک اپ تک پہنچ گئی تو — اوہ خدایا! کیا ساری عمر کی عزت خاک میں مل جائے گی؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، ہرگز نہیں۔ چاہے اس کے لیے انھیں کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔ یہ عورت کیا ڈیمانڈ کر سکتی ہے؟ پھر انھیں خیال آیا کہ روبینہ کا تعلق تو خود کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ اس کا میکا اور سسرال دونوں خوش حال خاندان ہیں۔ شوہر خود بہت اچھی حیثیت کا آدمی ہے۔ کیا اس کے حالات خراب ہو گئے ہیں؟ کیا یہ شوہر سے الگ ہو گئی ہے؟ آخر کس وجہ سے رابطہ کیا ہے اس نے؟ کیا چاہتی ہے، مجھ سے؟ شیخ مجیب عالم کے ذہن میں سوچوں کے اور سوالوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

اس گفتگو کے بعد کئی دن گزر گئے تھے، لیکن روبینہ کی طرف سے کوئی ڈیمانڈ سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ روز اُن کے ساتھ معمول کے مطابق چیٹنگ کر رہی تھی۔ ایک بار فون پر بات بھی ہوئی، لیکن ایسا کوئی اظہار نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، شیخ مجیب عالم کا ذہنی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ویسے تو وہ بھی روبینہ سے نورمل انداز سے پیش آ رہے تھے اور ایسا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ انھیں اس خبر سے کوئی پریشانی ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سخت ڈپریشن میں تھے اور دو دن سے تو باقاعدہ اس کی دوا لینے لگے تھے۔ اس لیے کہ ان کا ذہن بار بار خودکشی اور اس عورت کے قتل کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اندر کی شدید گھٹن کا احساس آخر انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ دوا سے انھیں زیادہ افاقہ تو نہیں تھا، لیکن ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ دوا پابندی سے اور اس وقت تک لینی ہے، جب تک وہ خود اُن سے بند کرنے کے لیے نہ کہے۔

آخر بلی کے تھیلے سے باہر آنے کا وقت آ ہی گیا۔ روبینہ نے ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے اسی شام کے لیے ہامی بھر لی۔ وہ چاہتے تھے کہ جو بھی ہونا ہے بس اب فوراً ہو جائے۔ گومگو کی اس کیفیت نے انھیں بری طرح تھکا دیا تھا، بیمار کر دیا تھا۔ وہ اب فوراً مسئلے کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ کئی بار انھوں نے سوچا کہ وہ خود ملنے کی خواہش کا اظہار کریں، لیکن یہ سوچ کر رک گئے کہ اس طرح تو روبینہ پر ان کی بے چینی اور خوف کا راز کھل جائے گا اور پھر یہ عورت انھیں اپنی شرائط اور منہ مانگی قیمت پر مجبور کرے گی۔ اس لیے وہ اُسی کی طرف سے ملاقات کی خواہش کے اظہار کا انتظار کر رہے تھے اور جوں ہی یہ

سوال کیا گیا انھوں نے یہ تأثر دیتے ہوئے کہ وہ بھی اپنی پرانی دوست سے ملنے کو بے چین ہیں، فوراً آمادگی ظاہر کردی۔

روبینہ اب بھی سلم، اسمارٹ اور اسی طرح پُرکشش تھی۔ انھوں نے ملاقات کا آغاز اسی فقرے سے کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے آج ان کی توجہ کسی اور چیز پر نہیں بس ایک ہی نکتے پر مرکوز تھی۔ روبینہ بچی کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ بچی بہت معصوم اور پیاری تھی، لیکن اسے دیکھ کر اُن کی وحشت بڑھ گئی تھی۔ وہ ہو بہو اُن کی چھوٹی بیٹی جیسی تھی، جیسے بنانے والے نے دو صورتیں ایک جیسی بنائی ہوں، دونوں میں اگر کوئی فرق تھا تو بس چار پانچ برس کی عمر کا تھا۔ سارا خاندان کہتا تھا کہ وہ شیخ مجیب عالم کی ٹرو کاپی ہے۔ یا خدا! اگر یہ بچی اُن کی بیٹی کے ساتھ بٹھا دی جائے تو کسی ڈی این اے ٹیسٹ کے بغیر ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ شیخ مجیب عالم کے پیٹ میں ایک بگولا سا گھوم گیا۔

ملاقات گھنٹے بھر سے جاری تھی۔ کافی، اسنیکس، باتیں، مذاق، قہقہے سب کچھ ہو چکا، لیکن روبینہ کے ہونٹوں پر وہ بات اب تک نہیں آئی تھی، جس کے شیخ مجیب عالم منتظر تھے۔ وہ خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہے تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اس دوران میں اس عورت نے ان سے جتنی باتیں کی ہیں، وہ سب کی سب اس خبر کے ان پر اثر کا اندازہ لگانے کے لیے کی گئی ہیں اور یہ قیاس کرنے کے لیے کہ وہ اس بلیک میلنگ میں ان سے کتنی رقم بٹور سکتی ہے۔ خیر، انھوں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ اس سے بہت اطمینان سے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کئی بار اس بات کو دُہرایا تھا کہ وہ ان دنوں مالی بحران کا شکار ہیں۔ پہلے ایک کاروبار میں بڑی رقم لگا کر نقصان اٹھایا، اس کے بعد والدہ اور پھر بیوی کی بیماری پھر کچھ اور خاندانی مسائل نے انھیں مالی تنگی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس پر روبینہ نے افسوس کا اظہار کیا اور دعا کی کہ وہ جلد اس کرائسس سے نکل آئیں۔ آخر گھڑی دیکھتے ہوئے وہ بولی، ''اب چلنا چاہیے۔ مجھے تو ابھی راستے میں پنکی کے لیے کچھ خریداری بھی کرنی ہے۔''

''اچھا دیکھ لیجیے، جیسے آپ کی مرضی۔'' شیخ مجیب عالم نے بھی گھڑی دیکھی۔

''آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں آپ سے ملنا کیوں چاہتی تھی؟''

شیخ مجیب عالم کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ انھوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے قہقہہ لگایا اور بولے، ''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ مجھے معلوم ہے، آپ کا دل چاہا کہ ملاقات ہو، جیسے میرا دل چاہ رہا تھا اور بس آپ آ گئیں۔''

روبینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی، ''اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔''

شیخ مجیب عالم کے دل کی حرکت ایک دم آہستہ ہو گئی۔ انھوں نے گہرا سانس لیا اور بولے، ''اچھا — وہ کیا؟''

''میں پنکی کو آپ سے ملانا چاہتی تھی۔''

''پنکی بہت پیاری بچی ہے۔ اس سے مل کر بہت اچھا لگا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس سے ملاقات کروا دی۔''

پنکی اُن دونوں سے بے نیاز اپنی ماں کے موبائل پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھی۔

''میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔'' روبینہ ایک لمحے کے لیے رُکی۔ شیخ مجیب عالم اسے سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر بولی، ''اصل میں اگلے ہفتے ہم لوگ کینیڈا جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' شیخ مجیب عالم کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

''امیگریشن کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا، وہ مل گئی ہے۔ سب کام ہو گئے ہیں، بس اب اگلے ہفتے ہم لوگ وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔''

''اچھا — پوری فیملی — ہمیشہ کے لیے؟''

''جی!'' روبینہ کی آنکھیں اُن کے چہرے پر تھیں۔ ''میرا جی چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے کم سے کم ایک بار آپ کی بیٹی کو آپ سے ضرور ملوا دوں۔'' شیخ مجیب عالم کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کہیں۔ وہ مسکرا کے رہ گئے۔

روبینہ خاموشی سے اُن کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ اس کی آنکھیں ان کے چہرے پر رُکی رہیں۔ شیخ مجیب عالم کو لگا جیسے کتنے برسوں سے وہ اُن کے چہرے کو تکے جا رہی ہے اور کوئی دروازہ تلاش کر رہی ہے جو اُسے اُن کے اندر لے جا سکے۔

گھڑی دیکھتے ہوئے روبینہ اٹھی لیکن پھر فوراً ہی بیٹھ گئی۔ ''ایک بات اور کہنی تھی آپ سے۔ میرے پاس کچھ تھوڑے سے پیسے ہیں۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر مجھے ٹیکسٹ کر دیجیے، آن لائن ٹرانسفر کرا دوں گی۔ آپ فنانشلی کچھ پریشان لگ رہے ہیں ان دنوں۔ بہت زیادہ تو نہیں ہیں، شاید پچیس لاکھ تک میں ٹرانسفر کرا دوں گی آپ کے اکاؤنٹ میں۔ کچھ آسانی ہو جائے گی آپ کو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شیخ مجیب عالم بالکل گنگ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اُس نے اُن سے ہاتھ ملایا اور بچی کا بازو تھام کر چل دی۔ شیخ مجیب عالم کچھ کہنا چاہتے تھے، اس کے ساتھ ہی وہاں سے اٹھنا چاہتے تھے، لیکن انھیں لگا وہ گھٹنوں تک زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔

''شوخ شاعر''

ایک شوخ شاعر کسی مشاعرے میں مائک پر کہنے لگے کہ مَیں نے جب پہلی دفعہ نعت لکھی تو سرکار نے مجھے مدینے بلا لیا۔
مَیں نے دوسری نعت لکھی سرکار نے دوسری دفعہ مدینے بلا لیا۔
تیسری نعت لکھی سرکار نے تیسری دفعہ مدینے بلا لیا۔
سامعین میں سے آواز آئی:
"جناب کبھی حمد بھی لکھ کر دیکھیں"۔

نمائش پسندی کے دور میں ادب

مبین مرزا

ویسے تو خیر ابھی خدا جانے اور کیا کیا سامنے آنا ہے، لیکن اس اکیس ویں صدی کے بارے میں اتنی بات تو پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ یہ نمائش پسندی کا زمانہ ہے۔ یہ اس عہدِ جدید کی انسانی زندگی کی وہ حقیقت ہے کہ جسے جھٹلانا تو رہا ایک طرف، چھپانا تک ممکن نہیں۔ خود کو نمایاں کرنے کی خواہش بھی یوں تو انسانی فطرت میں داخل ہے، لیکن آج ہم جس سطح پر اس کا اظہار دیکھ رہے ہیں، اس کی کوئی توجیہہ یا کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ وہ بنیادی عنصر ہے جو اس دور کے انسانی مزاج اور اس کے رویوں کی تشکیل میں سب سے اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اب کوئی اور مانے یا نہ مانے، ہم ادیب شاعر لوگوں کو تو بہر حال یہ سچائی تسلیم کیے ہی بنے گی۔

نمائش پسندی ایسی کوئی نئی چیز نہیں ہے کہ جو اس سے پہلے کبھی تھی ہی نہیں اور اچانک اس دور میں پیدا ہوگئی۔ نہیں، بہت پرانی ہے یہ، شاید قابیل کے زمانے سے چلی آتی ہے۔ تاہم پہلے کے زمانوں اور معاشروں میں اس کا تناسب وہ نہیں تھا جو آج ہے۔ اب سے پہلے معاشرے کے کچھ فی صد لوگ اس میں مبتلا ہوتے تھے، لیکن آج یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید کچھ فی صد ہی بہ مشکل اس سے بچ پاتے ہوں۔ آج یہ کسی ایک خطے یا سماج کا مسئلہ بھی نہیں ہے، بلکہ چھوت چھات سے پھیلنے والے جراثیم کی طرح نمائش پسندی بھی ایک ایسی وبا ہے جو اس دور میں فرسٹ ورلڈ کی اقتداری اشرافیہ سے لے کر تھرڈ ورلڈ کے مفلس اور مجہول افراد تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ اس پھیلاؤ میں بڑا اہم حصہ ہے الیکٹرونک میڈیا کا اور اس سے بھی کہیں بڑا اور مؤثر کردار ہے سوشل میڈیا کا۔ ثبوت کے لیے ترقی یافتہ ممالک سے لے کر پس ماندہ اقوام تک سیاسی، سماجی، علمی حتیٰ کہ مذہبی منظرنامے تک جہاں چاہے نظر ڈال لیجیے، پے در پے مثالیں دستیاب ہوں گی، اور وہ بھی کسی چھان پھٹک کے بغیر۔

انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق و اقدار کا یہ طول طویل سفر آخر کیوں اور کیسے ایک ایسی ڈگر پر آنکلا کہ اس کی منزل ہی بدل جائے، یہ ایک الگ اور تفصیل طلب سوال ہے۔ اس کے لیے آپ کو ماضیِ قریب میں گزرے بیانیے، مہابیانیے اور حال میں جاری مابعد نوآبادیاتی تناظر تک بہت کچھ سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ سب چیزیں یک جا اور اپنی کلیت میں ہی ان حقائق کو واضح کرسکتی ہیں جو اس عہد کے انسان اور اس کی روح کا احوال ہمیں سنائیں۔ تاہم اس امر کو مسلسل نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان سب بیانیوں، مہابیانیوں اور اس مابعد نوآبادتی تناظر میں بھی سب کچھ سچائی پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں بھی بہت جھوٹ اور کھوٹ ہے، لیکن اس کو دیکھے پرکھے بنا اور مکمل چھان بین کے بغیر اُس سچ تک نہیں پہنچا جاسکتا جو اس عہد کے اصل انسان سے ہمیں ملا دے۔ نمائش پسندی کے اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ دراصل اس سچ کی تلاش ہی تو ہے۔ سچ جو آج مفقود ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو سات پردوں کے پیچھے اور بڑی مخدوش حالت اور معمولی حیثیت میں۔

یوں دیکھا جائے تو ادب و شعر، بلکہ جملہ فنونِ لطیفہ کا سارا کاروبار ہی اظہار کی خواہش سے تعلق رکھتا ہے۔ اب یہ اظہار کی خواہش کیا ہے؟ اس کے پیچھے بھی تو خود کو سامنے لانے یا نمایاں ہونے کی جستجو ہوتی ہے، یعنی وہی نمائش پسندی۔ نہیں، بالکل نہیں۔ نمایاں ہونے کی خواہش اور نمائش پسندی میں بہت فرق ہے۔ فن کار خود کو جب نمایاں کرتا ہے تو وہ اپنی ذات کو نہیں، اپنے فن کو سامنے لاتا ہے۔ اپنے جذبے، احساس، خیال اور شعور کو ابھارتا ہے۔ ذاتی طور پر تو وہ کہیں پس منظر میں ہوتا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس کے جذبہ و شعور کی تشکیل و تعمیر میں ایک حصہ اس کے عہد کا، اس کی تہذیب اور سماج کا بھی ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو فن کار اور اس کا معاشرہ دونوں جانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح فن کار کے نمایاں ہونے میں ایک طرف عصری شعور نمایاں ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ ازلی ابدی حقیقتیں بھی اس کے یہاں راہ پاتی ہیں جو نوعِ انسانی کی تجربی صداقتوں کو عہد بہ عہد آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اب اگر شیکسپیئر ایک مرحلے پر ہیملٹ سے کہلاتا ہے:

To be, or not to be, that is the question.

تو بہ ظاہر یہ ایک کردار کی الجھن ہے جس کا ایک مفہوم وجودی سطح پر بھی ہے، لیکن اصل ابتلا تو انسان کے شعور و احساس پر گزرتی ہے جو اس سے یہ اظہار کراتی ہے۔ اس کا بیان آگے چل کر اٹھائیس تیس سطروں بعد آتا ہے، جب وہی کردار یہ کہتا ہے:

Thus conscience does make cowards of us all.

ٹھیک ہے، یہ ایک فن کار کا اظہار ہے، اور بے شک وہ یہاں نمایاں بھی ہو رہا ہے، لیکن ذرا رکیے اور دیکھیے کہ یہاں اُس کی ذات ابھر رہی ہے یا پھر حیاتِ انسانی کی وہ سچائی کہ جس کا تجربہ اپنے اپنے زمانوں میں نسل در نسل لوگ کرتے چلے آئے ہیں۔ اب اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں سمجھنا چاہیے کہ فن کار کی نمایاں ہونے والی خواہش کا یہ وہ اثباتی رخ ہے جو دراصل ایک انسانی صداقت کو ابھارتا ہے، فن کار کی ذات کی نمائش کا ذریعہ نہیں بنتا۔ اب دیکھیے، میر صاحب کہتے ہیں:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ذرا بتایئے تو سہی کہ آخر اس میں میر صاحب کی ذات کتنی نمائش پسند محسوس ہو رہی ہے۔ اچھا چلیے، یہ تو شعر ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ جس میں بات ساری

توجہ حاصل کر لیتی ہے اور فن کار کی ذات خود ہی نظروں سے محو ہو جاتی ہے۔ لیجیے، یہ شعر دیکھیے:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

یہاں تو فن کار سرتاپا ہمارے سامنے ہے کہ ساری بات اس نے خود کو بنیاد بنا کر کی ہے، کیا یہاں اس کی ذات کی نمائش ہو رہی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہاں بھی آپ کی تمام تر توجہ زنداں پر، جنوں اور اس کی شورش پر مرکوز ہو جاتی ہے، فن کار کی ذات تو پھر کہیں پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اس طرح اوجھل ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا دھیان تک نہیں رہتا۔ بتایئے اب کہ اس میں بھلا کسی نمائش پسندی کا کوئی شائبہ بھی ہے؟ نظیر کا شعر سنیے:

یوں تو ہم کچھ نہ تھے پر مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا

اب غور کیجیے، آگ ہمیں لگائی گئی ہے اور تماشا بھی ہمارے اندر سے نکلا ہے، لیکن دکھائی دے رہے ہیں، انار، مہتاب، آگ اور اس کے بعد کا پورا تماشا، یعنی سب کچھ نظر آ رہا ہے، لیکن نظر نہیں آ رہے تو بس ایک ہم۔ وجہ یہ ہے کہ اظہار، ابلاغ اور شناخت حاصل کرنے اور نمایاں ہونے کے سارے عوامل اپنی جگہ، لیکن ادب و فن میں نمائش پسندی کے لیے رتی برابر گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ دراصل اُن کے مزاج، ان کی فطرت کے منافی ہے۔ یہاں تو صرف خیال، احساس اور شعور نمایاں ہوتا ہے۔

اب رہی بات ادیب کی خودمرکزیت، اظہار پسندی اور عینیت کی تو ہمیں صاف صاف لفظوں میں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تو ادیب کی شخصیت کے لازمی عناصر ہیں۔ ان کے بغیر تو وہ ادب تخلیق ہی نہیں کر سکتا۔ ہمارے یہاں غالب کے بارے میں تو بہت لکھا گیا ہے، لیکن ذرا دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ خودمرکزیت اور عینیت جیسی میر کے یہاں نظر آتی ہے، وہ تو غالب سے بھی سوا ہے، اور ایسا صرف ہمارے یہاں نہیں ساری دنیا میں ادب و شعر تخلیق کرنے والوں کا ایسا ہی معاملہ رہا ہے اور ہمیشہ سے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے کے جس حصے سے سطورِ گزشتہ میں لائن نقل کی گئی اسی میں وہ ایک جگہ کہتا ہے:

There's the respect that makes calamity of so long life.

اسی طرح آپ رومانٹک پوئٹری کے پورے عہد کو انگریزی میں دیکھ لیجیے۔ بائرن، ٹینی سن، شیلے، کیٹس، ورڈز ورتھ کون ان میں سے خود پسند اور شہرت کا خواہاں نہیں تھا۔ خود پسندی اور شہرت و جاہ کی خواہش کا عالم یہ کہ آپ کہہ اٹھیں کہ الاماں! ایک فلاں کی کھوپڑی میں شراب پینا چاہتا ہے، دوسرا شیکسپیئر کو پیچھے اپنی گرد میں دیکھنا چاہتا ہے، تیسرے کا دماغ یہ کہ وہ اس مقام پر ہو کہ کوئی اسے اپنا دوست کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ آپ کہیں گے، یہ نفسیاتی مسئلہ ہے۔ ٹھیک ہے، لیکن ادیب شاعر اعصابی سطح پر نارمل آدمی ہوتا بھی کب ہے۔ ایک حد تک یہ ابنارملیٹی ہی تو اصل میں اس کے اندر وہ احساس پیدا کرتی ہے جو اسے اظہار کی اعلیٰ سے اعلیٰ تر سطح کی طرف لے جاتا ہے۔ سلیم احمد نے اقبال کی شاعری کو خوفِ مرگ سے لڑنے کا حاصل بتایا تھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایک اقبال ہی کیا، دنیا کے کس بڑے شاعر نے شہرتِ عام و بقائے دوام کی آرزو کا چراغ دل میں روشن نہیں رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ برائی اس خواہش میں نہیں ہے، بلکہ خواہش کا محور بدل جانے میں ہے۔ اگر یہ آرزو فن کار کے فن کو بلندی کی طرف لے جا رہی ہے تو بڑی کارآمد شے ہے، لیکن اگر یہ اس کا دھیان فن سے ہٹا کر دنیا کی طرف لگا دے تو پھر وہ فن کار نہیں، دنیا کا کتا بن کر رہ جاتا ہے۔

عہدِ جدید میں نمائش پسندی کا رویہ کوئی اثباتی پہلو نہیں رکھتا۔ عام آدمی کو تو چھوڑیے، یہ فن کار کے اندر بھی کوئی کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اُس کے دل میں فنی برتری کی خواہش پیدا کر رہا ہے اور نہ ہی تکمیلیت کے جذبے کو بیدار کر رہا ہے۔ یہ اسے اپنے فن کے بارے میں تو کچھ سوچنے کی تحریک دیتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس اس کی توجہ اپنی ذات پر مرکوز کرتا ہے، اور ذات کے بھی وجودی اور خارجی رخ تک۔ پہلے یہ کام اداکاروں کی زندگی میں ہوتا تھا۔ وہ فیس ویلیو کے لوگ سمجھے جاتے تھے اور اسی پر ان کی ساری ساکھ اور کیریئر کا انحصار ہوتا تھا۔ کمرشلائز ہونے والے کھیلوں کے کھلاڑی بھی بعد ازاں فیس ویلیو کے حامل ہو گئے۔ ان کی شخصیت بھی اسی پہلو سے نمایاں ہونے لگی۔ عہدِ جدید کے اس مظہر نے جس کا نام سوشل میڈیا ہے، آج ادیب اور شاعر کو بھی اداکاروں اور کھلاڑیوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ مشاعرے کے عروج کے زمانے میں تو ہمارا شاعر پھر بھی کچھ نہ کچھ نمایاں اور پاپولر ہونے والی شخصیت کا مالک تھا، لیکن افسانہ نگار اور نقاد تو کبھی اس چکر میں ہی نہیں پڑے تھے۔ سوشل میڈیا کا ریلا آج ان کو بھی بہا لے جانے کے درپے ہے۔

بات ادیب، شاعر اور نقاد تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ عہدِ جدید کے اس چلن نے تو ایک سادہ لوح اور عام آدمی کے اندر بھی اداکار اور کھلاڑی کا التباس پیدا کر کے، اسے ذاتی اور وجودی نمائش میں اس طرح مبتلا کیا ہے کہ اسے یہی سماجی زندگی کا مقصود و منتہیٰ معلوم ہو رہا ہے۔ خارجی اظہار کا یہی رویہ اب اصل زندگی سمجھا جا رہا ہے۔ اس ریلے کا بہاؤ اس قدر شدید، بلکہ طوفانی قسم کا ہے کہ آپ ترقی یافتہ اور خوش حال معاشروں کے ساتھ پس ماندہ ملکوں کے عوام کو بھی اس میں اُسی طرح بہتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، بلکہ مؤخر الذکر زیادہ شد و مد سے اس میں مگن نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقی زندگی میں کمی اور محرومی کی تلافی اس کے ذریعے کرنے کے خواہاں ہیں۔ ظاہر ہے، وہ تو ہرگز ممکن نہیں ہے، لیکن آدمی کا دھیان وقتی طور پر یہ خارجی مشاغل ان سے ہٹا ضرور دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آدمی جب کبھی پلٹ کر حقیقی زندگی اور اس کے مسائل کا سامنا کرتا ہے تو اس کی تلخی میں اضافہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ فرسٹریشن میں

اضافے کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ جدید کی ان اشیا اور مشاغل نے آدمی کی زندگی میں ایسا دھوکا پیدا کیا ہے کہ جب اس کی اصلیت کھلتی ہے تو زندگی کی لایعنیت، محرومی، تنہائی اور اداسی کا احساس ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جاتا ہے۔ چناں چہ آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ذہنی امراض اور خودکشی کے رجحان میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہورہا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا کے ذریعے لوگ مستقل ایک بھری پری محفل میں خود کو پاتے ہیں۔ ہر وقت رونق کے مرکز میں اور آوازوں کے ہجوم کے درمیان، لیکن حقیقی زندگی میں ایک محلے، بلکہ ایک گھر میں رہنے والے لوگوں کے مابین بھی اتنے فاصلے پیدا ہوگئے ہیں کہ آدمی سے آدمی کی ملاقات ہی نہیں ہو پاتی، ایک کی آواز دوسرے تک پہنچتی ہی نہیں۔ جب بیماری، آزاری یا کسی اور وجہ سے حقیقتاً آدمی کو آدمی کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارا مجمع تو اس کے موبائل، ٹیبلٹ یا لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھا، اصل میں تو وہ تنہائی اور سناٹے کی لپیٹ میں ہے۔ اس کے عملی مظاہرے آئے دن دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک شخص کی علالت کی خبر پر عیادت کرنے والوں کی تعداد تو بہت ہوتی ہے، لیکن اس کے پاس آ کر، اس کا ہاتھ تھام کر اپنے رشتے کی حرارت کا احساس دلانے والے پانچ فی صد بھی نہیں ہوتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رشتے اور تعلقات بھی اس عہد کے انسان کی خارجی زندگی کا دکھاوا ہو کر رہ گئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس دور میں ادیب اور شاعر کیا کرسکتے ہیں؟ سچ پوچھیے تو ادیب شاعر ہی وہ لوگ ہیں جو نمائش پسندی کے اس اُمڈتے سیلاب کے آگے اپنے معاشرے کو بچانے کے لیے کوئی بند باندھ سکتے ہیں۔ سیاست داں، سول سرونٹس، مصلح، سماجی کارکن، ڈاکٹر، انجینئر سب مل کر بھی وہ نہیں کرسکتے جو کام ادیب شاعر کرسکتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ صلاحیت قدرت نے سب سے بڑھ کر انھی کو بخشی ہوتی ہے کہ معاشرے کے تغیرات کے عقب میں کارفرما محرکات کو دیکھ سکیں۔ یہی نہیں، بلکہ ان کی نظر انسانی احساس کی بدلتی ہوئی ان صورتوں کو بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھ سکتی ہے جو اس کے لاشعور اور تحت الشعور میں تہ در تہ پیدا ہوتی ہیں۔ جن کا خود انسان اور اس کے سماج کو بھی کہیں بہت بعد میں جا کر اندازہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ کام اُس وقت ہوسکتا ہے جب ادیب شاعر کو اس عہد میں اپنے کردار کے تقاضے اور فن کے مطالبے کا شعور ہو۔ یہ شعور اس کے اندر اس نمائش پسندی سے اغماض پیدا کرتے ہوئے اس کی ذہنی، فکری اور تخلیقی شخصیت کو متحرک کرے گا اور معاشرے میں اپنے اصل کردار کی طرف مائل۔

بقیہ : زندہ فرد کی تلاش

''کیوں موت نظر آرہی ہے تجھے؟ کچھ نہیں ہے ایسا، ٹھیک ہوجائے گا سب۔''

''کیا ٹھیک ہوجائے گا، کیسے ٹھیک ہوجائے گا؟ فرشتے آئیں گے کیا آسمان سے ٹھیک کرنے کے لئے؟'' منوّر نے گود میں رکھی کلاشنکوف کے دستے پر ہاتھ مارا، ''تو دیکھ لینا یہی چھت قبر کا گڑھا بن جائے گی ہمارے لئے اور ہم واقعی وقت کی قید سے آزاد ہوجائیں گے!''

مبین مرزا کے افسانوں میں ہم دورِ جدید کے انسان کو نت نئی صعوبتوں سے نبرد آزما دیکھتے ہیں مگر ہمیں ان کے افسانوں میں واقعاتی اکہرا پن نہیں ملتا بلکہ ایسی فکری بصیرت کا احساس ہوتا ہے جس کی بنیاد ہست و بود کی گتھیوں کو سلجھانے والے سوالات پر ہوتی ہے۔ 'طلسمی دوڑ' نامی افسانے میں یہ سوال کہ آدمی مرتا کیوں ہے، عجیب عجیب طریقے سے سامنے آتا ہے، جیسے کچھ لوگ اتنی جلدی کیوں مرجاتے ہیں، یا سب لوگ ایک ہی وقت پر کیوں نہیں مرتے؟ سوال ہی سوال۔ مبین مرزا نے زندگی کو ایک دوڑ قرار دیا ہے جس میں شامل ہونے والے کی دوڑ ختم ہونے پر اس کی جگہ اس کی اولاد اس دوڑ میں شریک ہوجاتی ہے۔ یہ موت تک پہنچنے کی دوڑ ہے۔ مبین مرزا کی کہانیاں اس طلسمی دوڑ میں شامل افراد کے روز و شب کا عکس پیش کرتی ہیں جو زندگی کے آشوب کی پرچھائیوں میں گزرتے ہیں، سماجی ناانصافیوں کے آشوب اور اندرونِ ذات کے آشوب۔ مگر وہ ہیں کہ جیے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے 'یہی تو ہے زندگی' کی نتاشہ اپنی ماں سے کہتی ہے، ''ہاں مما یہی تو ہے زندگی، بس ہمت سے جیے جانا ہوتا ہے!'' زندگی کا یہی وہ منشور ہے جس کا پرچار مبین مرزا نے اپنے افسانوں میں کیا ہے۔

مبین مرزا اپنے کرداروں کے حلیے اور ماحول کو پوری توجہ سے ترتیب دیتے ہیں جس ان کے گہرے مشاہدے اور زندگی کی پیچیدیوں سے پوری واقفیت کا پتہ چلتا ہے اور شہروں اور گلی کوچوں کے بیان کی تفصیل اور ماحول کی جزئیات پر ان کی عمیق نظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ مصور ہوتے تو بھی بہت کامیاب رہتے۔ ان کا طویل افسانہ 'قید سے بھاگتے ہوئے' افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی ان تمام خوبیوں کا منفرد شوکیس ہے۔ وہ ایک منفرد تخلیق کار ہیں اور افسانے کے علاوہ شاعری کے میدان میں بھی حیرت ناک جوہر کا مظاہرہ کرچکے ہیں۔ اردو شعر و ادب کے مستقبل کو ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

''غازۂ حمد و نعت''

حمدِ باری تعالیٰ

حمد گوئی شعار کرتا ہوں
حرف کو باوقار کرتا ہوں

کتنا ناداں ہوں رحمتوں کو تری
اُنگلیوں پر شمار کرتا ہوں

تُو جو کرتا ہے بار بار معاف
میں خطا بار بار کرتا ہوں

اس قدر عفو پر ہے تیرے یقیں
حشر کا انتظار کرتا ہوں

نام اللہ ہی اسمِ اعظم ہے
میں خزاں کو بہار کرتا ہوں

حمد ہے بحرِ بے کنار اے حرف
میں تجھے بے کنار کرتا ہوں

رنگِ وحدت ہے جو میں کثرت سے
حمد میں آشکار کرتا ہوں

میں اداؤں سے حمد کی یارت
منکروں کو شکار کرتا ہوں

غازۂ حمد و نعت سے قیصرؔ
زندگی کا سنگھار کرتا ہوں

قیصر نجفی
(بھارت)

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

منزلوں کا نشاں، راستوں کا بھرم
اُنؐ کا نقشِ قدم، اُنؐ کا نقشِ قدم

کوئی اُنؐ سا نہ تھا، کوئی اُنؐ سا نہیں
کوئی اُنؐ سا نہ ہو گا، خدا کی قسم

ذکر ہو آپؐ کا، ذکر ہو آپؐ کا
ذکر ہو آپؐ کا اور نکل جائے دم

آپؐ کے پیار کا اس قدر ہو اثر
لکھے ہر دم محمدؐ محمدؐ قلم

آپؐ کا دھیان اگر ساتھ ہو دُور ہوں
جسم کے سارے دُکھ، روح کے سارے غم

بندگی کی ہے انجم یہی انتہا
سر ہو سجدے میں اور آسمانوں میں ہم

انجم جاوید
(لاہور)

اتوار کا دن تھا ہم سب ناشتہ کر رہے تھے۔امّی مجھ سے مخاطب ہوئیں ''شارمین! آج تمہیں کچن میں میرا ہاتھ بٹانا ہوگا رات کے کھانے پر افتخار بھائی اور عذرا آ رہے ہیں''

''امّی! یہ لوگ بہت دنوں کے بعد آ رہے ہیں نا۔۔۔؟''

''ہاں!''امّی نے مختصر سا جواب دیا۔

''بھئی کھانے میں ریشمی کوفتے ضرور ہونا چاہیے تمہارے ہاتھ کے ریشمی کوفتے افتخار کو بہت پسند ہیں۔''ابّو نے امّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہوا آپ نے یاد دلا دیا ورنہ مجھے تو خیال ہی نہیں تھا''امّی نے کہا۔

افتخار انکل اور ابّو ہائی اسکول سے ایک دوسرے کے دوست تھے اور یہ دوستی اب تک چل رہی تھی۔امّی نے ان کی ضیافت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی خود بھی خوب تھکیں اور مجھے بھی تھکایا۔

دوسرے دن میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔امّی صوفے پر آ کر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا اور بولیں:

''افتخار بھائی اور عذرا تمہارا رشتہ لے کر آئے تھے،اپنے بیٹے فیصل کے لیے۔فیصل کینیڈا ماسٹرز کرنے گیا تھا۔ماسٹرز کرنے کے بعد اسے ٹورانٹو میں اچھی جاب مل گئی اور وہ وہیں کا ہو گیا۔تھوڑے توقف کے بعد پھر بولیں وہ ہمارے گھر کئی مرتبہ آیا ہے،تم نے اسے دیکھا ہے۔پھر بھی وہ تصویریں دے گئی ہیں، دیکھ لینا۔ایک مہینے کی چھٹی لے کر وہ پاکستان آ رہا ہے۔اسی دوران وہ لوگ نکاح،شادی،رخصتی سب کرنا چاہتے ہیں۔''

''امّی! اتنی جلدی۔۔۔میں چیخ پڑی''اور بولی:

''ہرگز نہیں۔۔۔مجھے آگے پڑھنا ہے۔۔۔آپ منع کر دیں''میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔تمہارے ابّو نے''ہاں''کر دی ہے۔تصویریں دیکھ لینا''امّی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہماری شادی ہو گئی۔۔۔دونوں خاندانوں کی طرف سے پہلی شادی تھی۔بڑی دھوم دھام رہی۔شادی کے بعد بھی اتنا مصروف وقت گزرا کہ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔دعوتیں،گھومنا،پھرنا،شاپنگ اور پھر فیصل کے جانے کا وقت آ گیا اور وہ کینیڈا واپس چلا گیا۔

تقریباً چھ ماہ میں میرے پیپرز مکمل ہو گئے۔ویزا مل گیا اور میں کینیڈا پہنچ گئی۔سچ پوچھئے تو مجھے امریکہ،کینیڈا وغیرہ جانے کا بالکل شوق نہیں تھا مجھے اپنا ملک پاکستان بہت پسند ہے اور میں وہیں رہنا چاہتی تھی۔قسمت مجھے کینیڈا لے آئی۔لیکن یہاں آ کر مجھے بہت اچھا لگا تھا۔صاف ستھرا،ہرا بھرا شہر،لوگ بھی تقریباً سب ہی اچھے ہیں۔جھوٹ نہیں بولتے،وعدہ خلافی نہیں کرتے۔جھوٹی تعریفیں کر کے اپنا مال نہیں بیچتے،بھروسہ کرتے ہیں۔اپنی بات پر قائم رہتے ہیں، آگے بڑھ کر دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور سب سے اہم بات اپنے ملک کے قانون کا احترام کرتے ہیں۔

میں سوچ رہی تھی''ان لوگوں نے مسلمانوں کی ساری اچھائیاں لے لی ہیں''

ایک دن میں حنا کے ساتھ بازار گئی اس نے سعید بھائی کے لیے کئی شرٹیں خریدیں،اپنے لیے بھی بہت سے ڈریسز لئے میں نے حنا سے پوچھا''تم اتنے سارے کپڑے ایک ساتھ کیوں خرید رہی ہو''کہنے لگی:

''سب تھوڑی خریدوں گی۔گھر جا کر پہن کر دیکھوں گی جو ڈریس پسند آئے گا رکھوں گی باقی واپس کر دوں گی۔واپسی کی جلد بھی نہیں ہے۔تین ہفتے واپسی کی مدت ہے''یہ سن کر میں حیران رہ گئی پاکستان میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

فیصل بہت کم بولتا۔کتنی ہی باتوں کا تو جواب ہی نہیں دیتا۔اس کے دوستوں کا حلقہ بھی محدود تھا۔چھ سات خاندان تھے انہی کے گھر آنا جانا تھا۔ہم عمروں میں سعید بھائی اور حنا ہمارے گھر کے بہت نزدیک رہتے تھے۔میری حنا سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔سعید بھائی بھی مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتے تھے۔فیصل بھی ان دونوں سے بہت بے تکلف تھا۔دونوں میرا اور فیصل کا بہت خیال رکھتے تھے۔مجھے یہاں کے طور طریقے سکھانے میں حنا کا بڑا ہاتھ ہے۔عبیرہ اور احسن کی پیدائش پر بھی دونوں نے بہت ساتھ دیا تھا۔فیصل کو اور مجھے کہیں جانا ہوتا تو ہم دونوں بچوں کو حنا کے پاس چھوڑ دیتے۔حنا خوشی خوشی رکھتی اور بچے بھی اس کے پاس بہت خوش رہتے۔

پھر میں نے محسوس کیا فیصل کچھ دنوں سے ان لوگوں کو ناپسند کرنے لگا ہے۔اکثر ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ مجھ سے کسی نہ کسی بات پر جھگڑتا۔حنا مجھ سے کہیں ساتھ چلنے کے لیے کہتی تو اس وقت تو خاموش ہو جاتا بعد میں کہتا ''جانے کی ضرورت نہیں کوئی بہانہ کر دو۔شاید اس کا یہ ردِّعمل اس لیے ہو کہ وہ دونوں میرے ساتھ بہت محبت سے رہتے تھے''مجھے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔میں نے فیصل کے دل و دماغ اور روح میں جھانکنے کی کوشش کی مگر مجھے سارے دروازے مقفل ملے۔فیصل جیسے (Interovert) انٹروورٹ آدمی سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔میرے خاندان میں اس جیسا کوئی نہ تھا۔وہ شاید نرگسیت میں بھی مبتلا تھا کیونکہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کے بارے میں سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔وہ اپنے اندر کی خود غرض سوچوں اور مانگوں سے لحظہ بھر نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا شاید نجات کا خواہاں بھی نہیں تھا۔وہ چاہتا تھا ہر بات اس کی مرضی کے مطابق ہو۔گھر کے اندر بھی میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے تو صرف جھگڑتا تھا۔مجھے لڑائی جھگڑے سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔میں اکثر خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔مگر اس پر بھی بات ختم نہیں ہوتی

تھی۔۔۔پھر گالیوں پر آ گیا۔ میں نے اسے سمجھایا''فیصل! مجھے گالیاں سننے کی بالکل عادت نہیں ہے بہت تکلیف ہوتی ہے''لیکن اس کا اثر الٹا ہی ہوا۔۔۔

احسن دو سال کا تھا ہم لوگ پاکستان گئے وہاں میں نے کسی سے بھی فیصل کے اس رویے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔سب ہمارے آنے سے بے حد خوش تھے میں ان لوگوں کی خوشی برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔سب کو یہی ظاہر کیا کہ ''میں بہت خوش ہوں۔''

میں نے فیصل سے بہت کہا مجھے تین چار مہینوں کے لیے پاکستان میں ہی چھوڑ دو، دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں، سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔مگر وہ نہ مانا اور میں ''قید با مشقت'' گزارنے ٹورانٹو پہنچ گئی۔

پاکستان سے آنے کے بعد حالات بہتر ہونے کے بجائے مزید خراب ہوتے گئے۔فیصل نے اب اکثر ہاتھ اٹھانا بھی شروع کر دیا تھا۔میں بچوں کی وجہ سے اس رشتے کو نبھانا چاہتی تھی۔میں کوشش کرتی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے تلخی پیدا ہو۔۔۔اکثر میری تمام کوششیں بے سود ثابت ہوتیں۔ایسا لگتا جیسے وہ جان بوجھ کر یہ سب کر رہا ہے۔

اس دن حنا کے گھر ڈنر تھا۔کافی لوگ جمع تھے کھانے کے بعد چائے، کافی کا دور شروع ہوا اور ساتھ ہی ہنسی مذاق، ایک دوسرے پر جملے کسنا۔۔۔فیصل نے مجھ سے کہا۔

''شارمین! گھر چلو''

میں چلنے کے لیے تیار ہوئی مگر حنا اور سعید بھائی نے ہم لوگوں کو نہیں آنے دیا۔گھر پہنچے تو فیصل کا موڈ بہت خراب تھا۔میں نے بچوں کو ان کے کمرے میں لٹایا اور خود اپنے بیڈ روم میں آ کر سونے کی تیاری کرنے لگی۔فیصل اچانک میرے بال پکڑ کر بولا''جب میں نے کہا تھا گھر چلو تو فوراً کیوں نہیں اٹھیں۔''

''میرے بال چھوڑیں مجھے تکلیف ہو رہی ہے''اس نے مجھے زور سے دھکّا دیا میں بیڈ سے نیچے گر پڑی۔سامنے ہینگر پڑا تھا اس نے اٹھا کر مارنا شروع کر دیا اور پھر مجھے دھکّے دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور خود کمرہ بند کر کے سو گیا۔صبح کب اٹھا۔۔۔کب آفس گیا۔۔۔مجھے نہیں معلوم۔

میں فیملی روم میں آ کر بہت روئی، پھر نجانے کب مجھے نیند آ گئی اور میں صوفے پر ہی لیٹ کر سو گئی۔جب آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔اٹھنے کی کوشش کی۔۔۔اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا پورا جسم درد کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے مسلسل مار رہا ہے۔بچوں کو اسکول بھی نہیں بھیجا۔

پھر ہمت کر کے بمشکل تمام اٹھی۔بچوں کا اور اپنا ضروری سامان سوٹ کیس میں ڈالا اور ٹیکسی بلا کر دونوں بچوں کو لے کر سعید بھائی کے گھر پہنچ گئی۔سعید بھائی گھر پر ہی تھے۔وہ دونوں میری حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ان لوگوں کو ہمارے اندرونی حالات کا بالکل علم نہیں تھا۔بہر حال کسی کو تو یہ سب بتانا تھا۔۔۔سعید بھائی میرے حالات سن کر بہت غصے میں آئے اور بولے:

''ابھی پولیس کو کال کرو۔دماغ صحیح ہو جائے گا۔''

میں نے منع کر دیا۔ابو اور افتخار انکل کی پرانی دوستی کا خیال آ گیا۔

دوسرے دن فیصل آیا اور مجھے گھر چلنے کے لیے کہا۔میں نے کہا ''ایک شرط پر چلوں گی۔''

''کوئی شرط ورط نہیں۔چلنا ہے تو چلو'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔میں خاموش بیٹھی رہی۔وہ تھوڑی دیر کھڑا رہا، پھر چلا گیا۔

میں ایک مہینہ حنا کے گھر رہی۔فیصل دوبارہ مجھے بلانے نہیں آیا۔

سعید بھائی نے مجھے ایک موبائل کمپنی میں ملازمت دلوا دی۔فلیٹ بھی کرائے پر مل گیا۔دو کمروں کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر۔۔۔یہ فلیٹ بلڈنگ ان لوگوں کے لیے مختص تھی جو مظلوم اور بے سہارا ہوں۔یہی وجہ تھی کہ بلڈنگ میں کرایہ بہت کم تھا۔بلڈنگ کا بیک یارڈ بہت خوبصورت تھا۔بڑا سا لان چاروں طرف پھلوں کے درخت پھولوں کے پودے وغیرہ بہت خوبصورتی سے لگائے ہوئے۔۔۔ہمارے ٹی وی لاؤنج کا بڑا سا شیشے کا دروازہ اسی بیک یارڈ میں کھلتا تھا۔اس بلڈنگ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ یہ شہر کے بیچوں بیچ ہے۔اسکول، یونیورسٹی، افسز سب نزدیک۔بچوں کے اسکول میں ایڈمیشنز بھی کر دیے گئے۔ایسا لگا زندگی ایک ڈگر پر آ گئی ہے۔

میرے اور فیصل کے راستے جدا ہو گئے تھے۔وہ بچوں سے فون پر بات کرتا تھا۔کبھی کبھی ان سے ملنے بھی آ تا۔وہ بچوں سے محبت کرتا تھا لیکن بچے اس سے نہ ہی ملنا چاہتے اور نہ ہی بات کرنا چاہتے۔گھر کے حالات نے بچوں کے ذہنوں پر اچھے اثرات مرتب نہیں کیے تھے۔احسن مجھ سے کہتا:

''موم میں بڑا ہو جاؤں ڈیڈ سے آپ کے سارے بدلے لوں گا''

میں دونوں بچوں کو سمجھاتی ''وہ تمہارے ڈیڈ ہیں۔تم لوگوں کو ان کی عزت کرنا چاہیے۔ان سے محبت کرنا چاہیے، ہمیشہ ان کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔وہ بچوں سے ملنے آتا باہر ہی باہر مل کر چلا جاتا۔نہ ہی میں اسے اندر بلاتی اور نہ ہی اس سے بات کرتی۔بچوں کے اسکول میں بھی گارڈین کے طور پر میں نے تنہا اپنا نام لکھوایا تھا۔

بہتے دریا کی مانند وقت گزر رہا تھا۔عبیرہ ہائی اسکول میں آ گئی تھی اور احسن کا مڈل اسکول میں یہ آخری سال تھا۔یہ دونوں بچے میری زندگی، میری کُل کائنات تھے۔میں اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوش تھی۔

ایک دن میں ڈاکٹر سارہ کے آفس اپنی رپورٹس لینے گئی کچھ دنوں سے میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ڈاکٹر سارہ کے کہنے پر میں نے یہ ٹیسٹ کروائے تھے۔رپورٹس دیتے ہوئے ڈاکٹر سارہ نے مجھ سے کہا:

''شارمین! میں جو تمہیں بتانے جا رہی ہوں تمہیں حوصلے سے سننا ہو گا۔''ڈاکٹر سارہ سے میری اچھی دوستی تھی وہ میرے تمام حالات سے واقف تھی۔

''کیا بات ہے جلدی سے بتا دو میرا دل بری طرح دھڑک رہا ہے''

میں نے کانپتی آواز سے کہا۔

''تمہیں کینسر ہے'' یہ سنتے ہی میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔پوری دنیا گھومنے لگی۔ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال ابھرا''میرے بچوں کا کیا ہوگا؟''

ڈاکٹر سارہ نے مجھے بہت تسلی دی اور کہا ''گھبراؤں نہیں۔ سرجری کر کے یوٹرس نکال دیں گے پھر کوئی خطرے کی بات نہیں ہوگی۔''

''مگر کینسر، لفظ ہی ایسا ہے کہ دل دہل جاتا ہے اور زندگی کی ناؤ ڈوبتی نظر آتی ہے۔''

ایسا محسوس ہوا تھا زندگی میں جیسے سکول آ گیا ہے ہم سب خوش اور مطمئن تھے۔۔۔ پھر یہ اتنا بڑا دھماکا۔۔۔ زندگی ایک بار پھر اتھل پتھل ہونے لگی۔

سرجری کی بہت نزدیک کی تاریخ دے دی گئی۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر سارہ ''جلد از جلد یہ سرجری ہو جانا چاہیے۔''

میں نے صرف اپنے نزدیک کے ایک دوستوں کو ہی بتایا تھا جس میں حنا اور سعید بھائی بھی شامل تھے۔ ان دونوں نے ڈاکٹر سارہ نے بھی ڈاکٹر بن کر نہیں دوست بن کر بہت ساتھ دیا۔ سرجری کامیاب رہی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ''کینسر فری'' قرار دے دیا گیا۔ میں بہت خوش تھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا مشکل مرحلہ اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو گیا۔

فیصل کو میری سرجری کا پتہ چلا تو اس نے مجھے ''گٹ ویل سون'' کا کارڈ بھیجا۔ عبیرہ نے میل سے لا کر دیا۔ میں نے ایک نظر دیکھا اور دوسرے کارڈوں میں شامل کر دیا۔ عبیرہ اور احسن نے بھی باپ کے بھیجے ہوئے کارڈ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

سرجری سے قبل رات کو میں اٹھی، کارڈروں میں سے فیصل کے کارڈ کو نکالا اس پر چھپے ہوئے نقش و نگار پر، پھولوں پر اور اس پر لکھے ہوئے ایک ایک حرف پر ہاتھ پھیرتی رہی اور دیکھتی رہی تھی۔۔۔

فیصل کے بارے میں شروع زمانے میں حنا سے معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ بعد میں یہ ہوا کہ وہ میڈیا کا آدمی بن گیا۔ اس کی زندگی کھلی کتاب بنتی گئی۔۔۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین بن چکا تھا۔ اس کا چیری کے کاروبار میں کسی کمپنی سے تعلق تھا۔ پہلے اس نے اس کمپنی میں ملازمت کی۔ بعد میں وہ اس کمپنی میں شریک شیئر ہولڈر ہو گیا۔ ایک جانب اس کمپنی میں شیئر بڑھتے گئے دوسری جانب اس کمپنی نے کاروبار میں تیزی سے ترقی کی اور اپنی حریف کمپنیوں پر سبقت لے گئی۔ فیصل نے بزنس اور کمپنی کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی جو کمپنی کے منافع اور ساکھ کا موجب ثابت ہوئی۔

میں نے محسوس کیا فیصل کے بارے میں بچوں کے رویّوں میں تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ ٹی وی پر جب وہ فیصل کو دیکھتے تو ان کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی۔ بلڈنگ کے لوگوں پر بھی یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ فیصل سے ہم لوگوں کا کیا رشتہ ہے یوں تو اس ملک میں کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا لیکن چونکہ یہ بلڈنگ خاص لوگوں کے لیے بنائی گئی تھی اس لیے کچھ آوازیں اٹھیں۔ میں نے جب یہ محسوس کیا تو بلڈنگ کے لوگوں سے زیادہ سوشلائز کرنے لگی اور جانے انجانے اپنے فارغ اوقات میں بلڈنگ کے رہائشی لوگوں کے لیے ممکنہ فلاحی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

بلڈنگ کے بچوں کے لیے کوچنگ کلاسز اور لڑکیوں کے لیے کڑھائی، سلائی سکھانے کی ابتدا کی۔ احسن اور عبیرہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بلڈنگ کے کچھ لوگ بھی شامل ہو گئے۔ کامیابی نہیں کامیابیاں جیسے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ بلڈنگ میں ہمارے دونوں پراجیکٹ نتیجہ خیز ثابت ہو رہے تھے ایک انقلاب سا بپا ہو گیا تھا۔ بلڈنگ کی خواتین اس کے علاوہ چھوٹے موٹے دوسرے فلاحی کاموں میں بھی مصروف ہو چکی تھیں۔ بے سہارا خواتین سہارا دینے والی خواتین بن چکی تھیں۔

ہم لوگ جلد ہی حکومت کی اجازت سے طالب علموں کے ایک ٹیوشن سینٹر اور لڑکیوں کے لیے سلائی کڑھائی سکھانے کے لیے درسگاہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ قابل اساتذہ سے خدمات حاصل کیں اور اسی طرح سلائی کڑھائی کے لیے مستند، پیشہ ور ماہرین کا انتخاب کیا۔ ان کی تنخواہوں کے لیے مالی اعانت کی اپیلیں کیں۔

ایک دن میڈیا والے ہماری بلڈنگ میں گھس آئے اور میں ان کے گھیرے میں آ گئی۔ میڈیا کا ہر فرد ہماری ہمت، حوصلے اور وژن کی داد دینے کے ساتھ مجھ سے یہ سوال ضرور کر رہا تھا کہ ''آپ کے رفیق حیات کہتے ہیں کہ آپ ''خاتونِ خانہ'' ہیں لیکن ہمیں تو آپ ایسی نہیں لگیں۔''

میں نے ہر کسی سے یہ سوال سنا اور پھر سب سے مخاطب ہو کر ایک مختصر سا جواب دیا ''آپ لوگوں نے خاتون خانہ کا ایسا روپ بھی دیکھ لیا جو آپ نے اس سے پہلے نہیں دیکھا ہوگا۔''

ایک چونکا دینے والے تجربے سے گزرتے ہوئے میں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ معترض تھے وہ بھی ہم سے رابطے کر رہے تھے اور ہمارے کام کی تعریف کر رہے تھے۔ میں بے حد خوش تھی پہلی بار صرف اور صرف اپنی زندگی جینے کے بجائے خلقِ خدا کی زندگی جی رہی تھی۔

حنا اکثر و بیشتر فیصل کا ذکر چھیڑ دیتی۔ اس کے خیال میں فیصل کے بارے میں مجھے سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ وہ کہتی ''دیکھو شارمین یہ کھلی زیادتی ہے جو تم اپنے اور فیصل کے ساتھ روا رکھ رہی ہو۔''

''کیسی زیادتی؟''

''یہ زیادتی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ خود بھی اکیلی ہو اور وہ بھی۔۔۔ اس نے اتنے برس کے بعد بھی شادی نہیں کی۔''

''حنا! تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ وہ دولت کما رہا ہے۔ اسمبلی میں پہنچ گیا ہے۔ سنا ہے کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے۔ اس کو کسی شارمین کی کیا ضرورت ہے۔ نجانے کتنی شارمینیں اس پر واری نیاری ہو رہی ہوں گی۔'' میں نے حنا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

تم کو معلوم ہے میڈیا والے جب فیصل سے پوچھتے ہیں:

''آپ اپنی مسز کو ساتھ لے کر کیوں نہیں چلتے تو وہ کیا جواب دیتا ہے؟''

''ہاں۔۔۔! یہی کہ مسز شارمین فیصل خاتون خانہ ہیں۔'' میں نے

حنا سے کہا۔

''شارمین! پھر بھی۔۔۔'' حنا، فیصل کی وکالت کر رہی تھی۔

حنا میں اور مجھ میں اس ایک ہی انداز کی بحث وتمحیص وقفے وقفے سے ہوتی رہتی تھی۔ سعید بھائی کا موقف بھی حنا کے موقف سے ملتا جلتا تھا۔ دونوں کی یہی خواہش تھی کہ میرے اور فیصل کے درمیان سب کچھ پہلے جیسا ہوجائے۔

اسی دوران سعید بھائی کا ٹرانسفر ہوگیا۔ چھ سات گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ وہ دونوں مجھے چھوڑ کر مانٹریال چلے گئے۔ اتنے مخلص لوگوں کی جدائی مجھے تنہا کر گئی۔ دونوں کی جوڑی بھی خوب تھی۔ انہیں اولاد نہیں ہوئی۔ دونوں میں کوئی نقص بھی نہیں تھا بس اللہ کی رضا کی دیر تھی۔۔۔ لوگوں نے بچہ گود لینے کی تجویز پیش کی مگر دونوں نے انکار کردیا۔ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے خوش تھے اور رضا بہ رضائے الٰہی۔

فیصل کے بارے میں روز بروز میری معلومات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کو شخص سے شخصیت میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس کر کے کبھی کبھی میں یہ سوچنے لگتی کہ یہ وہ فیصل کیسے ہوسکتا ہے جو ایک انتہائی چھوٹے ذہن کا اپنے اندرون میں سکڑا، سمٹا، خودپسند، خودغرض، نرگسیت کا مارا آدمی تھا۔ کسی شخص میں اتنی تبدیلی اتنا واضح مٹامورفوسز (Metamor Phosis) ہونا ناممکن ہے؟

ماہر نفسیات سے علاج۔۔۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے اس کو کسی ماہر نفسیات سے مدد لینے کی چاہت ہی کیوں پیدا ہوئی۔۔۔ مجرم ضمیر۔۔۔ لیکن احساسِ جرم کہاں سے آیا۔۔۔؟

کیا اس کے عقب میں شارمین، تم۔۔۔ تم ہو۔۔۔ کوئی میرے اندر دبی آواز میں کہتا۔۔۔

فون کی گھنٹی بجی۔۔۔ کس کا فون ہوسکتا ہے، یہ نمبر یاد نہیں آ رہا۔۔۔ میں نے نمبر دیکھ کر سوچا۔

''ہیلو!'' میں نے کہا۔

دوسری طرف فیصل کا سیکرٹری تھا، کہنے لگا:

''کل رات فیصل کے دل میں شدید درد کی وجہ سے وہ اسے ہسپتال لے کر آیا ہے۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق اسے ''ہارٹ اٹیک'' ہوا ہے۔ ہوش آنے پر اس نے مجھے بلوا کر تمہیں فون کرنے کے لیے کہا ہے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد بولا ''شارمین! اس وقت فیصل کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''میں ہسپتال پہنچتی ہوں'' میں نے کہا۔

یہ معلوم کر کے وہ کون سے ہسپتال میں ہے، میں نے فون رکھ دیا۔

دونوں بچوں کو ناشتہ دینے کے بعد میں نے بچوں سے کہا ''تمہارے ڈیڈ کی طبیعت خراب ہے، وہ ہسپتال میں ہیں، میں انہیں دیکھ کر آتی ہوں پھر تم دونوں کو لے کر چلوں گی۔ ڈیڈ کی صحت اور زندگی کے لیے دعائیں کرنا۔''

ہسپتال کے راستے میں رک کر میں نے ایک اچھا سا بکے خریدا۔ بکے خریدنے کے دوران میرے وجود کا اندرون فیصل کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ اسی کیفیت میں ڈوبی ہوئی میں ہسپتال پہنچ گئی۔ انکوائری پر ہی فیصل کا سیکرٹری کھڑا مل گیا۔ شاید وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا:

''تم شارمین ہو۔۔۔؟''

''جی۔۔۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے مجھے انتظارگاہ میں بٹھایا اور خود میرے ملنے کے لیے ڈاکٹروں سے اجازت لینے چلا گیا۔ ڈاکٹر کسی کو ملنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ''فیصل کی حالت ٹھیک نہیں ہے، وہ بار بار بے ہوش ہو رہا ہے ہم کوشش کر رہے ہیں۔''

سیکرٹری کے بہت اصرار پر مجھے چند لمحوں کے لیے ملنے دیا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی فیصل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر کہا ''شارمین! واپس آجاؤ''

وہ بے حد کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پیشانی پر سے اس کے بالوں کو ہٹایا۔ پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میری آنکھوں سے بھی مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اتنے میں کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر ہیریسن داخل ہوئے۔ مجھے باہر جانے کے لیے کہا گیا۔

میں باہر جا کر کھڑی ہوگئی۔ میرے ہونٹ متحرک تھے میں دل ہی دل میں بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز ہو کر فیصل کی درازیٔ عمر کی بھیک مانگ رہی تھی۔

باہر نکل کر میں نے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فون پر بچوں سے بات کی۔ بچے اپنے ڈیڈ کی حالت پوچھتے ہوئے رو رہے تھے۔ بچوں نے بتایا ''حنا اور سعید بھائی وہاں پہنچ گئے ہیں۔'' حنا نے مجھ سے بات کی ''شارمین حوصلہ رکھو۔ میں ہسپتال آ رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ سعید بچوں کا خیال رکھیں گے۔'' بچے ہسپتال آنے کی بہت ضد کر رہے تھے۔ میں نے سمجھایا ''جیسے ہی ڈاکٹر فیصل سے ملنے کی اجازت دیں گے میں تمہیں فوراً بلوا لوں گی۔''

حنا آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں بھی اس کے گلے لگ کر خوب روئی۔ حنا نے بتایا کل رات فیصل کے سیکرٹری نے ہمیں فون کر کے بتایا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر ہم لوگ یہاں آنے کے لیے نکل گئے تھے۔

''میڈم آپ کے شوہر کی حالت کافی بہتر ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لیے خود ہی کوشش کر رہا ہے۔ اس کو نیند کا انجکشن لگا دیا ہے، وہ سو رہا ہے۔ آپ اسے باہر سے دیکھ سکتی ہیں۔ اندر مت جانا۔'' ڈاکٹر ہیریسن کہتے ہوئے چلے گئے۔

''میں نے باہر سے کھڑے ہو کر فیصل کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔''

حنا نے میرے ساتھ ہسپتال میں رات گزاری۔ صبح ڈاکٹر نے یہ خوشخبری سنائی کہ ''فیصل کو وارڈ میں شفٹ کیا جا رہا ہے۔ اب فیصل کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

فیصل کی، میری اور بچوں کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا تھا۔ میرے کہنے پر فیصل نے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا ''فیصل شارمین ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ'' کے نام سے۔ میں نے بلڈنگ والے سارے کام جاری رکھے تھے بلکہ فیصل نے ان کو مزید وسعت دے دی تھی۔

اسلام پور قومی شاہراہ کے دونوں طرف بسی ایک ترقی پسند بستی ہے۔ بستی میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے دو پرائمری و ایک جونیئر ہائی اسکول کے علاوہ مسجد سے سٹا دینی مدرسہ بھی ہے۔ شاہراہ سے ملحق حصے میں سڑک کے دونوں طرف بہت سی دُکانیں ہیں۔ اِن میں کپڑے ، جوتے ، برتن، کرانہ، جنرل اسٹور اور روزانہ کام آنے والی ضروریاتِ زندگی کی اشیاء آسانی سے مل جاتی ہیں۔ دوائی کے لیے بھی لوگوں کو باہر نہیں جانا پڑتا۔ شاہراہ پر ہی کئی میڈیکل اسٹور ہیں۔ موڑ پر چائے پانی کا چھوٹا سا ہوٹل بھی ہے۔ ہوٹل میں ہر وقت نمکین بسکٹ اور مٹھائی کے ساتھ چائے پینے والوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ گراہکوں کی سہولت کے لیے کمرے و برآمدے کے علاوہ راستہ کے کنارے بھی ایک بینچ پڑی رہتی ہے۔

باہری بینچ پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ اُس نے سفید رنگ کے صاف سُتھرے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ ماتھے پر زعفرانی رنگ کا تلک لگا تھا۔ تلک کے اُوپر چند سوکھے چاول چپکے ہوئے تھے۔ چونکہ اس طرح کے لوگ مسلم اکثریت کی اس بستی میں نہیں رہتے، اس لیے یہ بات پوری طرح عیاں تھی کہ بینچ پر تشریف فرما شخص باہری باشندہ ہے۔ اس کا کوئی رشتہ داری یہاں نہیں ہوسکتا اور اگر ایسا مان لیا جائے کہ بستی میں اُس کا کوئی دوست ہو، تو پھر اُسے بینچ پر بیٹھنے کی بجائے سیدھے اُس کے گھر چلے جانا چاہئے تھا۔ پہلی بار بستی میں آنے والا شخص بھی بینچ پر بیٹھنے کی بجائے کسی مقامی آدمی سے پتہ معلوم کر بڑی آسانی سے اپنے مقصد کو حاصل کر سکتا تھا۔

الگ ہیئت کے تلک دھاری شخص کے گلے میں زعفرانی رنگ کا مخصوص پٹکا اور سیدھے ہاتھ میں سفید اسٹیل کا کڑا پڑا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے کڑے کو پکڑ کر دھیرے سے کلائی پر اُوپر کی جانب لے جاتا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف لے آتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بستی میں جانے والی سڑک پر نظر ڈالنے سے اُس کی بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اُسے کسی ایسے شخص کا انتظار ہے جو اِسی راستہ سے بستی سے باہر آئے گا۔

ہوٹل سے کچھ ہی فاصلہ پر بلاک پر مکھ اکبر کا دفتر تھا۔ وہاں بیٹھا ڈاکٹر رہبر بینچ پر بیٹھے شخص اور اُس کی حرکات و سکنات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ غور و خوض کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر رہبر اُس شخص سے بخوبی واقف تھا۔ وہ شخص پاس کے گاؤں ہندو پور کا رہنے والا راجن تھا۔ علاقہ میں اُس کی پہچان کٹّر وادی ہندو اور 'گئو رکشک' کے رُوپ میں کی جاتی تھی۔ راجن اپنے گاؤں اور برادری میں ہی نہیں، بلکہ قرب و جوار کے ہندوؤں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آر ایس ایس کا سرگرم کارکن ہونے کے سبب اُس کی بات میں بہت حد تک جان تھی۔ وہ کئی بار بلاک اور تحصیل سطح کی زعفرانی تحریک میں اپنی نمائندگی درج کرا چکا تھا۔ وہ مذہبی داؤ پیچ سے واقف اور ایک اچھا مقرر ہونے کے علاوہ اپنی پُر جوش و بھڑکاؤ تقاریر سے ہندوؤں کے مذہبی جذبات اُبھارنے کا ہنر جانتا تھا۔ اسی طاقت کے بھروسہ وہ کئی بار لوگوں کو مشتعل کر ضلع انتظامیہ پر دباؤ بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ 'بیف' معاملہ کو لے کر منعقد کی جانے والی ضلع سطح کی بھگوا تحریک میں 'گائے بچاؤ' موضوع پر جوشیلی تقریر کے بعد سے زعفرانی تنظیموں میں اُس کی مقبولیت کا گراف تیزی سے بڑھ گیا تھا۔ بدلتے حالات میں ضلع کے افسران بھی راجن کو توجہ دینے لگے تھے۔

گئو ماتا کے تحفظ کے نام پر اُس نے ''شِو سینا'' اور ''بجرنگ دَل'' سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو یکجا کر 'گئو رکشک دَل' کی تشکیل کی تھی۔ گئو رکشک دَل کے اراکین علاقہ میں لگنے والے جانوروں کے ہفتہ واری بازار سے گائے اور بیلوں کو خرید کر لانے والے افراد کو راستے میں روک لیتے اور گئو کشی کا الزام لگاتے ہوئے اُن سے جبراً گائے بیلوں کو چھین لیتے تھے۔ گئو رکشکوں کا حوصلہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ احتجاج کرنے والے تاجروں کے ساتھ بدسلوکی اور مار پیٹ سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ گئو رکشک ٹولی کے دھاوا بولتے ہی تاجر اپنی جان بچانے کے لیے مویشیوں کو چھوڑ چھاڑ کر جنگل کے راستہ بھاگ نکلتے تھے۔ ایسا کرنا اُن کی مجبوری بن گئی تھی۔ اگر کاروباری جبر و تشدد کی مخالفت کرنے کی جرأت کرتے، تو بھگوا ٹولی اُنھیں مع گایوں کے تھانے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیتی تھی۔

جبر و تشدد سے بچنے کے لیے کچھ تاجروں نے دلتوں کی مدد لینی شروع کر دی تھی۔ وہ مزدوری پر دلت طبقہ کے لوگوں کو اپنے ساتھ بازار لے جاتے۔ گائے اور بیلوں کو خرید کر دلتوں کے نام سے رسید بنواتے اور جانوروں کو گھر تک لانے کی ذمہ داری اُنھیں سونپ کر بے فکر ہو جاتے۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ چلا، مگر جلدی ہی راز فاش ہو گیا۔ اَب بھگوا بریگیڈ کے اراکین دلتوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے بھی گئو دھن چھیننے اور مزاحمت کرنے پر مار پیٹ کرنے لگے۔

گئو رکشکوں کے نزدیک گائے و بیلوں کا کاروبار کرنے والے مسلمان اور دلت ذات کے ہندو ایک ہی خانہ میں آ گئے تھے۔ وہ دونوں فرقہ کے لوگوں کو زد و کوب کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایک بار طبیب نے ایک شخص کے کمزور بچے کے لیے گائے کا دودھ تجویز کیا۔ طبیب کے مشورے کو اہمیت دیتے ہوئے اُس نے تیرے میرے گھر سے دودھ خریدنے کی بجائے نجی گائے خریدنے کا فیصلہ کیا۔ وہ شخص سنیچر کے روز بازار گیا اور دودھ دینے والی عمدہ گائے خرید لی۔ اپنے لاغر بچے کے لیے دودھ کا انتظام ہونے پر وہ بہت خوش تھا۔ ابھی وہ گائے لے کر کچھ ہی دُور چلا تھا کہ گئو رکشکوں نے راستہ روک لیا۔ چونکہ گائے لانے والا شخص مسلمان تھا، اس لیے اُنھوں نے ذبح کے لیے گائے لے جانے کا الزام لگاتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے رسی چھین کر گائے اپنے قبضہ میں لے لی۔

اُس شخص نے حکیم کے مشورے سے صحت میں کمزور بچے کے لیے گائے کا دودھ حاصل کرنے کی غرض سے گائے خریدنے کی صفائی دی، لیکن بے کار۔ شر پسندوں نے اُس کی ایک نہ سنی۔ حیل و حجت کرنے پر تشدد پر اُتر آئے اور

اُسے مع گائے کے پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے لاچار باپ کی بات پر یقین نہیں کیا۔ گئو رکشکوں کے الزام کو صحیح ٹھہراتے ہوئے ’گئو رسرکشا ایکٹ‘ کے تحت کارروائی کرتے ہوئے گائے کو نزدیکی گئوشالہ اور خریدار کو جیل بھیج دیا۔

اقلیت طبقہ سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے ساتھ منمانی کرنے والے نام نمود گئو رکشکوں پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن تکلیف دہ بات یہ تھی کہ لفظ ’گائے‘ پر پولیس افسران بھی کیسریا رنگ کے دباؤ میں آ کر کارروائی کرنے کو اپنا اولین فریضہ تسلیم کر رہے تھے۔ پولیس تعاون کی بنا پر زعفرانی رنگ کے کئی ارکان اپنے آپ کو علاقہ کا تُرّم خاں تصور کرنے لگے تھے۔

یوں تو اہلِ ہنود میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو یہ اقرار کرتے تھے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ غربت اور تنگی کا شکار ہے۔ وہ کم دُودھ دینے والی گائے پالنے کے مقابلہ زیادہ دُودھ دینے والی بھینس پالنے کو ترجیح دیتا ہے۔ مذہبی جذبات سے جُڑاؤ اور عقیدہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر ہندوؤں میں گائے پالی جاتی ہیں۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب گائے دُودھ دینا بند کر دیتی ہے یا کمزور ہو جاتی ہے، تو گئو ماتا کے یہی سپوت چارا کھلانے سے بچنے کے لیے اُسے بازار میں لے جا کر قصائیوں کے ہاتھ بیچ آتے ہیں۔

گلے میں کیسریا رنگ کا پٹکا لٹکائے گئو رکشک دل کے کئی ارکان ایسے بھی تھے، جن کے نزدیک گائے کے مذہبی تقدس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ ان میں کئی ایک تو صرف اپنے مفاد کے لئے ’گئو رکشک‘ ہونے کا ڈھونگ کرتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ یہ ڈرامے باز، گائے و بیلوں سے بھرا منی ٹرک یا کھیپ پکڑ لیتے اور گئو دھن لے جا رہے لوگوں سے اپنی مٹھی گرم کرنے کے بعد اُنھیں چھوڑ دیتے تھے۔ راجن بہت چالاک تھا۔ وہ سامنے نہیں آتا تھا اور اس طرح کی سودے بازی سے خود کو الگ رکھتا تھا۔ گئو رکشک دَل کے ارکان اس ناجائز کمائی کا دوگنا حصہ اُسے گھر بیٹھے پہنچا دیتے تھے۔

علاقہ کے ’گئو رکشک دَل‘ کے ممبران اُس کے تابع تھے۔ اُس کا حکم حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔ فیصلہ میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ گئو رکشا کے نام پر کسی غنڈے موالی کی طرح علاقہ میں اس کی طوطی بولتی تھی۔ ایک بار بازار سے گائے خرید کر لا رہے کاروباری کو راستہ میں گئو رکشکوں نے پکڑ لیا۔ اُس نے اپنی عزت کا حوالہ دیتے ہوئے منہ مانگی رقم دینے کی پیش کش کی، لیکن راجن نے انکار کر دیا۔ گئو رکشک گائے سے بھرے منی ٹرک کو تھانے لے گئے۔ اُنھوں نے نہ صرف قانونی کارروائی مکمل کرائی، بلکہ میڈیا کو بُلا کر فوٹو بھی کھنچوائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے دِن کے اخبارات میں یہ خبر مع تصاویر کے جلی ہیڈنگ کے ساتھ چھاپی گئی۔

حالانکہ پولیس گایوں کو کسی مقامی گئو پالک کی سپردگی میں دینا چاہتی تھی لیکن گئو رکشکوں کی ضد کی وجہ سے گایوں کو اُسی منی ٹرک کے ذریعہ قریب پندرہ کلومیٹر کی دُوری پر واقع گئوشالہ پہنچایا گیا۔ راجن بھی گئوشالہ تک ساتھ گیا تھا۔ گئوشالہ کے محافظ دینو پنڈت سے راجن کی خاصی پہچان تھی۔ وہ اکثر گئوشالہ جاتا رہتا تھا۔

راجن نے گئوشالہ میں پلنے والے ’گوونش‘ کے چارے کے لیے اپنی جیب سے پانچ پانچ سو روپیہ کے کئی نوٹ نکال کر دینو پنڈت کو دئے۔ ضرورت پڑنے پر مزید رقم کا انتظام کرنے کی بات بھی کہی۔ واپسی سے قبل راجن، دینو پنڈت کو گئوشالہ کے ایک کونے میں کھڑے نیم کے درخت کے نیچے لے گیا اور دھیرے سے کان میں کچھ کہا۔ دینو پنڈت نے رضامندی کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ گئوشالہ کے گیٹ کی طرف بڑھتے راجن کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، تو دینو پنڈت کے رُخ پر بھی اطمینان و فرحت کے نقوش اُبھر آئے تھے۔

راجن کی ’گئو بھکتی‘ پر مشتمل زندگی کی ورق گردانی کے دوران ڈاکٹر رہبر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے نزدیک پہنچ کر راجن سے رسماً مصافحہ کیا، حال چال دریافت کئے اور وہاں بیٹھنے کی بابت معلومات کی۔

راجن، ڈاکٹر رہبر کا شناسا تھا، اسنے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا، ’وہ سلیم قریشی کے انتظار میں ہے۔ اُس نے سلیم قریشی سے ایک گائے خریدی تھی۔ وہ دودھ کم دے رہی تھی، لہٰذا اُسے واپس کر دیا تھا۔ اُس کے پاس دوسری گائے نہیں ہے، اس لیے وہ اُس سے اپنے روپے واپس لینے آیا ہے۔‘

ابھی دونوں کے بیچ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ بائیک پر سوار سلیم قریشی اُن کے پاس آ کر رُک گیا۔ ڈاکٹر رہبر نے سلیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، ’سلیم! راجن بھائی ہمارے بہت خاص ہیں۔ تم اِنہیں زیادہ دودھ دینے والی دوسری گائے لا دو یا پھر انھیں ان کے روپے لوٹا دو۔‘

ڈاکٹر رہبر کی بات سنتے ہی سلیم قریشی کے لبوں پر تبسم اور چہرے پر مسکراہٹ دَوڑ گئی۔ اُس نے مختصر سا جواب دیا، ’ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! ایسا ہی ہوگا۔‘

راجن نے ڈاکٹر رہبر سے ہاتھ ملایا اور سلیم قریشی کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گیا۔ راجن کے بیٹھتے ہی سلیم قریشی بائیک میں کِک لگا کر اُسے آگے بڑھا لے گیا۔ تھوڑے فاصلہ پر کھڑے عرفان قریشی نے اُن کی گفتگو سن لی تھی۔ وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ڈاکٹر رہبر، عرفان قریشی کو ہنستا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ عرفان قریشی نے قریب آ کر ڈاکٹر رہبر سے تلک دھاری کے بارے میں سرگوشی کی۔

ڈاکٹر رہبر نے بتایا، ’راجن بہت سخت مزاج، کٹر ہندوتووادی اور بھگوا تنظیم سے جُڑا شخص ہے۔ علاقہ کے ’گئو رکشک‘ اس کے اشارے پر کام کرتے ہیں۔ مخبر ہونے کے ناطے پولیس میں بھی اس کی پہنچ ہے۔‘

عرفان قریشی نے مسکراتے ہوئے کہا، ’ڈاکٹر صاحب آپ اس شخص کی اصلیت سے واقف نہیں ہو۔ یہ شخص گئو دھن کا محافظ نہیں، بلکہ مفاد پرست اور ایک طرح سے گایوں کا قاتل ہے۔ یہ گائے وائے کچھ نہیں خریدتا، اُلٹا قصائیوں کے ہاتھوں فروخت کرتا ہے۔ اِس نے سلیم سے کبھی کوئی گائے نہیں خریدی، البتہ اُسے بیچی ضرور ہیں۔‘

’کیا...؟‘ ڈاکٹر رہبر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

عرفان قرشی، جو سلیم قریشی کا پارٹنر بھی تھا، نے بتایا، ’راجن کی گئو شالہ کے پنڈت سے اچھی سانٹھ گانٹھ ہے۔ یہ کچھ روپے دیکر گئوشالہ سے گائے یا بیل لے آتا ہے اور اُسے سلیم قریشی کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔‘

'عرفان! تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ تو گئو رکشک دَل کا لیڈر ہے! یہ ایسا کیسے کرسکتا ہے؟' ڈاکٹر رہبر نے تعجب کا اظہار کیا۔

'سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی نگاہ میں یہ 'گئو رکشک دل' کا لیڈر ضرور ہے، لیکن حقیقت میں یہ 'گئو بھکشک' ہے۔ گائے اور بیلوں کی تجارت کرنے والا بے حد شاطر تاجر ہے۔ یہ اکثریتی طبقہ کے لوگوں سے معمولی قیمت میں بچھیا خرید لیتا ہے، پھر اُسے گئوشالہ میں چھوڑ آتا ہے۔ گئوشالہ کے منتظم کو کچھ دے دلا کر وہاں سے تندرست و فربہ گائے لے آتا ہے۔ اُسے سلیم قصائی کے ہاتھوں فروخت کر موٹی رقم حاصل کر لیتا ہے۔ اِس حکمتِ عملی سے راجن تو کمائی کرتا ہی ہے، گئوشالہ کے پنڈت کو بھی دوہرا فائدہ ہو جاتا ہے۔ ایک تو وہ تندرست گائے کی زیادہ خوراک مہیّا کرنے کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔ دوسرے اُسے بیٹھے بٹھائے رقم مل جاتی ہے۔ اس سے گئوشالہ کے رجسٹر میں درج گئو دھن کی تعداد بھی متاثر نہیں ہوتی۔ اتنا ہی نہیں، وہ کبھی کبھی بوڑھی اور کمزور گائے کے بدلے عمدہ گائے بھی لے آتا ہے۔ کمزور گائے کے مرنے پر گئوشالہ کا منتظم اُسے رجسٹر میں مردہ دکھا دیتا ہے۔' عرفان قریشی نے اپنی بات مکمل کی۔

'راجن کی اصلیت سے آج واقفیت ہوئی، ورنہ وہ تو اُسے ایک کٹّر وادی ہندو اور گئو دھن کا سچا محافظ ماننے کی غلط فہمی میں ہی مبتلا رہتا۔ یہ تو بڑا چالاک اور چھپا رستم نکلا۔' ڈاکٹر رہبر نے عرفان قریشی کی زبانی راجن کی کہانی سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

عرفان قریشی نے مزید بتایا، 'راجن کی عیاری کا اندازہ اِسی سے لگا لیجئے کہ وہ بھید کھلنے کے خوف سے کسی دوسرے قصاب کے بدست گائے فروخت نہیں کرتا۔ صرف اور صرف سلیم قریشی کے ہاتھ گائے بیچتا ہے۔ یہ خرید و فروخت بھی رات کی تاریکی میں گاؤں کے کنارے یا پھر صبح سویرے نزدیکی باغ میں کی جاتی ہے، تاکہ اس حساس اور کالے کاروبار کی جانکاری کسی غیر مسلم کو نہ ہو سکے۔ اِس سے راجن کی جیب تو وزنی ہوتی ہی ہے، سلیم قریشی کی روزی روٹی کا بھی بندوبست ہو جاتا ہے۔'

ڈاکٹر رہبر، راجن کے دوہرے کردار کو ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ آر ایس ایس کا رُکنِ خاص ہونے کے ناطے اُس کے ذہن میں راجن کی تصویر ایک سخت مزاج، کٹّر ہندوتو وادی اور گئو ماتا کے سچے سپوت کی تھی، لیکن حقیقت اس کے برعکس نکلی۔

ڈاکٹر رہبر دوہرے کردار کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُسے مہینہ بھر پہلے اخبارات میں چھپا وہ واقعہ یاد آ گیا، جس میں گائے کے نام پر ہنگامہ کرنے والے 'گئو رکشکوں' کے ذریعہ دلِت سماج کے چار افراد کو زد و کوب کیا گیا تھا۔ اُن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنے پشتینی دھندے کے تحت آبادی کے باہر جنگل میں پڑی مردہ گایوں کی کھال نکال رہے تھے۔ کسی نے گائے کاٹنے کی جھوٹی خبر گئو رکشکوں کو دے دی۔ بس پھر کیا تھا۔ خبر ملتے ہی بھگوا ٹولی کے خود ساختہ گئو رکشکوں نے دھاوا بول کر اُنھیں پکڑ لیا اور بغیر تحقیق کئے مار پیٹ شروع کر دی۔ دلتوں کے حقیقت سے آگاہ کرانے کے باوجود اُن کی کسی نے نہیں سُنی۔ نہ ہی یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ ذبح کے جانور کی کھال گلے پر کٹی ہوتی ہے، جبکہ مردہ جانور کی اُتاری گئی کھال گلے کے مقام پر سالم رہتی ہے۔

مجبور و ناتواں دلتوں کو ننگا کر کے خوب پیٹا گیا۔ وہ روتے اور چلاتے رہے، لیکن اُن پر کسی کو رحم نہیں آیا۔ گئو رکشک جس وقت دلتوں کو گندی گندی گالیاں دے کر پٹائی کر رہے تھے، اُسی وقت ان کے ایک ساتھی نے مار پیٹ کی واردات کو اپنے موبائل کے کیمرے میں قید کر لیا تھا۔

دو دن بعد نوجوان نے شوخی میں آ کر دلتوں سے مار پیٹ کی ویڈیو وہاٹس ایپ پر ڈال دی۔ وہاٹس ایپ پر وائرل یہ معاملہ صرف دوستوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ کچھ ہی دیر میں میڈیا تک بھی پہنچ گیا۔

الیکٹرونک میڈیا کے علاوہ اخبارات میں فوٹو کے ساتھ خبر چھپتے ہی دلِت طبقہ سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کی بے رحمی سے پٹائی کا معاملہ طول پکڑ گیا۔ دلت سماج نے اِسے اپنی بے عزتی سے تعبیر کرتے ہوئے نام نہاد گئو رکشکوں کے خلاف زبردست احتجاج کرتے ہوئے پولیس کارروائی کا مطالبہ کیا۔ پولیس کے حرکت میں نہیں آنے پر علاقہ کے دلتوں نے مردہ مویشیوں کی کھال نہیں اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ اس احتجاجی عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیہات و قرب و جوار میں اپنی موت مرے مویشی جگہ جگہ پڑے سڑتے رہے، لیکن دلتوں نے اُنھیں ٹھکانے نہیں لگایا۔ ماحول پر تعفن ہونا شروع ہو گیا، تب کہیں جا کر پولیس نے خاطیوں کے خلاف رپورٹ درج کر کارروائی کی اور نامزد افراد کو گرفتار جیل بھیجا گیا۔

صبح فجر کے وقت سو کر اُٹھا ڈاکٹر رہبر، راجن کے دوہرے کردار کو بھول کر اپنے کام کاج میں لگ گیا۔ اِسی طرح کئی ہفتے بیت گئے۔ علاقہ میں پوری طرح امن کا ماحول تھا۔ اچانک ایک دِن بھگوا ٹولی کی حمایت کرنے والے رام کشن نے گاؤں کے قریب سے گائے لے جا رہے سلیم قریشی کو پکڑ لیا۔ اُس کی پٹائی کرنے کے بعد اُسے گائے سمیت پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس کے پاس پہلے سے ہی سلیم قریشی کے خلاف کسی غیر مسلم کی حمایت و تعاون سے گائے کاٹ کر مانس فروخت کرنے کی خفیہ جانکاری تھی۔

پولیس کچھ لین دین کے بعد معاملہ نپٹانے کی کوشش میں تھی، لیکن جب اُسے یہ پتہ چلا کہ وہ سلیم قریشی ہے، تو موٹی رقم کا مطالبہ کیا گیا۔ اُس کے پاس منھ مانگی رقم کا بندوبست نہیں تھا۔ پولیس نے سلیم قریشی کے ساتھ سختی برتتے ہوئے اُس سے غیر مسلم معاون کا نام دریافت کیا۔ راجن کا نام سامنے آنے پر پولیس سکتہ میں آ گئی، لیکن اُس نے دونوں کے خلاف قانونی کارروائی کے تحت اُنھیں جیل بھیجنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔

حلقہ کا داروغہ سپاہیوں کے ساتھ جا کر راجن کو پولیس اسٹیشن لے آیا۔ راجن نے پہلے تو سلیم قریشی سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا، لیکن جب سلیم قریشی کو اُس کے سامنے لایا گیا، تو راجن نے بے چوں چرا اپنا جرم قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ پولیس، ڈپارٹمنٹ اور اکثریتی طبقہ میں واہ واہی لوٹنے کے موڈ میں تھی۔ وہ دونوں

کاچالان کرجیل بھیجنے کی اپنی کارکردگی کواخباروں میں شائع کرانے کے حق میں تھی۔
پولیس کارروائی سے بے نیاز راجن نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اورکسی کوفون لگا کر بات چیت کی۔راجن کے ذریعہ فون ڈسکنٹ کرتے ہی ایس ایچ او کے موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔حکومت میں شامل پارٹی کے ایک بڑے نیتا کا فون تھا۔اُس نے فون پر اپنے نام اور عہدے کا حوالہ دیتے ہوئے راجن کو بغیر کوئی کارروائی کئے فوراً چھوڑنے کی ہدایت دی۔ایس ایچ او پریشان ہوگیا۔اُس کے چہرے پر پسینہ آگیا۔وہ سوچ میں پڑ گیا! کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ حالانکہ اُسے راجن کے چہرے کی مسکراہٹ قطعی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔وہ اُسے اس کی اوقات دکھانا چاہتا تھا،لیکن وہ تمام طرح کی سہولتوں والے پولیس اسٹیشن کوچھوڑ کرکہیں چھوٹی جگہ پر اپنا تبادلہ کرانا نہیں چاہتا تھا۔اُس کی حالت سانپ اور چھچھوندر جیسی تھی۔ یہ ایک طرح سے خاکی کی بے عزتی تھی،لیکن اُس نے اِسے برداشت کرنے میں ہی بھلائی سمجھی۔دیکھتے ہی دیکھتے کھادی ایک بار پھرخاکی پر بھاری پڑگئی۔ وہ برسرِ اقتدار پارٹی سے تعلق رکھنے والے قدآور نیتا کی حکم عدولی کی جرأت نہیں کرسکا۔
اس سے قبل کہ گئورکشک پولیس اسٹیشن میں آکر شورشرابہ کر ماحول خراب کریں۔ایس ایچ او نے راجن کوچھوڑتے ہوئے تینوں گائے بھی اُس کے حوالے کردیں۔راجن چوہان کے جانے کے بعد ایس ایچ او نے حوالات میں بند سلیم قریشی کو اپنے پاس بُلایا اوراُسے گئو ہتیا نہیں کرنے کی تاکید کرتے ہوئے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

مہاتما بدھ کا آخری وعظ

میرے عزیزو
مجھے محبت سے تکنے والو
مجھے عقیدت سے سننے والو
میرے شکستہ حروف سے اپنی من کی دنیا بسانے والو
میرے الم آفریں تکلم سے انبساطِ تمام کی لازوال شمعیں جلانے والو
بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں پر
عبور پائے ہوئے
سُکھوں کو تجے ہوئے بے مثال لوگو
حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھنے والے
عزیز بچو
میں بجھ رہا ہوں
میں جل چکا ہوں
میرے شعورِ حیات کا شعلہء جہاں تاب بُجھنے والا ہے
میرے کرموں کی آخری موج میری سانسوں میں گُھل چُکی ہے
میں اپنے ہونے کی آخری حد پر آگیا ہوں
تو سُن رہے ہو میرے عزیزو
میں جا رہا ہوں
میں اپنے ہونے کا داغ آخر کو دھو چکا ہوں
کہ جتنا رونا تھا رو چکا ہوں
نہ اب مجھے انت کی خبر ہے
نہ تو کسی چیز پر نظر ہے
میں اب تو بس اتنا جانتا ہوں
کہ ہستی کے

اغوا

شمع خالد
(راولپنڈی)

میں نذیر احمد حلفیہ بیان دیتا ہوں رافیہ خاتون میری منکوحہ زوجہ ہیں اور میں نے اپنی پہلی بیوی سے اجازت لے کر ان سے نکاح کیا ہے۔ جب ہم دونوں نے باہمی رضامندی سے شادی کی ہے گواہوں کی موجودگی میں پھران کے جوان بیٹے میرے خلاف ''اغوا'' کاالزام لگاتے ہوئے کیسے ایف آئی آر کٹوا سکتے ہیں۔ میری دونوں زوجہ یہاں موجود ہیں۔ شناختی کارڈ میں اپنے جواب کے ساتھ جمع کروادیے ہیں۔ جج نے دونوں خواتین کے بیان لینے کے بعد نذیر احمد حاجی کا کیس خارج کر دیا۔

رافیہ کے دونوں جواں سال بیٹے رزاق نے جو زیادہ ہی جذباتی تھا جیب سے پستول نکال لیا۔ پیچھے کھڑے سپاہی نے اسے جکڑ لیا۔ یوں خون خرابہ تو نہ ہوسکا لیکن رزاق کو چھ ماہ کے لیے ہتھکڑی لگ گئی۔ یہ ڈرامائی موڑ سب کے لیے ہیجان خیز تھا۔

حاجی نذیر جب دونوں بیویوں کو ساتھ لے کر گاڑی میں بیٹھا۔۔۔ رافیہ نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ وہ بار بار سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی جن ہاتھوں کو روز سینے سے لگاتی تھی اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے حرف پن پکڑانا رافیہ کے گرتے ہوئے آنسو حاجرہ کو اُلجھا رہے تھے۔ جب سے نذیر اس کو بیاہ کر لایا تھا حاجرہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی جلن نہیں ہوئی۔ کیونکہ نذیر احمد دونوں سے یکساں سلوک کرتا۔ وہ جہاں رافیہ کے لیے کوئی چیز لے کر آتا تو وہ دونوں کے پسندیدگی لیے ہوتی۔ حاجرہ کو گلابی رنگ پسند تھا تو رافیہ نیلگوں رنگوں کی دلدادہ تھی۔ وہ لاکر سامان حاجرہ کی گود میں رکھتے ہوئے کہتا بھلی لوک کپڑا ایک جیسا ہے پر رنگ الگ الگ ہیں۔ جس طرح میں شوہر تو تم دونوں کا ہوں لیکن محبت کے رنگ الگ ہیں۔ تمہاری محبت جس طرح وفا اور قربانی کی خوشبو جس طرح میرے لیے یقین کرو تم محبت نہیں عبادت ہو۔ فجر کے بعد دل سے جو دعا نکلتی ہے اُس میں صرف تم ہوتی ہو۔ میں تمہاری ریشم جیسے نرم وجود کا احسان مند ہوں جس نے اپنے حسن وجمال کی پرواہ کیے بغیر مجھے چاند جیسے دو بیٹے دیے۔ پھولوں جیسی محبت دی۔ میں تمہاری دریادلی کا شکریہ کیسے ادا کروں گا کہ تم نے ایک اجڑی عورت کو اپنا ہم مرتبہ بنا کر۔۔۔ نہ صرف جنت کمائی ہے بلکہ مجھے بھی یہ حاجرہ نے دل میں اٹھتی ہوک کو اندر ہی اندر دفن کر دیا۔ ایسے مدفن ہر عورت کے دل میں اندر ہی اندر تہہ در تہہ سینت سینت کر ایسے چھپا دیتی ہے کہ وہ خود کو بھی نظر نہ آئے حاجرہ نے بھی اسی غم کو سینے میں اتار لیا۔

آج رات کی باری رافیہ کی تھی۔ حاجرہ سوچ رہی تھی۔ وہ کہتا ہے اُسے صرف مجھ سے محبت ہے مگر باری کی رات کبھی نہیں بھولتا اور رافیہ جب آتی تھی تو بڑھی کھوسٹ لگ رہی تھی اور اب دن بدن نکھر رہی ہے۔ یہ ہی سوچتے سوچتے اور جاگتے سوتے کروٹیں بدلتے گزار دی۔

دوسری طرف حاجی نذیر جب رافیہ کے جسم کو ٹٹول رہا تھا کمزور ہڈیوں اور لٹکی کھال جیسے دوبارہ تن گئی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی محبت تو میں نے پوری ایمانداری جتنی شوہر سے کی تھی لیکن اُس کے جسم کے ساتھ لگنے سے کبھی کرنٹ نہیں لگا تھا۔ کبھی جسم میں خون گرم ہو کر چھلکا نہیں تھا۔ ادھر نذیر جیسے لڑکپن کے دور میں پہنچ گیا۔ محلّہ میں رافیہ ہی اُس کی پڑوسن تھی اور بلوغت کی پہلی ہم دونوں نے اکٹھے صرف چند بار ہی وصال حاصل کر سکے۔ رافیہ کے ابو کی ٹرانسفر ہو گئی۔ چند سال وہ اس کے لیے مجنوں بنا رہا۔ پھر چند لڑکیاں اُس کے نصیب میں آئیں اور چلی گئیں۔ پھر والدین سے حاجرہ کے لیے دولہا بنا کر سہرا پہنا کر گھوڑے پہ بیٹھا کر حاجرہ کو بیاہنے کے لیے گئے تو واپسی کے سب دروازے بند تھے۔ حاجرہ بھی بہت باوفا اور تابعدار بیوی نکلی۔ دونوں نے پہلے پہل خوب ایک دوسرے کے ساتھ سیر سپاٹا کیا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اس طرح مناتے کہ ہر لمحہ یادگار بن جاتا۔ تو عہد کرتے کہ آج کے دن کو اس انداز سے ہر سال منایا کریں گے۔ چھوٹے تحائف دینا۔۔۔ یوں وقت پر لگا کر اڑتا گیا۔ بچے جوان ہو گئے اور اپنے اپنے آشیانے بنانے اُڑ گئے۔ ہم دونوں اکیلے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی۔ اکثر میں اُسے ایک جھیل کے کنارے لے آتا۔ بچپن میں وہاں جاتا ایک ایڈونچر ہوا کرتا۔ ایسے میں جانے کہاں سے حاجرہ رافیہ بن جاتی اور میں ایک معصوم بچے کی طرح جگنو کے پیچھے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہی آسمان کو تلاش کرنے لگتا۔ قوس وقزح جو اس جھیل کے کنارے بنی رہتی رافیہ کا ہاتھ تھام پل سے گزرتا رنگوں کا لمس رافیہ کی انگلیوں سے نکل کر قوس وقزح کے لمس میں تبدیل ہو جاتا اور میں اُس کی انگلی پکڑے آسمانوں پر اڑتا۔

جونہی ہم جھیل کے کنارے سے ذرا پرے نکلتے میں پھر حاجرہ کے وجود میں گم ہو جاتا اور سوچتا زندگی صرف پانے اور کھونے جیتنے کا نام نہیں یہ تو صرف ایک لمحہ کا عمل ہے۔ اگر یہ لمحہ ہمیں خوشی دے جائے تو یہ پنکھ پھیلا کے اُڑ جاتا ہے اور اگر ہمیں اس لمحے میں غم کے نشتر محسوس کریں تو لمحہ ہار بن جاتا ہے۔ ہم اس لمحے کو ہارنے کی وجہ سے کبھی نہیں بھول پاتے۔ لیکن میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ اپنی پہلی محبت کو پالیا حالانکہ حاجرہ نے زندگی بھر کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ وفا شعار، خدمت گزار زندگی میں ہر لمحہ ساتھ دینے کے لیے میں اُس کا مشکور ہوں۔۔۔ لیکن پھر نا تمام ہونے کی کیفیت نے مجھے بار ہا اُس محرومی کو دور کرنے کے لیے میں مختلف چہروں میں اُسے لاشعوری طور پر کھوجتا رہا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے ماضی کے گناہوں کا اعتراف بھی کر رہا تھا اور توجیہہ بھی خود ہی دے رہا تھا۔ انسان بھی کتنی عجیب شے ہے۔ انسان خود ہی ضمیر کی عدالت سجاتا ہے اور خود ہی اپنے مجرمانہ فعل سے اپنے آپ کو بری بھی کر لیا جاتا ہے۔

مرد ہمیشہ برتر ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی توجیہہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔

اپنے ضمیر سے مکالمہ ختم کرنے کے بعد وہ رافیہ کے بستر میں اپنی جگہ بنانے لگا۔ رافیہ نے اپنے آپ کو سکیڑتے ہوئے کہا۔ میں تو ایک چچڑی ہڈی ہوں تم صرف مذہبی رسم نبھانے کے لیے کیوں آتے ہو۔ تمہارا یہ ہی کرم کم ہے کہ تم نے مجھ بھکارن کو چوک سے اٹھا کر پھر باعزت کر دیا۔ میں جسے ساری عمر کوستی رہی کہ میرے کنوارے بدن کو داغدار کر کے تم بھاگ گئے تم نے کفارہ ادا کر دیا لیکن میں اپنی نظروں میں خود ہی بے توقیر ہوتی گئی۔ جب بھی متین اعظم مجھے میری جان کہتے میں غیر کی عدالت میں مجرم بنی کھڑی رہتی تھی۔ تم نے مجھے اس آزار سے بھی نجات دے دی ہے۔ میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ نذیر کی مردانگی پر جیسے گالی پڑ گئی ہو۔ تو تم اعظم کو آج بھی یاد کرتی ہو۔ رافیہ نے مسکراتے کہا۔ لو وہ تو اب اس دنیا میں ہی نہیں اور تم اس کے نام سے ہی جل گئے۔ اور میں تمہیں ہر لمحہ حاجرہ کے ساتھ بانٹتی ہوں بلکہ اس کی شکر گزار ہوتی ہوں کہ اُس نے اپنے بڑے ظرف کے ساتھ مجھے قبول کیا۔ کچہری میں میرے بیٹوں کے منہ پر کالک ملتے ہوئے اس نے کہا، کہ میں اُس کی مرضی اور پسند سے اُس کی سوتن بنی ہوں۔

ایک دن حاجرہ اور رافیہ کھانا پکانے کے لیے بیٹھ تھیں تو حاجرہ بڑے دکھ اور حیرت سے کہنے لگی۔ تمہارے اپنے سگے بیٹے نے تمہیں بھکارن بنا کر چوک میں بٹھا دیا یہ کیا ظلم کر رہے تھے۔

رافیہ کی آنکھوں میں جیسے آنسوؤں کا بندھ ٹوٹ گیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ پر حاجی نذیر کی بات یاد آ گئی اُس نے پہلی ارت ہی اُسے ہدایت کی تھی کہ کبھی بھی حاجرہ کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ ہم پہلے سے آشنا ہیں ورنہ اُسے نیکی کے فخر کی بجائے شک ہو جائے گا اور شک ہماری زندگی برباد کر دے گا۔ اُسے نذیر کا جملہ یاد آیا۔ عورت حسد میں اندھی ہو جاتی ہے۔ ذرا سا شک بھی سارے ماحول کو پراگندہ کر دیتا ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے وہ خوابناک لہجہ میں بولی۔ اعظم بہت اچھے شوہر تھے مجھے زندگی بھر کبھی کوئی دکھ نہیں دیا۔ ہم دونوں نے تنکا تنکا جوڑ کر آشیانہ بنایا تھا۔ اپنی اوقات سے بڑھ کر انہوں نے ہمیں دیا۔ بیٹوں کو اچھے سکولوں میں پڑھایا۔ بیٹی کو بی۔اے کے بعد اچھی جگہ بیاہ دیا۔ ریٹائرمنٹ میں اپنی جگہ بیٹے کو کرا دیا۔ اُن کی دفتر میں بہت عزت تھی اس لیے بیٹے کو بغیر تجربے کے نوکری مل گئی۔ چھوٹے بیٹے کو بزنس شروع کروایا۔ اس بھاگ دوڑ میں دل نے ساتھ چھوڑ دیا اور ایک دن رات ایسے سوئے کہ صبح وہ اگلے جہاں کوچ کر گئے۔ جانے سے پہلے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ آج کے بعد اب خواب میں ہی ملاقات ہوا کرے گی وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ کا شکر ہے۔ ریٹائرمنٹ کے ساتھ میں نے دونوں بیٹوں کو روزگار پر لگا دیا ہے۔ اب دونوں کی شادی تم نے کروانی ہے۔ بیٹی تو شکر ہے اب اپنے گھر میں بس رہی ہے۔ چھوٹی موٹی پریشانیاں شکوے تو زندگی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میری بیٹی بڑی ذہین ہے اُس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور میں نے سانس بھرتے ہوئے کہا۔ عورت ہمیشہ نصیب پر قناعت کرتی ہے۔

صبح جب وہ نہ اٹھے تو میں نے تڑپ کر کہا، ساری عمر اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے مجھے تو آپ نے کبھی اس قابل ہی نہیں جانا کہ میرے بارے میں سوچتے میں ساری عمر اُن کا سایہ بنی رہی اور مجھے اپنے سائے سے محروم کر دیا۔

اُن کے تمام بقایاجات لے کر اُن کے افسران گھر آئے۔ پنشن بھی میرے نام لگ گئی تو پھر نند کہنے لگی قسمت تو رافیہ جیسی جب سہاگن تھی تو بھی عیش کر رہی تھی، بھائی نے ہر خواہش پوری کی اور بیوہ تو ہوئی لکھ پتی بن گئی۔ بعض عورتیں صرف راج کرنے آتی حاجرہ آپا اُس نے ایسی نظر لگائی کہ میں لکھ پتی سے ککھ پتی ہو گئی۔ مگر یہ سب ہوا کیسے؟ حاجرہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

تو رافیہ نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا اولاد بوڑھی بھی ہو جائے ماں کا دل ہمیشہ بچوں کے ساتھ دھڑکتا ہے لیکن بیٹے بیوی کے آتے ہی اپنے کان اور آنکھیں اُسے دان کر دیتے ہیں۔ اُن کی زبان ماں کی بولی بھول کر بیوی کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ کان صرف بیوی کی سنائی ہوئی باتیں سنتے ہیں۔ وہ ماں جس نے نو ماہ اپنی کوکھ میں اپنا خون پلایا ہوتا ہے ڈھائی سال اپنی چھاتیوں کو نچوڑ کر اُس کا پیٹ بھرتی ہے اُس کی صحت، جوانی، تربیت کے لیے رات دن ایک کرتی ہے وہ اُسے بے وقوف اور کوڑھ مغز سمجھنے لگتے ہیں۔ امجد بزنس نہ سنبھال سکا مجھے بتائے بغیر بیوی کے رشتہ داروں سے قرض لیتا رہا۔ ایک دن جب اُسے پولیس پکڑنے آئی تو وہ کہنے لگی۔ ڈائن کیا یہ لاکھوں قبر میں لے کر جائے گی۔ میں نے خاموشی سے لاکھوں کا چیک دے کر بیٹا بچا لیا۔۔۔ اُس رات میں مدتوں لیکن وہ میرے آرام کی آخری رات تھی۔ دوسرے دن بڑا بیٹا بہو اپنے بیٹے کو میرے سامنے چھینکتے ہوئے بولے۔ ڈائن تجھے شرم نہ آئی سارا ورثہ ایک بیٹے کو چڑھا دیا ہمارا اور ہمارے معصوم بیٹے کا خیال نہ آیا۔

اب اُس کو راضی کرنے کے لیے اپنا زیور اور پنشن کے لیے بنوایا اے ٹی ایم کارڈ دے دیا۔

چند سال بعد گھر میں پھر طوفان آ گیا چھوٹا پھر بزنس میں سب کچھ تباہ کر بیٹھا تھا اور بڑے نے بیٹے کو امریکہ پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ اب کی دفعہ مکان گروی رکھ کے اپنے چند کپڑے لے کر میں گھر سے نکل آئی۔ زندگی میں پہلی دفعہ اکیلے قدم اٹھایا تھا۔ شہر کے چوراہے میں بس اسٹینڈ پہ آ بیٹھی۔۔۔ جانے کے لیے میں بھائی خوش آمدید کہیں گے کہ نہیں یہ ہی سوچتی بس سٹاپ پر بیٹھ گئی۔ جانے کب کوئی میرا بیگ اور پرس لے کر بھاگ گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا چکا تھا۔ جانے کب بے ہوش ہوئی کب ہوش آیا، آنسو اتنے بہہ چکے تھے کہ دوپٹہ بھیگ گیا تھا۔

تو کوئی میرا کندھا جھنجوڑ رہا تھا دیکھا تو امجد اپنے بڑے بھائی کے ساتھ میرے سامنے کھڑے تھے۔ جانے اتنے نوٹ میری جھولی میں گرے تھے

بیٹوں نے جلدی جلدی گنا اور مجھے اٹھا کر گھر لے آئے۔ آج بہت دنوں کے بعد گھر میں بڑا گوشت پکا تھا۔

بڑی بہو ہانڈی سے سالن نکالتے ہوئے کہہ رہی تھی وہ کہتے ہیں ناں مرا ہاتھی سوا لاکھ کا۔۔۔ ہماری ساس اس عمر میں بھی نوٹ کما کر لے آئی۔ دوسری واقعی ہم نے تو کبھی ایسا سوچا ہی نہ تھا۔ بڑھی اگر تین ہزار لانے لگے تو ہم مکان بھی بچا لیں گے۔ پہلی بڑی بہو میرے ابا کو پتہ چلا تو بہن کی محبت نہ جاگ پڑے چھوٹی نے ایک بھیانک ڈروانا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، پہلے تو کبھی نہیں جاگی۔۔۔

رافیہ کہنے لگی۔۔۔ اُس دن جہاں میرا قیمتی سامان لُٹ گیا تھا وہیں خوشی تھی کہ میرے بچوں کو آخر ماں کا خیال آ ہی گیا۔۔۔ کیسے نہ ہوتا میں نے تن من دھن سب ہی اپنے دونوں بیٹوں پر وار دیا۔ بھلا ایک ماں کا احسان یہ بچے کیسے اتار سکتے ہیں۔ رافیہ نے گیلی آواز سے کہا۔ میں ابھی تکیے پر سر رکھے سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ ساتھ کے کمرے سے بڑی بہو کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی آج بچوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔ میں تو اپنی بوڑھی ساس کو دعا دیتی ہوں۔ رافیہ کہنے لگی مجھے خیال آیا میں ساس کے علاوہ اس کی پھوپھی بھی تو ہوں کہ اس ساتھ ہی اُس کی دوبارہ آواز آئی۔ میں تو کہتی ہوں اماں کو روز کسی نہ کسی چوراہے میں بٹھا آیا کریں۔

یہ سن کر میں تو برف کی سل بن گئی۔ یہ میرے بھائی کی بیٹی جسے میں ہمیشہ گود میں کھلایا کرتی تھی اور میری کوکھ سے جنم لینے والا میرا اپنا بیٹا پہلے کمزور سی آواز میں احتجاج کرنے کے لیے منمنایا۔۔۔ اور پھر میرے دونوں بیٹے ایسے رش والے نئے چوک، ہسپتال، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ پر بٹھا کر ارد گرد گھومتے رہتے۔ دونوں ایک دوسرے پر بھی نظر رکھتے کہ دونوں میں سے کوئی زیادہ حصہ نہ لے جائے۔ حاجرہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔۔۔ اور رافیہ حاجرہ کے خلوص اُس کے آنسوؤں اور دھڑکتے دل کی دھڑکن کے آگے بے بس محسوس کرنے لگی۔ اور دل میں سوچنے لگی میں اس خلوص، محبت اور احترام کے سامنے کتنی ہیچ ہوں۔ اسے صرف آدھا سچ ہی بتایا ہے وہ کچھ اور کہنا چاہ ہی رہی تھی حاجی نذیر احمد کمرے میں داخل ہوئے اور ہنستے ہوئے بولے میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ میری دونوں بیویاں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتی ہیں۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کچھ شور اُٹھا اور کچھ لوگ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ رافیہ نے دیکھا اُس کے دونوں بیٹے پولیس افسران کو لے کر کھڑے تھے۔ انہوں نے عدالت عالیہ میں جا کر ماں کے اغوا کا مقدمہ کر دیا تھا اور جج صاحب کے حکم پر ماں کو برآمد کرنے پہنچ گئے۔ حاجی نذیر ان لوگوں سے جرح کر رہا تھا کہ رافیہ نے چھت پر جا کر تیسری منزل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

حاجرہ اور حاجی نذیر دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ ایک ماں پھر سے بھکارن بننے کے بوجھ سے آزاد ہو چکی تھی۔

شیلا آئرن

برٹش انڈین آرمی کے میجر جنرل ہیکٹر پینٹ کی بیٹی شیلا آئرن پینٹ، ایک برطانوی خاتون تھیں۔ ان کی والدہ برہمن فیملی سے تھیں جنہوں نے کرسچن مذہب اختیار کیا تھا۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز بطور ٹیچر گوکھلے میموریل اسکول کلکتہ سے کیا۔ سن 1931 میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ اندر پرستھا کالج، دہلی میں بطور اکنامکس پروفیسر تعینات ہوئیں۔ آپ جانتے ہیں یہ پاکستانی تاریخ کی کون سی مشہور ترین شخصیت تھیں؟

شیلا آئرن پینٹ نے 1932 میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان شہید کے ساتھ شادی کی۔ تب مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے اپنا نام بیگم رعنا لیاقت علی رکھ لیا۔ یوں تو وہ بہت ہی عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار کی کی مالک تھیں لیکن ایک ایسا سچ جو بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو وہ یہ کہ جب وہ پاکستان کی سفیر بن کر ہالینڈ گئیں تو ہالینڈ کی ملکہ ان کی بہت گہری دوست بن گئی۔ ان دونوں کی اکثر شامیں شطرنج کھیلتے ہوئے گزرتی۔

ایک دن ہالینڈ کی ملکہ نے ان سے کہا کہ اگر آج کی بازی تم جیت گئی تو میں اپنا ذاتی شاہی قلعہ تمہارے نام کردوں گی۔ بیگم صاحبہ نے اس کی اس بات کو منظور کر لیا اور کچھ دیر بعد بیگم رعنا لیاقت علی شطرنج کی بازی جیت گئی۔ ملکہ نے وعدے کے مطابق شاہی قلعہ ان کے نام کر دیا۔

ماضی کے اس سچے واقعے کا ایک حیرت انگیز اور خوشگوار پہلو یہ ہے کہ بطور سفیر ان کی وہاں ملازمت ختم ہوئی تو اپنے اس ذاتی قلعے کو انہوں نے پاکستانی سفارت خانے کو ہدیہ کر دیا۔ آج بھی پاکستانی سفارتخانہ اسی شاہی قلعے میں واقع ہے۔

تندور والے کی کہانی

نصرت بخاری
(اٹک)

اس کا نام طور تھا لیکن اصل نام "طُورہ" کے پیچھے چھپ گیا تھا۔
گاؤں کے ہائی سکول میں ہم اکٹھے پڑھتے رہے، مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے شہر کے ایک اچھے سکول کی چھتری مل گئی، لیکن اسے اسی سرکاری سکول کی چھت میسر تھی۔ وہ پڑھ تو رہا تھا لیکن باپ کا ہاتھ بٹانے کی وجہ سے، بہت سا وقت تندور کی نذر ہو جاتا؛ کیونکہ اس کا باپ تندور پر روٹیاں لگاتا تھا۔ ابّو بتایا کرتے تھے کہ یہ تندور والا اُن کا ہم عمر ہے اور میرے ابّو کی عمر چالیس سال تھی۔ تندور والے کی شکل اس کی اصلی عمر نہیں بتاتی تھی، اس لیے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑا دکھائی دیتا تھا۔ میرے ابّو صحت مند تھے اور اِن کے سفید بال کہیں کہیں سے جھانکنے لگے تھے لیکن تندور والے کے تو ڈاڑھی، سر کے سارے بال سفید تھے۔ شکل سے تو وہ دادا جان کا ہم عمر لگتا تھا۔ یہ بات مجھے اپنی موجودہ عمر سے اب معلوم ہوئی کہ بڑھاپا اس پر کیسے حاوی ہو گیا۔ غربت اور بیٹیوں کا بوجھ واقعی بے بس انسان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیتا ہے۔ میں اسے چاچا کہا کرتا تھا:

"چاچا جلدی کر، مجھے ابّو نے بھیجا ہے۔ میں روٹیاں لینے جاتا تو کہتا۔

"کیوں بھئی! تیرے ابّو کو بھوک لگی ہے"؟۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھے چھیڑتا۔ طور یہ باتیں سن کر مسکراتا رہتا۔

طور بہت لائق طالب علم تھا۔ اس کا دماغ کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا۔ جو سوال یا جو تحریر اسے سمجھا پڑھا دی جاتی، کمپیوٹر کی طرح اس کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی۔ نصابی و ہم نصابی سرگرمیاں اسے سکول میں نمایاں کرتی جاتی تھیں۔ استاد صاحب اس کی لیاقت دیکھ کر کہتے:

"طور! تم بڑے ہو کر کیا بنو گے"؟

"ماسٹر صاحب! میں ڈاکٹر بنوں گا"۔

"تم ڈاکٹر بن گئے تو ہماری روٹیاں کون پکائے گا"۔ ایک حاسد لڑکے نے طنز کیا۔ اس کے طنز کے نشتر سے طور کا تمتماتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔

"تم خاموش رہو۔ طور ڈاکٹر بنے گا اور ضرور بنے گا اور جیسی تمہاری عادتیں ہیں، مجھے لگتا ہے کہ گاؤں والوں کی روٹیاں تم پکایا کرو گے"۔ استاد صاحب نے اس حاسد لڑکے کو ڈانٹا۔

پھر وہ وقت آ گیا جب دنیا نے سنا کہ ایک غریب مزدور کے بیٹے طور نے بورڈ میں ٹاپ کر لیا۔ ملک کا ہر چینل اس کی وہ غربت دکھا رہا تھا، جس کو جھیل کر اس نے بورڈ ٹاپ کیا تھا، اس کا باپ تندور پر بیٹھا تھا۔ وی والوں کو انٹرویو دے رہا تھا:

"مجھے نہیں پتا یہ کس وقت پڑھتا ہے۔ کس وقت سوتا ہے۔ یہ تندور پر سارا دن میرے ساتھ کام کرتا ہے"۔

"یہ کسی سے ٹیوشن پڑھتا ہے"؟۔ ٹی۔ وی نمائندے کے سوال میں حیرت تھی۔

"نہیں جی! ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ اسے ٹیوشن پر لگائیں"۔

"تو پھر اس کی عمدہ کامیابی کا راز کیا ہے"۔

"اس کی محنت ہے۔ ہماری اور استادوں کی دعائیں ہیں۔ اللہ پاک کا احسان ہے"۔

"آپ کا بیٹا آگے کیا کرے گا۔ کہاں تک پڑھے گا"۔

"وہ تو کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں گا لیکن میرے پاس نہ پیسے ہیں، نہ وسائل ہیں۔ اگر پیسوں کا بندوبست ہو بھی جائے تو ایک تندور والے کا بیٹا کیسے ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ اگر حکومت ہماری مدد کرے تو شاید میرا بیٹا ڈاکٹر بن جائے"۔

"آپ کا بیٹا ضرور ڈاکٹر بنے گا۔ ہم اس کی آواز بنیں گے۔ ہم اسے سہارا دیں گے"۔ مختلف ٹی۔ وی چینلز کے نمائندے آتے رہے اور انٹرویو لیتے رہے لیکن مجھ سمیت ہر شخص حیران تھا کہ اس بچے کو تعلیم کی اضافی سہولیات تو چھوڑیں ،بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں، فرسٹ پوزیشن کیسے اس کے گلے کا ہار بن گئی۔

ایک معروف کالج نے اسکالر شپ کی پناہ میں لے لیا۔ وہ کالج جانے تو لگا تھا لیکن تندور اس کی زندگی کے شب و روز سے نکلا نہیں تھا۔ وہ اسی طرح باپ کے ساتھ تندور پر کام کرتا تھا۔

"دیکھ بھیا! اس بچے کی جان چھوڑ دے۔ یہ پڑھنے والا بچہ ہے۔ تو کوئی مزدور رکھ لے"۔ اس کے باپ کے جاننے والے اسے مشورہ دیتے۔

"لالہ جی! اس مزدوری میں اتنے پیسے کہاں بچتے ہیں کہ میں مزدور رکھ لوں"۔ اس کا والد ہر ایک کو لالہ جی کہا کرتا تھا۔

اسی دوران طور نے بارھویں کا امتحان بھی پاس کر لیا؛ اگرچہ اس بار وہ بورڈ میں نمایاں پوزیشن نہ لے سکا لیکن اس کے نمبر نوے فی صد سے زیادہ تھے اور وہ ضلع کا نمایاں ترین طالب علم تھا۔

اس کے بعد میرے والد صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور ہم لوگ ایک دور دراز علاقے میں منتقل ہو گئے جہاں مجھے نیا کالج اور نئے دوست مل گئے۔ سابق دوستوں کی تصویریں آہستہ آہستہ نگار خانہ خیال سے اترنے لگیں۔ البتہ ہمارے گھر میں کبھی کبھی طور کا ذکر ہو جاتا۔ اس شہر نے طویل عرصے تک ہماری کفالت کی ،اس لیے والد صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں اِسی شہر میں گھر بنا لیا۔ وہ جب ریٹائر ہوئے تو اس وقت ایک اچھی نوکری میرے ساتھ چل پڑی تھی؛ اسی دوران میں اسی علاقے کے ایک معزز خاندان کی لڑکی سے میری شادی ہو گئی؛ اس سے میرے دو بیٹے بھی پیدا ہوئے۔ جس کی وجہ سے میری مصروفیات نے ایسا جکڑ لیا کہ آبائی گاؤں میں آمد و رفت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی؛ البتہ والدین کے آنے جانے کا سلسلہ بحال تھا۔

باقی صفحہ ۷۹ پر ملاحظہ کیجیے

''شمس حیراں ہے''

عبدالحمید عدم
(۱۹۱۰ء۔۱۹۸۱ء)

آپ ہیرا، صدف، نگیں، کیوں ہیں؟
آپ بے انتہا حسیں، کیوں ہیں؟

آپ کی کاکلوں کے جنگل میں
اتنی موسیقیاں مکیں، کیوں ہیں؟

چاند خود بھی نہیں سمجھ پایا
آپ اس درجہ مہ جبیں، کیوں ہیں؟

شمس حیراں ہے، آپ کے عارض
پھول ہو کر بھی، آتشیں کیوں ہیں؟

آپ اتنے دروغ گو ہو کر
اس قدر قابلِ یقیں، کیوں ہیں؟

شاعروں کے دلوں پہ آپ چلیں
گامزن، برسرِ زمیں، کیوں ہیں؟

جتنے بے رحم دلربا ہیں، عدم
اتنے محبوب، دلنشیں، کیوں ہیں؟

❍

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

کون واں سارے کا سارا جائے گا
روح کا اک استعارا جائے گا

جسم کو دے دینگے مٹّی لوگ باگ
چھوڑ کر پیارے سے پیارا جائے گا

میں نہ ہونگا تو کہاں، آخر کہاں
ذہن کا میرے پٹارا جائے گا

کیا ہوا لے جائے گی سب حرف حرف
کیا مرا اک اک اشارا جائے گا

دل کے اندر شہر اک آباد ہے
کس جگہ یہ دل بچارا جائے گا

رابطہ میرا رہا، کاغذ کے ساتھ
مجھ کو کاغذ پر اُتارا جائے گا
(ق)
میرے کاغذ پر اُتر آنے کے بعد
کیا مرے کاغذ کو مارا جائے گا

جانے کن وقتوں تلک جاویؔد جی
تم کو لے کر ''وقت دھارا'' جائے گا

❍

افتخارعارف

(اسلام آباد)

جاہ و جلال، دام و درم اور کتنی دیر
ریگِ رواں پہ نقشِ قدم اور کتنی دیر

اب اور کتنی دیر یہ دہشت، یہ ڈر، یہ خوف
گرد و غبار عہدِ ستم اور کتنی دیر

حلقہ بگوشوں، عرض گزاروں کے درمیان
یہ تمکنت، یہ زعمِ کرم اور کتنی دیر

پل بھر میں ہو رہے گا حساب نبود و بود
پیچ و خم و وجود و عدم اور کتنی دیر

دامن کے سارے چاک، گریباں کے سارے چاک
ہو بھی گئے بہم تو بہم اور کتنی دیر

شام آ رہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا
تُم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

○

اخترشاہجہاں پوری

(بھارت)

یہ مانا بے سرو سامان ہوں میں
مگر اس قافلے کی جان ہوں میں

دِکھاوے کی یہ سب شادابیاں ہیں
مگر اندر بہت ویران ہوں میں

یقیں کرنا پڑے گا تیرگی کو
نمودِ صبح کا اعلان ہوں میں

مِرے نقشِ قدم پر چل کے آؤ
تمہاری فتح کا اِمکان ہوں میں

مجھے پہچانتی ہے ساری دنیا
مگر خود سے ابھی انجان ہوں میں

مجھے پڑھ جہاں سے جو بھی چاہے
مگر اتنا کہاں آسان ہوں میں

نہ جانے کس گھڑی لغزش ہو اختؔر
فرشتہ مت کہو انسان ہوں میں

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

یار کی مہربانی لگتی ہے
منجمد ہر روانی لگتی ہے

سر پہ چھائے ہیں سائباں کتنے !
کتنی بے سائبانی لگتی ہے

میں جو اتنا مطیع لگتا ہوں
عشق کی حکمرانی لگتی ہے

جو گزاری ہے زندگی مَیں نے
اب جو سوچوں، کہانی لگتی ہے

وقت جامد سا ہو گیا شاید !
جو خبر ہے، پرانی لگتی ہے !

عشق میں مجھ کو وسعتِ صحرا
اپنی ہی راجدھانی لگتی ہے

پیاس کی شدتیں کچھ ایسی ہیں
پیاس بھی مجھ کو پانی لگتی ہے

میری رُوداد سُن کے وہ بولے
یہ تو میری کہانی لگتی ہے !

○

پرتپال سنگھ بیتاب
(جموں، کشمیر)

جستجو دے تو لامکانی دے
اور آثارِ غیر فانی دے

اُفقِ نَو دے جاودانی دے
میرے خوابوں کو زندگانی دے

آگ دریاؤں میں لگی ہے بہت
برف سیلاب ناگہانی دے

پھیلتا جا رہا ہے یہ صحرا
کچھ سمندر کو بیکرانی دے

زیست اگر ہے تو دے یہی دنیا
موت اگر دے تو آنجہانی دے

لے لے میرے حوادثِ کہنہ
اور مجھے اک نئی کہانی دے

اپنے ہونے کی مَیں خبر لایا
میرے حصے کی مُودگانی دے

کوہ در کوہ منجمد بیتابؔ
برف کو دھوپ دے روانی دے

○

ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی شاہدؔ

(کینیڈا)

روح میں کیوں سما گئے ہو تم
میری ہستی پہ چھا گئے ہو تم

شرم ساری ہی اب مقدر ہے
آئنہ یوں دِکھا گئے ہو تم

اور کچھ اب نظر نہیں آتا
ہر نظارے پہ چھا گئے ہو تم

من کے مندر میں اک عورت ہے
سخت کافر بنا گئے ہو تم

دل کی حالت سدھر نہیں پائی
جب سے خوابوں میں آ گئے ہو تم

اب ہے شاہدؔ اور اس کی مدہوشی
نقشِ حیرت بنا گئے ہو تم

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

زندگی کی رہگزاروں سے گزر جانے کے بعد
کھوئے کھوئے بیٹھے ہیں کچھ یاد آنے کے بعد

چھپ نہیں سکتی حقیقت گو ملمّع شوخ ہو
سب اُبھر آتا ہے اک دن رنگ اُتر جانے کے بعد

اُس سے کیا شان تھی اور کیسے کیسے زُعم تھے
یاد آتے ہیں وہ لمحے اب گزر جانے کے بعد

جو حوادث میں نے دیکھے اس جہاں میں گردوپیش
دل دہل جاتا تھا وہ منظر نظر آنے کے بعد

دیکھ کر ظلم و ستم یوں لگ رہا تھا روز و شب
زندگی بدلے گی لیکن روح نکل جانے کے بعد

چھا گیا تھا وقت ایسا یوں نظر آتا تھا واں
جیسے ظلمات کا سماں سورج کے ڈھل جانے کے بعد

جور و الفت کے اصولوں میں تصادم رات دن
پر سمجھ آئے گی سب کو جاں پہ بن جانے کے بعد

کاش ہم لیں جائزہ اپنے عمل کا اب ریاضؔ
کون پلٹا ہے جہاں میں خاک بن جانے کے بعد

○

آفتاب مضطر
(کراچی)

تجھ گفتگو میں اک ثبات، باتوں میں تیری، خاص بات
چھلکا ہُوا آبِ حیات، ے خانۂ خاصانِ تُو

تُو جو پکارے پیار کو، چنگا کرے بیمار کو
کرے دے سُبک آزار کو، پیمانۂ درمانِ تُو

جو دوست تیرا خلوتی، ہو صد جہت سے بجتی
ہو صد شرف سے خلعتی، وابستۂ دربانِ تُو

جو تجھ میں ہے اک سادگی اور سادگی میں خرّمی
یہ سادگی و خرّمی، ہے طرّۂ صد شانِ تُو

تیری کہانی کا سمیٹ، اَسطُورگی کا بھر دے پیٹ
سَو داستاں رکھّے لپیٹ، اَسطُورۂ پیچانِ تُو

کیا ڈھنگ ہے اسلوب کا، کیا رنگ ہے مضطر ترا
رنگینیِ اوزان ہا، در حلقۂ میزبان تُو

○

نبیل احمد نبیل
(لاہور)

تمھارے عشق کی راہوں سے مُسلک دُکھ ہے
عدو کی سوچ سے تم بھی ہو متفق، دُکھ ہے

کٹھن ہیں راہیں سبھی اِن سے مُسلک دُکھ ہے
کسی کی باتوں سے تم بھی ہو متفق، دُکھ ہے

جہاں کے لوگ گلی کے ببول، پھول سبھی
ہوئے ہیں ساتھ تمھارے جو متفق، دُکھ ہے

تمھارے شہر کے رستوں کی خاک چھانی ہے
تمھارے شہر کے رستوں سے مُسلک دُکھ ہے

تمھارے نام کا خانا بنا نہیں کوئی
کدھر کو جاؤں کہاں پر لگاؤں ٹِک دُکھ ہے

تمام شہر ہی گریہ پہ کیوں نہ اُترے یہاں!
سبھی نظام غلط ہے، یا ایک شِق، دُکھ ہے؟

ہماری آنکھ سے آنسو نہ کیوں رواں ہو میاں!
کسی کے ہاتھ گیا گھر کا گھر ہی یک دُکھ ہے

مرے نصیب میں کانٹے تھے چن لیے میں نے
ترے دیار کی خوشبو ہوئی نہ پِک دُکھ ہے

کسی کے عشق میں بیمار پڑ بھی سکتے تھے
کسی کے عشق میں ہونا پڑا نہ سِک دُکھ ہے

تمھارے قُرب میں ہم کو سکوں بھی مل جاتا!
نہیں سکون میسّر کسی بھی نِک دُکھ ہے

نبیل اُس کو سہولت سے کھو دیا ہم نے
تمام عمر کا حاصل یہ ایک ''اِک'' دُکھ ہے

ہمارے نام سے نسبت اُسے کہاں ہے نبیل!
کسی کے نام کا چینل کِیا "کلک" دُکھ ہے

دائرے میں اِک دائرہ

سیمیں کرن

(فیصل آباد)

پروفیسر صاحب نے سویرا ملک کی جانب اِستفہامیہ نگاہوں سے دیکھا گویا کہتے ہوں کہ اب بھی بات واضح ہوئی یا تنقید وتعریف کسی بھی صورت کہنے کو کچھ باقی ہے۔ سویرا ملک پروفیسر صاحب کی نگاہوں کے مفہوم کو پا کر مسکرائی: ''جی پروفیسر صاحب! شاید سمجھ تو گئی ہوں میں آپ کے Magic Realism کے نظریے کو مگر شاید پوری طرح ہضم نہیں کر پائی کیونکہ بڑا خیال و بڑی سوچ ہے'' پروفیسر صاحب سنجیدگی و سادگی سے گویا ہوئے: ''نہیں بلکہ میرے خیال میں تو شاید اِک آزمودہ تیر بہدف نسخہ و طریقہ کار رہا ہے۔ تخلیق کار کا تو کیا Migic Realism حالات سے فرار اِک Escape کا نام ہے؟'' پروفیسر صاحب کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی وہ بولے: ''آپ کہہ سکتی ہیں ایسا ہے بھی اور نہیں بھی۔ اثبات و نفی دونوں ہی اِس دائرے میں کارفرما ملیں گے آپ کو۔ بعض اوقات یہ حالات و واقعات سے فرار کی شدید خواہش میں اِک خوابوں کی ایسی سرزمین تخلیق کرنے کا عمل ہے کہ حقیقت کا گمان ہو اور بعض اوقات تخلیق کار کا ذہن اپنے زمانے سے کئی سو سال آگے دیکھ اور سوچ رہا ہوتا ہے اور معاشرے کے بگاڑ میں اصلاح کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ لکھاری یا تخلیق کار اپنے مشاہدے مراقبے و مکاشفے سے کام لے کر ایسی دُنیا کی تصویر تخلیق کرتا ہے جہاں اس کے خواب ناکام حسرتیں اُس کا گہرا مشاہدہ کائنات اور تجربہ حیات اِک ایسی ندرت کے ساتھ نظر آتا ہے کہ تخیل و خواب پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہی ہے ''Magic Realism''۔

سویرا نے سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور پروفیسر صاحب سویرا کو دیکھ کر مسکرائے: ''کیوں سویرا بی بی! میرے خیال میں اَب تو آپ بات کو سمجھ گئی ہوں گی'' سویرا نے بھی جوابی مسکراہٹ اُچھالی: ''جی پروفیسر صاحب! میرے خیال میں مَیں سمجھ گئی مگر میں آپ کے تصور و خیالی طاقتِ پرواز کو داد دوں گی کہ آپ نے بہت دور کی سوچی'' پروفیسر صاحب ذرا شگفتگی سے گویا ہوئے: ''شکر ہے آپ نے یہ نہیں کہا کہ اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی'' سویرا ملک کھلکھلا کر گویا ہوئی: ''توبہ کیجئے پروفیسر صاحب میں بھلا اِس گستاخی کی متحمل ہو سکتی ہوں'' مگر۔۔۔ وہ کچھ دیر کو جیسے کسی افسردہ سوچ کے حلقے میں گھر کر بولی: ''یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے اردگرد اتنا ہی اندھیرا ہے کہ۔۔۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے واقعی بہت دور سے روشنی کو مقید کر لیا'' پروفیسر صاحب بھی باز نہیں آئے: ''تو گویا آپ دوسرے لفظوں میں میری بات کی تائید کر رہی ہیں کہ اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھ گئی''

سویرا ملک نے توبہ توبہ کرتے ہوئے اپنی فائل اور بیگ سمیٹا اور شگفتہ موڈ لیے اُٹھتے ہوئے بولی: ''میرے خیال میں مجھے رخصت ہی لے لینی چاہیے اسی میں عافیت ہے میری''۔ پروفیسر صاحب بھی شفقت سے مسکرائے اور گویا ہوئے: ''جیتی رہو سویرا بی بی آپ جیسے اچھے اور محنتی لوگ واقعی نیا سویرا ہیں۔ اندھیرے میں اِسی لگن سے کام کرتی جایئے تو آپ کی ترقی کے بہت امکانات روشن ہیں اور ہوں گے'' سویرا ملک نے دزدیدہ نگاہوں سے پروفیسر صاحب کا چہرہ دیکھا وہاں لہجے کی سچائی، سادگی و خلوص کا اُجالا پھیلا ہُوا تھا۔ بقول اس کے نکھٹو نیم خواندہ خاوند کے یہ کِسی مرد کا پھینکا ستائش کا پھندہ و پُھندانہ تھا کہ جس میں بنتِ حوا اکثر اُلجھ کر گِرتی ہے اور جب جب اُس کا شوہر انتہائی ستے اور بازاری قسم کے الفاظ میں اُس طبقے کی خواتین کا، پڑھی لکھی عورت کا جو مرد کے معاشرے میں مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات و کام کر رہی ہے، کا ٹھٹھا لگاتا تو کبھی وہ چیخ پڑتی اور کبھی ضبط کی آخری حدوں پر کھولتے ہوئے سوچتی: ''ستائش کا پھندا و پُھندا ہے تو کیا صرف بنتِ حوا پہ اثر انداز ہے۔ اس میں ابنِ آدم بھی تو اسی طرح اُلجھتا ہے کرخت تر چہرے پہ اِک نامعلوم سی نرمی و چمک آجاتی ہے تو الزام صِرف عورت پہ کیوں؟'' مگر وہ جانتی تھی کہ وہ یہ بات اپنے شوہر کو کبھی نہیں سمجھا سکے گی اور وہ ہمیشہ اسے اسی طرح ذہنی اذیت دیتا رہے گا اور اُس کے پیسے پر عیش کرنا بھی نہیں چھوڑے گا۔

سویرا ملک اِک نامور صحافی تھی۔ اِک مشہور اخبار کے میگزین کی انچارج تھی اور ادبی کام وہ خصوصی دلچسپی سے کرتی تھی۔ اِک نامور افسانہ نگار تھی۔ اس کے اندر اِک ناقد اور متجسس روح بستی تھی جو ہر دَم اسے مستعد و بے چین رکھتی تھی۔ جو سب کچھ جان لینے پر آمادہ رہتی، آرزو رکھتی۔ پروفیسر صاحب کا ناول حال ہی میں اُس کے زیرِ مطالعہ رہا تھا۔ پروفیسر حسن صادق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ سویرا ملک کو اپنے میگزین کے لئے اُن کا انٹرویو کرنے کا پروگرام جو اِک عرصے سے سرد خانے میں پڑا نظر آتا تھا۔ اُس میں از سرِ نو اِک حدت و جدت جاگ اُٹھی ناول گویا اِک بہانہ بن گیا۔ ناول کے پس منظر میں سوالوں کی اِک پٹاری تیار کر کے وہ آج اسی سلسلے میں پروفیسر حسن صادق سے ملنے آئی تھی۔

ملاقات انتہائی خوشگوار رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ انٹرویو بہت اچھا اور غیر رسمی رہا تھا بلکہ اندر اُبلتے و کھولتے سوالوں کو جواب ملنے پر ایک عجب ٹھنڈک راحت و آسودگی کا احساس ملا تھا۔ وہ اِسی پُر آسودہ مسکراہٹ اور سرشاری کے ساتھ، اِک بے دھیانی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی اور شاید یہی اس کی غلطی تھی اور غلطی کی بہرحال اِک سزا ہوتی ہے۔

عاطف کی تیز نگاہوں نے اس کی حالت کو بھانپا اور بڑے تمسخرانہ لہجے میں بولا: ''وہ دیکھو آئی ملک کی معروف افسانہ نگار۔ بڑی کِھلی پڑتی ہو لگتا ہے آج پھر کسی اُلو کے پٹھے نے تمہیں بانس پر چڑھا دیا'' سویرا کو یوں لگا اُسے عرش سے کسی نے حقیقتاً فرش سے بھی نیچے تحت الثریٰ تک پٹخا ہو۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے عاطف کو تکے گئی۔ اس نے دِل میں سوچا: ''کیا اس شخص کی پست سوچ کا کوئی علاج ہے؟ یقیناً نہیں تو کیا کبھی وہ وقت آئے گا کہ میں اِس تذلیل کی عادی ہو جاؤں گی۔ شاید نہیں۔ انسان فطرتاً عادت پسند ہی سہی مگر ذلت و تحقیر واحد چیز

ہے جس کی عادت انسان کو نہیں ہو پاتی۔حتیٰ کہ محبت میں درد تو سہہ جاتی ہے مگر اپنی تذلیل نہیں برداشت کرتی'' اُس نے پھر خود سے سوال کیا:''تو وہ کیوں عاطف کے ہاتھوں اتنی ذلت برداشت کرتی ہے؟ کیا وہ اس کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ اُس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔کیا وہ اس سے محبت کرتی ہے؟'' وہ خود سے سوال و جواب میں مصروف تھی کہ عاطف کی آواز نے اُسے حال میں اِکبار پھر لا پٹخا۔

''ارے اب یہیں بُت بنی کھڑی رہو گی یا کوئی روٹی پانی کی فکر بھی کرو گی یا یہاں پر کھڑے کھڑے کسی افسانے، کالم یا کسی رائٹر کے بارے میں غم کھا رہی ہو؟'' سویرا نے اِک آہ بھری اور خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب رُخ کیا۔ اُس وقت وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ مزید کسی بک بک چخ چخ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لئے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔یوں بھی یہ اِک لا حاصل جنگ تھی۔اِس طرح کی جانے کتنی لڑائیاں لڑی جا چکی تھیں اُن کے بیچ، جن کا کوئی بھی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔اُسے اپنے شادی کے بعد کے وہ سہانے ایام یاد آئے جب اُس نے اِس پُر خار وادی کو سپنوں کی دُنیا سمجھ کر قدم رکھا تھا۔انہی سپنوں بھرے مہکتے دِنوں میں اُس نے عاطف کو اپنے سپنوں کا شہزادہ سمجھ کر اپنی ہر سوچ، ہر خواب، اپنی جاب کی نوعیت اور بہت کچھ اس سے بانٹا تھا اور یہ انہی دِنوں کا بھگتان تھا جو پھر اُس نے تمام عمر دِیا۔ وہ کتنی نادان ہوتی تھی اُن دِنوں۔اُس نے آہ بھر کر سوچا۔یہ رشتہ اُس کے گلے میں پھنسی چھچھوندر بن کر رہ گیا تھا۔جسے نہ وہ اُگل سکتی تھی اور نہ نگل پاتی تھی۔

عاطف اُس کا سیکنڈ کزن تھا۔مگر سویرا ملک کی ایک بہن عاطف ہی کے بھائی کے ساتھ بیاہی تھی اور اُس کی ایک بھابی عاطف کی سگی بہن تھی۔اس پر مستزاد یہ کہ اس کی شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی اماں بھی چلی گئیں۔وہ جیسے بھرے میلے میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔اُس کے بہن بھائیوں نے گویا اس کی جانب سے دانستہ طور پر آنکھیں موند لیں تھیں شاید فائدے نقصان کے اوزان میں کم نقصان کا چناؤ ہی وقت وحالات کا تقاضا تھا۔اُس نے یہی سوچ کر ہمیشہ خود کو سمجھایا تھا اور اس کی انہی کمزوریوں نے ہمیشہ عاطف کو مزید ہلہ شیری دی تھی۔وہ جانتا تھا کہ وہ اس کو نہیں چھوڑ سکتی اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اِک نالائق، نااہل اور کام چور آدمی ہے اور شاید اپنی اسی کمی کو چھپانے یا دبانے کے لئے وہ ہمیشہ اپنی برتری قائم کرنے کی کوشش میں سویرا کو دفاعی رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا۔

وہ دُکھی اور رنجیدہ تو تھی ہی، اندر غصہ و رنج جیسے دبے پڑے تھے۔ رات کھانے پر پھر کسی معمولی بات پر جھڑپ ہو گئی۔وہ غصے میں جیسے بھری بیٹھی تھی۔ اُس کا غصہ کسی بہت زیادہ ہَوا بھرے غبارے کی طرح پھٹا اور جیسے بہت کچھ بہا کر لے گیا۔عاطف اتنے غصے سے چیخا کہ اُس کی آواز پھٹ گئی:''گندی بے غیرت عورت تو میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔تُو ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے دفع ہو جا۔۔۔'' وہ اور بھی نجانے کیا بکتا جھکتا رہا مگر سویرا اُس سے دُگنی طاقت سے چلائی:''میں تم پر تمہارے گھر پر لعنت بھیجتی ہوں۔جہنم ہے یہ گھر نہیں ہے۔مرو تم یہاں پر میں جا رہی ہوں جہاں بھی رہوں گی کسی دارلامان میں رہ لوں گی۔میری دو روٹیاں کسی پر بھاری نہیں پڑیں گی۔میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔نفرت ہے مجھے تم سے دَم گھٹتا ہے تمہارے ساتھ میں۔میں تمہاری گندی سوچ، گھٹیا الزامات سے تنگ آ گئی ہوں۔تمہیں پالوں بھی اور تمہارے طعنے بھی سُنوں اور۔۔۔''

غرض اُس کے منہ میں جو آیا بولتی چلی گئی۔وہ سب جو سینے میں گھٹا پڑا تھا۔وہ جو کہہ ڈالنے کی حسرت تھی۔اُس نے گویا اُس ناسور کو بہنے کا موقع و روزن دے دیا تھا اور اسی غم و غصے میں وہ عاطف کا گھر چھوڑ کر دروازے پر زور سے لات مارتی ہوئی وہاں سے ہمیشہ کے لئے آ گئی۔

جب وہ اس ابتر حالت میں بھائی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی تو اپنی ابتر حالت پر اِک دفعہ پھر اُسے رونا آیا اپنی رائیگانی و ارزانی پہ اِک لمحے کو دِل کو پچھتاوں نے گھیرا۔اُس کا دِل چاہا وہ یہیں سے واپس لوٹ جائے اپنے گھر اور اپنے آپ کو مزید تماشا ہونے سے بچا لے مگر اپنا گھر اِک بہت بڑے سوالیہ نشان کی صورت اُس کے سامنے آ کھڑا ہُوا۔اُس نے اِک آہ بھری اپنے بکھرے منتشر اعصاب کو یکجا کرنے کی کوشش کی وہ جانتی تھی جس دروازے کو وہ کھٹکھٹا رہی ہے وہاں بھی اِک اور آگ کا دریا اُس کا منتظر ہے۔وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کو آخر کہاں پناہ ملے گی؟ شاید کسی ریل کی پٹڑی پر، خواب آور گولیوں کی شیشی میں یا پھر چھت سے لٹکتے ہوئے دوپٹے کے پھندے کو چوم کر۔وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔اُس نے گویا اِک اندھی کھائی میں چھلانگ لگائی تھی۔

اس نے دروازے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھایا دروازہ کسی بھولی بھٹکی خوش قسمتی کی مانند کھلا تھا۔اُس نے اسے نیک شگن جانا اپنے تئیں۔وہ مزید آگے بڑھی تو سامنے تخت پر اماں بیٹھی تھیں۔حیرت سے اس کا منہ مضحکہ خیز انداز میں کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس نے زور سے اپنے آنکھیں ملیں اور خود ہی ہاتھ پر اِک چٹکی بھری، اِک سسکاری سی منہ سے خارج ہوئی۔اُسے یقین ہُوا کہ وہ حالتِ خواب میں نہیں۔وہ ماں کے شفیق سینے میں یوں چھپ گئی جیسے دِن رات میں چھپ جاتا ہے۔وہ سسکتی رہی، بڑبڑاتی رہی:''اماں! میری اماں! کہاں چلی گئی تھیں؟ کیوں چلی گئی تھیں؟'' اماں اُسے سہلاتے ہوئے اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولیں:''ہائے میری بچی! میں تمہارے لیے، تم سب لوگوں کے لئے واپس آ گئی ہوں۔میں جان گئی ہوں میرا چلے جانا کس قدر غلط تھا مگر شاید قسمت اسی کو کہتے ہیں۔اب میں آ گئی ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا'' اور اماں اُس کے لئے ایک ڈھال کی مانند اِک چٹان کی طرح کھڑی ہو گئیں۔اُنہوں نے عاطف کو آڑے ہاتھوں لیا کچھ اس طرح کہ وہ دُبک کر کچھ سہم کر بیٹھ گیا۔اماں ہیں ہی اتنی دبنگ۔انہوں نے عاطف کو صاف کہا کہ''تم کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔سویرا اگر اُجڑے گی تو اس رشتے کے ساتھ جُڑے باقی رشتے بھی سلامت نہیں رہیں گے۔بات بہت دور تک چلی جائے گی'' اِک اماں کے واپس آ جانے سے اُس کی کمزوری ہی اس کی قوت بن گئی تھی۔بہن بھائی اماں کے سامنے تو نہیں بول سکے تھے بلکہ اپنی تمام تر زیادتی اور ڈھٹائی پر شرمندہ تھے۔مگر سویرا نے اماں کو تھام کر کچھ اِس لجاجت اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے التجا کی:''اماں! ابھی کچھ عرصہ بس کچھ عرصہ بھی نہ کہیں کچھ بھی نہ کریں۔بس صرف سکوت و سکون قبر جیسا مجھے کہیں چھپا لیں۔چلیں اماں کہیں دور کسی

جزیرے پر چلتے ہیں کسی گھنے جنگل میں چل کر کٹیا بناتے ہیں۔۔۔جہاں میں اور بس تم۔۔۔کوئی نہ ہو۔اتنا سکوت ہو کہ ٹوٹتے پتے کی صدا بھی سُنائی نہ دے۔ میرے من پہ، میری روح پہ یہ بڑی کثافت جم گئی ہے۔اماں مجھے اِسے دھو لینے دو کچھ دیر کے لئے مجھے کہیں چھپالو۔اماں! بہت تھک گئی ہوں میں‘‘۔

اماں اپنی اس پیاری سی اتنی ذہین فطین سی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر بے بسی سے کڑھ کر رہ گئیں اور خود بھی آنکھیں بھگو بیٹھیں اور اُسے دیکھتے ہوئے بولیں: ’’تم، جیسے کہو گی میری بیٹی ویسے ہی ہوگا۔مجھے پتہ ہے تمہارا سارا سفر آبلہ پائی کا ہے تمہیں واقعی آرام درکار ہے‘‘۔اور پھر اماں نے جو کہا وہ کر دِکھایا اُن کی آمد پر جو ہنگامے جاگ اُٹھے تھے وہ ذرا سرد پڑے تو وہ اُسے لے کر گاؤں آ گئیں۔گاؤں میں آ کر اُسے فطرت کے قریب اِک عجیب سی آسودگی کا احساس ہُوا۔وہ اِک طویل رات کے بعد جیسے سچی نکھری سویر تھی۔ابھی نور کا تڑکا پوری طرح نہ پھیلا تھا۔ وہ دِن تھے جب چاند صبح تک آسماں پہ نظر آتا ہے۔وہ خاموشی سے گھر سے نکل کر گھر سے منسلک مالٹوں اور کینوؤں کے باغ میں آ گئی اور قدرے فاصلے پر لگے نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔کتنا سکون و سکوت تھا۔درخت سے اِک پتہ ٹوٹا اور اس کی گود میں آ گرا۔اُسے لگا کچھ دِن، کچھ قرن بیتیں گے تو اس کی روح کی ساری کثافت دُھل جائے گی۔کچھ اس طرح کہ وہ پتوں کے ٹوٹنے، چٹخنے اور کائنات کے سکوت کی آوازوں کو سمجھنے کے قابل ہو جائے گی۔اُس نے پوری کھلی آنکھوں سے اِس ہرے بھرے منظر کو جذب کیا اور سکون سے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔سکون کے لمحوں میں بہتے اُسے ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ کسی نے بُری طرح اس کا کندھا جھنجھوڑا۔وہ بڑ بڑا کر گویا ہوش میں آ گئی۔اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔عاطف اُس کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا اور غصے سے اُونچی آواز میں بول رہا تھا: ’’تم یہاں سوئی مری پڑی ہو کچھ گھر کی ہم سب کی فکر ہے یا نہیں۔دفتر میں مزے کر کے آ گئیں اور اب پلنگ توڑ رہی ہو‘‘۔

وہ خالی نظروں سے کچھ دیر اُسے تکے گئی۔حیرت سے اپنے اردگرد دیکھا وہ کہاں تھی؟ کیا جو دیکھا تھا وہ محض اِک خواب سراب تھا؟ صرف خواب تھا تو حقیقت سے اتنا قریب کہ جیسے انگلیوں پر ہی نہیں اُس کے روح و دِل پر بھی اپنا لمس چھوڑ جائے۔وہ کچھ دیر خاموش و مکمل غائب دماغی سے اردگرد کا جائزہ لیتی رہی۔اسے لگا کہ اُس کا جسم ہی شاید یہاں تھا۔اُس کی روح واقعی کہیں اور سیر کرتی رہی تھی۔اس سیر نے اُس کو کتنا سکون و طمانیت بخشی تھی۔اُس کی روح واقعی پروں سے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

عاطف اُس کے یوں خاموش بیٹھے رہنے پر قدرے ہونق پن پر جھنجھلا کر بولا: ’’اَب کیا ہُوا؟ کیوں بے وقوفوں کی طرح خاموش بیٹھی ہو؟ یہ کیا ڈرامہ ہے ؟ کیا کر رہی ہو؟‘‘ وہ بڑے پُراسرار انداز میں مسکرائی اور گویا ہوئی: ’’کچھ بھی تو نہیں ، اِک بہت بڑے دائرے میں اِک چھوٹا سا دائرہ بنا کر آئی ہوں۔۔۔ہاں ۔۔۔بالکل بہت بڑے دائرے میں مَیں نے اِک چھوٹا دائرہ بنانا سیکھ لیا ہے۔

بقیہ : تندور والے کی کہانی

ملازمت کا پر سکون سلسلہ جاری تھا کہ تبادلے کی ایک لہر مجھے اپنے آبائی ضلعے میں لے آئی۔روانگی کے وقت والدین نے تاکید کی تھی کہ گاہے گاہے اپنے عزیزوں سے ملتا رہوں۔

"بیٹا اپنے رشتہ داروں سے ملتے رہنا۔وہاں وہ تمھارا دست و بازو ہوں گے"۔

"ابّو مجھے بھی ان سے ملنے کا بہت شوق ہے۔کتنا عرصہ بیت گیا، میں نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا"۔

اپنے آبائی ضلع میں پہنچا تو ابتدائی ایام کی مصروفیت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا لیکن چند دنوں کے بعد میں مصروفیت کا محاصرہ توڑ کر آبائی گاؤں روانہ ہو گیا۔یہ علاقہ بہت تبدیل ہو گیا تھا۔عمارات کے سلسلے نے سرسبز کھیت نگل لیے تھے۔گاؤں کی تنگ گلیوں کی وجہ سے ایک جگہ سامنے سے آنے والی بیل گاڑی نے ہمارا راستہ روک لیا؛ یہ واقعہ عین اس جگہ پیش آیا جہاں طور کے باپ کا تندور ہوا کرتا تھا۔بے اختیار میری نظریں تندور کی طرف اُٹھ گئیں، میں حیرت زدہ رہ گیا، طور کا باپ اسی طرح تندور میں روٹیاں لگا رہا تھا۔اسی دوران میرا ڈرائیور راستہ بنانے کا جتن کر رہا تھا؛ میں نے اسے کہا:

"تم گاڑی نکال کر اُس طرف لگاؤ میں آتا ہوں"

میں گاڑی سے اتر کر تندور کی طرف چل دیا۔

"السلام علیکم چاچا!"۔

"وعلیکم السلام۔" وہ میرا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا۔

"چاچا! میں اسی گاؤں کا ہوں۔اگلی گلی میں میرا اپنا گھر ہے۔آپ کا بیٹا طور میرا کلاس فیلو تھا۔اب وہ کیا کرتا ہے؟"۔

"صاحب جی! میں طور ہی ہوں۔والد صاحب تو اللہ بخشے کب کے فوت ہو گئے"۔

صبح کا وقت کتنا سہانا ہوتا ہے۔خاص طور سے آتی سردیوں کی صبح ہو،ہلکی سی خنکی کے ساتھ جب اجالا پھیلتا ہے تواس اجالے میں رنگ بدلتے درخت اور سبزہ اور پھر چھوٹی بڑی چڑیوں کا گھر کے چھوٹے سے صحن میں پھدکنا،یہ سب کتنا اچھا لگتا ہے۔نیویارک کے گھر بھی کون سے بڑے ہوتے ہیں۔اگر گھر بھی خریدلوتو چھوٹا ہی رہے گا اور پیچھے بیک یارڈیالان بھی کہاں بڑا ہوتا ہے۔گھر سے گھر لگے ہوتے ہیں اور پھر ہر طرف بلڈنگوں کا جال چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والی بلڈنگیں جن میں ہزار ہالوگ بستے ہیں جیسے کوئی چھوٹا سا شہر آباد ہو۔

گھر والوں کے نخرے بہت،بلڈنگ کے مالکان اس سے بھی زیادہ مغرور،کرائے آسمان سے باتیں کرر ہے ہوتے ہیں۔میں نے بھی اپنا ایک چھوٹا سا گھر نیویارک میں ہی بنالیا تھا اور اس پر خوش تھی کہ چلو کسی پراپرٹی کے مالک تو ہیں۔اب یہ اور بات کہ بچے جو یہاں پیدا ہوئے بہت حیران ہوتے کہ آپ دوسرے ملک سے سفر کر کے آئے اور گھر بھی بنالیا،اب ان سے کون کہے کہ کیسے کیسے دل مارا ہے اپنا گھر کتنی بڑی نعمت ہے مگر دوسری جنریشن کو سمجھانا بڑا مشکل ہے۔یہ سب سوچتے ہوئے میں صبح ہی صبح کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر کا نظارہ کررہی تھی تو کچرا ٹٹولتی ہوئی ایک عورت نظر آئی۔

یہ ہیلن تھی جو ہمارے سامنے والے گھر میں رہتی تھی اور ایک گھر کی مالک ہونے کے باوجود نہ جانے اس کی کیا عادت تھی کہ گھروں گھر جا کر کچرے سے کوک کی بوتلیں اور کین ڈھونڈ کر اپنی ٹرالی میں جمع کرتی اور پھر ایک خاص جگہ جا کر جو کہ مال میں مال تھی ان سب کو بیچ کر پیسے بناتی۔میں حیران تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اکیلی رہتی تھی۔ایک بہن کے ساتھ نہ کوئی بچہ،نہ کوئی ساتھی۔عمر رسیدہ سی یہ عورت ہمیشہ اپنے کرایہ داروں سے جھگڑتی رہتی۔میری ایک دوست بھی ایک دفعہ اس کی کرایہ دار رہ چکی تھی۔اس نے اس کو بھی لڑ جھگڑ کر نکال دیا تھا۔اسی سے مجھے اس کا نام اور حالات پتا چلے تھے۔ہمیشہ ایک چھوٹا سا کوٹ اور سر پہ انگریزی اسٹائل کا ہیٹ ہوتا۔اس کے چہرے پہ کبھی مسکراہٹ نہیں ہوتی۔وہ مجھے دیکھ کر اجنبیوں کی طرح گزر جاتی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ایک اور عورت نظر آتی جو شاید سامنے والی بلڈنگ سے آتی تھی۔گوری،تھوڑا بھرا ہوا جسم،لمبا سا کوٹ پہنے اور سر پہ ٹوپی لگائے،وہ بھی ایک ٹرالی کے ساتھ ہوتی بہت مشکل سے موٹے پرانے جوتوں میں ٹرالی گھسیٹ رہی ہوتی اور اکثر گھروں میں گھس کر اسی طرح بوتلیں اور کین جمع کرتی،جب اس کی ٹرالی بھر جاتی تو وہ اسے گھسیٹتی ہوئی چلی جاتی اور نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی۔مجھے بڑی اُلجھن ہوتی ان عورتوں کی کھٹ پٹ سے آنکھ کھل جاتی۔میرے نزدیک صبح کا وقت سونے کا ہوتا یا پھر تیاری کر کے کام پر جانے کا۔چھٹی والے دن تو بہت قیمتی ہوتے مگر یہ لوگ نہ جانے کچروں میں کیا تلاش کرتی پھرتی ہیں۔یہ ہیلن تو مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہوتی۔میں اکثر فون پر اپنی دوست کو بتاتی۔اچھے خاصے گھر کی مالک ہے اور یہ سارے کام کرتی پھرتی ہے۔میری دوست کو اس قسم کے ماحول کا کوئی تجربہ نہ تھا۔وہ کون سی نیویارک کی باسی تھی۔میری باتوں پر حیران ہوتی۔

وہ دوسری عورت بھی کچھ عجیب ہی تھی۔اتنی عمر میں بے چاری صبح ہی صبح باہر نکلتی ہے اور یہ کام کرتی پھرتی ہے۔ایک دن میں چھٹی والے دن باہر نکل کر اس کی مزاج پرسی کر ہی لو۔

''ہیلو۔''میں نے کہا۔وہ مجھے دیکھ کر جلدی سے اپنا ہاتھ روک کر کھڑی ہوگئی۔

''اگر تم کو اور بوتلیں اور کین کے خالی ڈبے چاہیے تو میں گھر سے لادیتی ہوں؟''میں نے کہا۔

اس نے رضامندی میں سر ہلادیا۔میں نے گھر کے اندر جا کر بوتلیں وغیرہ اسے لاکر دیں۔اس نے شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے چلی گئی۔اس کے بعد میں نے اس کو کئی دفعہ دیکھا مگر وہ اپنی ہی دھن میں سیدھی نکل جاتی۔

سردی بڑھتی چلی گئی اور ان لوگوں نے بھی آنا کم کر دیا۔ہم بھی اب باہر نہیں جھانکتے تھے۔سردی میں گھر گرم کیے گھر میں رہتے۔

تھوڑا سا موسم بدلا تو وہ پھر آنے لگیں۔ان عورتوں کی صبح ہی صبح کھٹ پٹ سے سارے محلے کو ہی بہت برا لگتا۔ہم عورتوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ان کو بند کرایا جائے۔ہم نے ہیلن کو پکڑ کر کافی شرمندہ کیا کہ اچھا خاصا تمہارا گھر ہے اور تم ہو کہ ہم سب کو پریشان کرتی ہو۔ہیلن کو دیکھ کر وہ دوسری عورت بھی غائب ہوگئی۔حالانکہ اسے تو ہم نے کچھ کہا بھی نہیں تھا مگر شکر ادا کیا کہ صبح پُرسکون ہوگئی۔امریکہ میں رہ کر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں پریشان کرتی ہیں۔حالانکہ کراچی میں جب ہم رہتے تھے تو ہر طرح کے شوروغل کے عادی تھے۔کچرا اُٹھانے والے سے لے کر رکشے والے تک سب ہی شور مچاتے۔کون کچھ کہہ سکتا تھا۔

ہیلن جب بھی میرے گھر کے آگے سے گزرتی مجھے اور بھی غصے سے نظر انداز کر کے چلی جاتی۔مجھے بھی کون سی پرواہ تھی۔مغرور عورت اتنا بڑا گھر لیے بیٹھی ہے اور پھر بھی کچرے میں سے چیزیں ڈھونڈتی رہتی ہے اور ہم کو ہی کم سمجھتی ہے۔ہاں وہ دوسری عورت مجھے اچھی لگتی تھی مگر وہ غائب ہی ہوگئی تھی۔شاید وہ بھی اس بلڈنگ کی مالک ہوگی۔میں سامنے والی بلڈنگ کو دیکھ کر مذاق میں سوچتی یہاں پر لوگوں کا کیا بھروسہ عجب سنکی ہوتے ہیں۔

ایک صبح پھر کچھ تلاش کرنے کی آواز آئی۔میں نے سوچا تو پھر شروع ہوگئیں یہ عورتیں۔باہر جھانک کر دیکھا تو ہیلن کی جگہ وہ عورت کھڑی تھی۔پھر وہ

میری سیڑھی پر ہی بیٹھ گئی۔ میں گھر سے باہر نکل کر گئی۔ مجھے دیکھ کر بھی وہ اُٹھی نہیں۔ ایسی بیٹھی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بیمار ہے۔ میں نے اسے ہلایا تو وہ ایک طرف لڑھک گئی۔ گھبرا کر میں نے اسپتال ایمبولینس کال کر دی۔ اس دوران میں اس نے مجھے اپنا کوٹ پکڑایا اور کچھ اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں ایمبولینس آ گئی۔ وہ لوگ اسے اسپتال لے کر چلے گئے۔

میں نے اس کا کوٹ اُٹھا کر اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کوٹ کی جیب میں سوڈے کے چھوٹے ڈبے بھرے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے ان ڈبوں کو نکال کر کچرے کے ڈبے میں ڈالنا چاہا تو میرے ہاتھ وہیں رک گئے۔ ان ڈبوں میں ڈالرز بھرے تھے اور اس عورت کے ہاتھ کا لکھا خط تھا جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میں بہت عرصے سے بیمار ہوں۔ میں اگر کہیں گر جاؤں اور یہ پیسے جس کو بھی ملیں، ایک غریب الوطن مہاجر سمجھ کر یہ سب پیسے مجھے واپس دے دینا۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرا کوئی خاندان نہیں ہے۔ میں ان لٹنے والوں میں سے ہوں جو شام کے ملک سے یہاں آ کر پناہ لے رہے ہیں۔ مجھے ایک چھوٹی سی جگہ اور کچھ پیسے تو حکومت کی طرف سے مل رہے ہیں مگر وہ میری خواہش کے لیے کافی نہیں۔''

میں نے آنسو بھری آنکھوں سے اس خط کو آگے پڑھا۔ ''میں اگر مر جاؤں تو یہ پیسہ میری تدفین پر لگا دینا۔ میری خواہش ہے کہ یہ پیسہ کسی ایسے انسان کے ہاتھ لگے جو یہ جانتا ہو، اپنا گھر کیا ہوتا ہے۔ دنیا میں تو اپنا گھر، اپنا وطن چھوٹ گیا۔ اب کوئی ایسی جگہ ملے جہاں میرا آخری گھر اپنے وطن میں نہ ہو مگر اپنے ہم مذہب لوگوں میں ہو۔'' عائشہ ہاں یہی اس کا نام تھا۔

میں رو رہی تھی۔ شاید وہ میری سیڑھی پر اسی لیے آ کر بیٹھی تھی کہ وہ یہ خط مجھے دینا چاہتی تھی۔ ہیلن بھی آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے پیسے بھی نکال کر مجھے دیئے۔

اس نے کہا۔ ''یہ بھی اس بیچاری کے کام آ جائیں تو کیا برا ہے۔ یہ پیسے میں ایسے ہی رفاحی کاموں کے لیے رکھتی ہوں۔'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

میں حیران ہوئی، نادم ہوئی، ان عورتوں نے مجھے کہاں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ میں قدرت کے نظارے بھول کر خدا کی بنائی ہوئی اس مخلوق کو دیکھ رہی تھی جس کا نام انسان ہے جو دکھتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ میں نے ہیلن کے پیسے واپس کر دیئے۔

''نہیں ہیلن۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''وہ عورت عائشہ اپنا بندوبست خود کر کے گئی ہے۔ ہم چھوٹے بڑے گھروں سے مطمئن نہیں ہوتے۔ اس کا تو گھر ہی لٹ گیا تھا مگر اس نے تو کچھ اور ہی ٹھان لیا تھا۔'' سچ ہے اکیلی تنہا عورت بھی اگر کسی کام کا ارادہ کرے تو آخری لمحہ بھی اس کا اپنا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا اور اسپتال جانے کی تیاری میں لگ گئی۔ آخر اس شجرِ تنہا کی خواہش کو بھی تو پورا کرنا تھا۔

تم دھیرے دھیرے مرنے لگتے ہو

پابلو نرودا (1904-1973)

تم دھیرے دھیرے مرنے لگتے ہو
گر سفر نہیں کرتے
گر مطالعہ نہیں کرتے
گر زندگی کی آوازیں نہیں سنتے
گر خود کو نہیں سراہتے
تم دھیرے دھیرے مرنے لگتے ہو
جب خود توقیری کو قتل کرتے ہو
جب دوسروں کو اجازت نہیں دیتے
کہ وہ تمہاری مدد کر سکیں
تم دھیرے دھیرے مرنے لگتے ہو
جب اپنی عادتوں کے اسیر بن جاتے ہو
ہر روز لگے بندھے رستوں پر چلتے رہتے ہو
اگر، اپنے معمولات نہیں بدلتے
اگر مختلف رنگ نہیں پہنتے
اگر، اجنبیوں سے باتیں نہیں کرتے
تم دھیرے دھیرے مرنے لگتے، ہو
جب عشق سے اور اسکی ہنگامہ خیزیوں سے جان چھڑاتے ہو
اور ان سے جنہیں دیکھ کر تمہاری آنکھیں روشنی سے دمک اٹھتی ہیں
دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں
تم دھیرے دھیرے مر، جاؤ، گے
اگر خطرہ مول نہ لو گے
یہ جاننے کو
کہ نامعلوم کتنا محفوظ ہے
اگر خوابوں کی تلاش میں نہ نکلو گے
زندگی میں کم از، کم اک بار
منطق سے نہ بھاگو گے
خود کو قطرہ قطرہ مرنے نہ دینا
خوش رہنا نہ بھولنا

ملفوف کی پشت

ڈاکٹراشرف آثاری

(سری نگر،کشمیر)

''رشیدؔ ہم سے ہمارا سب کچھ چھن گیا ہے آج کے اس بے مروت دور نے جیسے ہمیں تہی دست بنا دیا ہے۔ہم قلمکار ہیں،کمپیوٹراور موبائیل فون نے ہم سے ہماراقلم بھی چھین لیاہےاور کاغذ بھی،جب ہمارے ہاتھوں سے ہماراقلم کاغذ ہی چھین لیا گیا ہےتو ہم کیسےاور کیونکر قلمکار ٹھہرے۔۔۔؟

اب ہماری انگلیاں لکھنے کی بجائے تھر کنے لگتی ہیں اوراب یہ انگلیاں ہی سب کچھ لکھتی اور مٹاتی ہیں اور بھیجتی بھی ہیں اور وصول بھی کرتی ہیں۔کمپیوٹراور موبائیل نے قلم اور لکھنے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ڈاک اور ڈاکیہ کی اہمیت و افادیت بھی نہ صرف گھٹادی ہے بلکہ اسے بہت حد تک ختم ہی کردیا ہے۔شکر ہے پھر بھی ،یہ سب چیزیں ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔زندگی ہر لحہ بدلتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہے بالکل آتے جاتے موسموں کی طرح ہی،شاہد اسی لئے اس کا نام زندگی ہےاور اگر ایسا نہیں ہوتا تو شاید ہر جانب جمود ہی جمود طاری ہوتا جسے موت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

میں سعودی عرب کے دھران شہر میں بیٹھا ہوا ہوں اور یہ خط تمہارے نام یہیں سے لکھ رہا ہوں۔موبائیل فون پر رابطہ نہیں کررہا ہوں بھلے ہی میری بات تم تک دس بیس دنوں میں ہی کیوں نہ پہنچ جائے؟مجھے کوئی جلدی بھی تو نہیں ہے۔اور نہ ہی یہ معاملہ اتنا سیریس یا فوری توجہ کا حامل ہے۔مقصد صرف اپنی اندر کی بات ،اپنے دیرینہ اور بچپن کے دوست تک پہنچانا ہے اور اس کی رائے جاننا اور مشورہ لینا ہے۔

رشیدؔ تم واقف ہی ہو،اہلیہ کے اچانک انتقال کے سانحے نے مجھے بہت نڈھال کردیا۔اس عمر میں شریک حیات کا بچھڑ جانا۔۔۔؟ خاص کر جب بچے بالغ ہوچکے ہوں اوران کے گھر بسانے کی تلاش بھی شروع ہوچکی ہو۔

دانشؔ سعودیہ میں سیٹل ہوچکا ہےاور اپنی بیگم کے ساتھ یہیں پر رہ رہا ہے اتفاقاً ارمؔ کی شادی بھی ایک انجینئر کے ساتھ ہوگئی ہے جو سعودیہ میں ہی ملازم ہے۔اسلئے شادی کے فوراً بعد ہی سعودیہ آچکی ہے۔ہم میاں بیوی ملازمتوں سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے آبائی گھر پر ہی تھے کہ ایک دن زبیدہؔ کی طبیعت خراب ہوگئی اوراس نے ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑنے کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔تم جانتے ہوابھی وہ تندرست وتوانا تھی اور فعال بھی کہ ہر نزدیک ودور کے رشتہ داروں کے پاس آتی جاتی تھی۔کسی کو یقین ہی نہیں ہورہا تھا کہ وہ اتنی جلدی۔۔۔؟

دوست احباب،رشتہ دار اور عزیز واقارب رفتہ رفتہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہولئے اوراب بیٹا بیٹی اور داماد بھی ڈیوٹی پر لوٹ گئے ہیں۔زبیدہؔ اگر کسی کے لئے مرگئی ہے تو بس میرے لئے،دیکھتے ہی دیکھتے میرا گھر اجڑ گیا اور میں اس ناقابلِ برداشت صورتِ حال یا صدمے سے ابھی تک باہر نہیں نکل پایا ہوں اوراپنے آبائی گھر پر قفل چڑھا کر،دانشؔ اورارمؔ کے زبردست اصرار پر سعودیہ آیا ہوں اوراب مجھے یہاں آئے ہوئے کافی دن ہوگئے ہیں کہ آج بیٹھے بیٹھے تمہاری یاد آگئی سو یہ خط تمہیں لکھنے بیٹھ گیا۔

زبیدہ نے لگ بھگ چھتیس سال میرے ساتھ گذارے شاید تمہیں یاد بھی ہوگا جب میں اسے اپنے گھر لانے کے لئے گیا تھا تو تم بھی براتیوں میں شامل تھے اور پھر یہ چھتیس سال کیسے گذر گئے پتہ ہی نہیں چلا؟کن کن مراحل سے گذرنا پڑا،تم خوب جانتے ہولیکن اس کا تدبر،بردباری اور ہمت وحوصلہ مجھے کبھی پست ہمت یا کمزور نہیں ہونے دیتا تھا اور میرے اندر ایک نئی طاقت وتوانائی بھر دیتا تھا۔اور آج۔۔۔اس کے بغیر میں۔۔۔اپنے آپ کو۔۔۔انتہائی اکیلا اور کمزور محسوس کررہا ہوں۔

کیا پتہ زندگی کے کتنے دن،مہینے یا برس باقی ہیں انہیں جوں توں گذارنا ہی ہے ذرا اطمنان کے ساتھ گذارنا چاہتا ہوں،جس کے لئے میرے پاس کئی آپشنز ہیں لیکن ہر آپشن کے دو دو پہلو ہیں جیسے سکے کے دو رخ یا پھر اڈونٹیج اور ڈس اڈونٹیج۔تم اسے میری قوت ارادی کی کمزوری بھی کہہ سکتے ہو کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرپارہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کون سا فیصلہ لینا چاہئے؟

کہتے ہیں کہ جب کوئی مشورہ دینے والا دستیاب نہ ہو تو دیواروں کے ساتھ مشورہ کرنا چاہئے جس شخص کا رشیدؔ جیسا دوست موجود ہو اس کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اسی لئے خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں کہ تم صحیح مشورہ دے سکو گے کہ مجھے اس صورت حال کے ہوتے ہوئے کیا کرنا چاہئے؟

دانشؔ ڈاکٹر ہے اوراس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے اور دونوں یہیں سعودیہ میں ہیں بتا چکا ہوں کہ میں انہیں کے پاس ہوں۔بہت اصرار کررہے ہیں کہ میں بھی ان ہی کے ہاں،انہی کے پاس رہوں لیکن اپنے وطن سے بہت دور میں اس اجنبی ماحول میں رہ کر کیا کروں گا؟یہ لوگ بہت مصروف زندگی گزارتے ہیں اور پھر یہاں کا اسٹنڈارڈ آف لیونگ بھی بہت اونچا ہے اور مہنگائی بھی کہ ہمارے ہاں جتنی رقم پورے کنبے پر خرچ ہوتی ہے،یہاں اس سے زیادہ صرف پانی پر خرچ کرنی پڑتی ہے۔

تم میری طبیعت سے ابتدا سے ہی واقف ہو،میں کسی کے اوپر بوجھ بننا نہیں چاہتا ہوں اور نہ کسی کا احسان مند ہی،خواہ وہ میرا اپنا خون ہی کیوں نہ ہو۔یاد ہے تم مجھے اکثر طعنہ دیا کرتے تھے کہ میں تب تک اپنی پریشانیوں کو ظاہر نہیں کرتا جب تک نہ معاملہ میری پہنچ یا برداشت سے باہر ہوجائے؟

بس وہی سمجھو آج بھی کچھ ایسا ہی ہے مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں گھر میں رہوں تو اکیلے اکیلے گزر بسر کے لئے مجبور ہوں اتنا بڑا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔نہ کوئی آگے ہے اور نہ پیچھے۔حدِ نظر تک تنہائی ہی تنہائی ہے اور پھر اٹھنا،بیٹھنا،کھانا،پینا،چلنا

پھرنا تو ہے ہی، بیماری اور بڑھاپے کے دیگر مسائل بھی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور کونسا فیصلہ لوں؟ ان دو آپشنوں میں کونسا آپشن اڈاپٹ کرلوں اور کسے چھوڑ دوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟ شاید تم میری صحیح رہنمائی کر سکتے ہو۔

زندگی بھر اپنا بوجھا اپنے کندھوں پر ڈھونے کا عادی رہا ہوں۔تم بھی ٹوکا کرتے تھے کہ میں کس مٹی کا بنا ہوا ہوں کہ انتہائی شدید اور نا قابل برداشت حزن وغم وملال میں بھی آہ بھرنے، کراہنے یا چیخنے چلانے کا عادی نہیں ہوں سب کچھ اکیلے اکیلے سہتا اور برداشت کر لیتا ہوں۔اپنے آبائی شہر میں اگر کوئی قریبی یا پھر دور کا ہی رشتہ دار ہوتا تو شاید ذرا سی تسلی کا باعث بھی بن جاتا لیکن تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور پھر میرے والد بھی کہیں سے ہجرت کر کے اس جگہ پر آباد ہو گئے تھے۔یہ سب باتیں یہاں دھرانے کی ضرورت نہیں، تمہارے ساتھ بالکل بھی نہیں کہ تم میرے بچپن کے دوست ہو لیکن ایک عرصہ بعد تم سے مخاطب ہوں اسلئے تم سے بہت باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے اور پھر مجھے اس بات کا ہمیشہ سے ہی اعتراف رہا ہے کہ ہر معاملے میں صحیح فیصلہ لینے کی صلاحیت میں، تم مجھ سے آگے ہو کہ تم بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی قابلیت رکھتے ہو، میری طرح جلد باز نہیں ہو اور ہر معاملے کو بہت سنجیدگی کے ساتھ لینے کے عادی بھی ہو سرسری طور پر لینے کے عادی ہرگز نہیں ہو خواہ وہ معاملہ کوئی معمولی معاملہ ہی کیوں نہ ہو، شاید اسی لئے میں اپنے مسائل اور معاملات لے کر تمہارے پاس آیا کرتا تھا بالکل ایک بھائی کی طرح ہی ورنہ تم جانتے ہی ہو میں کسی کے پاس بہت کم جاتا ہوں اور وہ عادت آج بھی بدستور قائم ہے۔

تم میری پوزیشن اچھی طرح سے جان گئے ہونگے میں جیسے تیز دھار والے نوکیلے کانٹوں پر بیٹھا ہوا ہوں۔تمہارے جواب کا بے صبری کے ساتھ انتظار رہیگا۔امید ہے کہ تمہارا جوابی خط پا کر میں کوئی مناسب فیصلہ لے سکوں گا اور اپنی اس ذہنی کوفت سے ہمیشہ کی لئے چھٹکارا بھی پا سکوں گا۔والسلام

تمہارا اپنا بھائی

احمد علی‘‘

لگ بھگ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد رشیدؔ کا جوابی خط مجھے موصول ہوا، الگ الگ سے سب کی خبر اور خیریت پوچھی تھی اپنے دیرینہ تعلقات کا تذکرہ کر کے بہت سی پرانی یادوں کو تازہ کیا تھا اس دوران رشیدؔ کے ساتھ کوئی رابطہ نہ رہنے کی وجہ سے اس کی زندگی سے متعلق کئی معاملات کا پتہ ہی نہیں چل پایا تھا اس کی بیوی کا بھی انتقال ہو چکا ہے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں کئی قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کا انتقال بھی ہو چکا ہے اور وہ بھی میری ہی طرح اکیلے ہو چکے ہیں۔تعجب ہے کہ سعودیہ میں رہ کر اپنے وطن سے جیسے کٹ کر رہ گیا ہوں کہ کئی اہم واقعات کا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔چلتا بھی کیسے؟ سب کے ساتھ جیسے کٹ کر رہ گیا ہوں۔

میں نے رشیدؔ کا خط کئی بار بہت انہماک سے پڑھا اور کئی بار کیا بلکہ بار بار پڑھا کہ میں اپنے سب سے اہم سوال کا جواب اس میں تلاش کر رہا تھا۔میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ میں نے اس خط میں اپنے پوچھے گئے سب سے اہم سوال کا جواب کہیں بھی نہیں پایا اور نہ اشارتاً ہی اس کا کہیں پر تذکرہ ہی تھا۔

ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ رشیدؔ نے میرا سوال دیکھا ہی نہ ہو یا اسے پڑھا ہی نہ ہو یا پھر جواب لکھتے وقت اس کے ذہن سے بالکل اتر گیا ہو اور جو مشورہ میں نے اس سے طلب کیا تھا، وہ اس پر بالکل خاموش رہا ہو، ضرور کوئی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی؟

مایوسی کی حالت میں، بار بار خط کھولنے اور بند کرنے کے بعد، جب میں اسے ٹیبل پر پھینکنے ہی والا تھا تو اچانک میری نظریں ملفوف کی پشت پر ٹک گئیں حسب معمول اس پر بھیجنے والے کا مکمل ایڈرس بھی لکھا ہوا تھا۔ایڈرس پڑھ کر مجھ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔اس خط پر ہمارے شہر کے ایک معروف Old Age Home کا ایڈرس درج تھا۔

چار مسئلے

اسلام خطرے میں ہے۔ پاکستان خطرے میں ہے۔ کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ہم نے کشمیر فتح کرنا ہے۔ان چار مسئلوں سے مزید چار مسئلے جنم لیتے ہیں۔ مذہبی انتہا پسندی، حب الوطنی، عسکریت اور دہشت گردی، ان سے چار نتائج سامنے آتے ہیں۔خوف، مرکزیت، آمریت اور اسلحہ بندی، یہ چار نتائج چار نقصانات کرتے ہیں۔جمہوری، سماجی، معاشی اور فکری، ان چار نقصانات کو چار طریقوں سے چھپایا جاتا ہے۔ سیاسی کرپشن، سیاسی نا اہلی، سیاسی توڑ پھوڑ اور سیاسی جہالت، اس کا ازالہ ان چار خوش فہمیوں سے کیا جاتا ہے۔عسکری کامیابی، عسکری گلوری فیکیشن، عسکری رومانیت، عسکری تحفظ، یہ سارا عمل چار شکلوں میں سامنے آتا ہے۔ غربت، بیروزگاری، بیماری اور عدم تعلیم۔اور یہ صورتحال وہ مائنڈ سیٹ ترتیب دیتی ہے۔ جس میں پھر چار قسم کے الزامات سامنے آتے ہیں۔ کافر، غدار، چور اور سیکیورٹی رسک۔اور یہ مائنڈ سیٹ وہ تہتر سالہ شیطانی چکر ہے۔ جو مخصوص قوتوں کو موافق ہے۔

طارق احمد

چھن

نصرت شمسی

(رام پور)

اس نے اس کے کان کا جھمکا ہلایا اور اسے قریب کرنے کی کوشش کی۔

''کتنی حسین لگتی ہے تو جب یہ جھمکے پہنتی ہے۔تیری یہ چمکتی ہوئی زلفیں اور گالوں کو چھوتی لٹیں اور ہلتے ہوئے جھمکے۔قریب آنا۔''

رانو کا دل بہت زور سے دھڑ کا اور وہ شبو سے دور ہوگئی۔

''ہٹ پیچھے۔''رانو نے بکھرے ہوئے بال سمیٹے جنھیں تین دن سے کنگھا نصیب نہیں ہوا تھا اور شبو کی طرف مڑگئی۔

''ہوں......ایسے ہی دکھا،پہلے کچھ باتیں تو کرلے۔وہ باتیں جو فلموں میں ہیرو ہیروئن سے کرتا ہے۔''

شبو نے جیب سے پائل نکال کر اس کے چہرے کے آگے بجائی۔

''پائل''وہ کود کر اس کے قریب آگئی۔

دکان پر ایک بیچنے والا آیا تو میں نے تیرے لیے خرید لی۔''شبو نے سرگوشی کی۔

''لا پیر لا۔''رانو نے پیر آگے بڑھادیا۔

''چل اب آنکھیں بند کر۔''شبو نے پائل کھولتے ہوئے کہا۔

رانو نے پائنچا تھوڑا سا اٹھایا اور پیر آگے کر دیا۔شبو نے اسے پائل پہنادی۔شبو کا ہاتھ لگتے ہی لگا اسے بجلی نے پکڑ لیا ہو۔

''تیرے پیر کتنے نرم ہیں۔''شبو نے اس کے پیروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''چل ہٹ بے شرم۔''

اور وہ دوڑ کر پیڑ پر پڑے جھولے پر بیٹھ کر جھولا جھولنے لگی۔

''اور یہ دوسری پائل؟''شبو نے پائل ہلائی۔

''یہ تم پہن لو،شادی کے بعد میں پہن لوں گی۔''رانو نے قہقہہ لگا کر کہا۔

شبو نے پائل کو اپنی کلائی پر لپیٹا اور مسکراتا ہوا جھولے کی طرف بڑھ گیا۔

''آج موسم کتنا پیارا ہے۔''اس نے رانو کے کان میں پھر سرگوشی کی۔

''تو......؟''رانو نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔اس کا دل اس جملے نے مزید دھڑ کا دیا تھا۔

رانو نے شرارت بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا،پائل پر ہاتھ پھیرا اور اسے ایک زوردار جھوٹا دیا۔

رانو تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی نا''

''ہاں!اگر تم ساتھ دو گے تو ضرور۔''

دیکھ میں تجھے زیادہ عیش تو نہ دے سکوں گا۔ہاں دو وقت کی روٹی،عزت اور تن ڈھکنے کو کپڑے ضرور دے سکتا ہوں۔دیکھ تو بھی شادی کے بعد بدل نہ جانا۔مجھ سے زیادہ اونچی فرمائشیں نہ کیجو،تجھے تو پتہ ہے میرے اوپر دو بہنوں کی ذمہ داری بھی ہے اور اماں کی بھی۔''

رانو نے جھولا روکا اور شبو نے اس کی رسی پکڑ لی۔

''دیکھو تمہاری بہنوں نے اگر مجھ سے زیادہ چوں چراں کی تو اچھا نہ ہوگا۔یہ سمجھ لو۔''

''ارے نہیں ......باجی کا تو رشتہ پکا ہو چکا ہے اور چھوٹی کے بھی رشتے برابر آرہے ہیں لیکن چچا کا بہت دل ہے اسے اپنی بہو بنانے کا،ایک سال میں دونوں کی شادی ہو جائے گی ہاں تو اماں سے بنا کر رکھیو بس!''

''ہی......ہی ہی''رانو نے ہنس کر شبو کو دیکھا اور زور سے جھوٹا لیا۔

''اماں تو خود بڑھیا ہو چکی ہیں تمہاری،وہ میرا کیا کریں گی۔''

''رانو!''شبو نے ناراضگی والی آواز نکالی۔

''ارے مذاق کر رہی ہوں۔وہ میری بھی اماں جیسی ہیں۔اچھا یہ بتاؤ سال میں کتنے جوڑے بنا کر دو گے مجھے؟''

''صرف دو۔ایک چھوٹی عید پر اور ایک بڑی عید پر،بس۔''

''نہ بالکل بھی نہ،میں تو چار جوڑے بنواؤں گی۔عید کے علاوہ،ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔''

''اچھا اچھا بنا دیا کروں گا۔بس تو مجھے گھر کا سکھ دیجو۔اچھے اچھے کھانے پکانا سیکھ لے۔مجھے اچھے کھانوں کا بہت شوق ہے۔''

''کیا کیا پکتا ہے تمہارے گھر؟''رانو نے منھ پر آنے والی لٹوں کو پھر سے سمیٹتا۔

روز ایک ہانڈی گوشت کی پکتی ہے۔وہی دونوں وقت ہو جاتی ہے۔دوپہر کو بہت مزے دار اور شام کو پھیکی پھیکی سی ہو جاتی ہے۔''

''اچھا ایسا کیوں؟''

''اس لیے کہ شام کو اماں اس میں پانی ملا کر پورا کرتی ہیں۔''

''اچھا۔''پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس دئے۔

شبو نے کلائی پر لپٹی پائل بجائی۔

''چل آئس کریم کھاتے ہیں۔''شبو نے سامنے کھڑے آئس کریم والے کو دیکھ کر کہا۔

''نہ بابا نہ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔یہیں لے آؤ۔کتنا سکون ہے

یہاں۔میں تو ابھی جھولا جھولوں گی۔''

اس کا دوپٹہ شبو کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ہوا کے جھوکے سے کبھی وہ اس کے کندھوں کو چھوتا تو کبھی چہرے کو چھوتا اور شبو کا دل دھڑکا تا ہوا لہرا جاتا۔ایک جھوٹے میں تو دوپٹہ اس کے منھ پر ہی رہ گیا اور جھولا آگے بڑھ گیا۔شبو نے دوپٹہ اپنے گلے میں ڈال لیا اور اسے جھوٹا دیا اور رانو آسمان میں اڑ گئی۔شبو نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور آئس کریم لینے چلا گیا۔

وہ آئس کریم لایا تو رانو مستی سے جھولا جھول رہی تھی اور کچھ گا بھی رہی تھی۔شبو نے جھولا روکا اور آئس کریم دیتے ہوئے کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے تجھ سے کچھ اور باتیں کروں۔''

شبو نے آئس کریم چاٹتے ہوئے کہا۔

''کون سی باتیں؟''رانو نے زبان نکال کر ملائی چاٹی اور پوچھا۔

''دیکھ برا نہ ماننیو،میری اور تیری باتیں......ہماری شادی کی ......پیار کی باتیں اور......''

''چپ......بے شرم،جب وقت آئے گا تب کریں گے۔جلدی سے اپنی بہنوں کو رخصت کرواور مجھے لے جاؤ۔''رانو نے سرخ ہوتے گالوں کے ساتھ کہا۔

''......اور یہ پائل۔''

''اپنے پاس رکھو۔اسے بھی تب ہی پہنوں گی۔ابھی تو آئس کریم کھانے دو۔دیکھو وہ آسمان پر اڑتے بادل اور......''

عجیب وغریب شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے؟اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔اس کے چاروں بہن بھائی سرکاری اسکول کے کپڑے پہنے اسے زور زور سے ہلا رہے تھے۔اس نے چادر سے پیر نکال کر دیکھا لیکن وہ سونا تھا۔رفتہ رفتہ اس کے حواس واپس آرہے تھے۔اس نے نظریں گھما کر آنگن میں دیکھا۔اس کی ایک سال کی منی سی بہن پانی میں چھپ چھپ کر رہی تھی اور اس کے ابا دروازے کے پاس پرانی سائیکل پر کچھ نئے اور کچھ پرانے ٹائر اور ایک بوسیدہ تھیلا لٹکائے جانے کو تیار تھے۔پچھلے سال اس کی اماں منی کی پیدائش کے وقت پانچ بچوں کی ذمہ داری اس پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئیں تھیں۔وہ بستر سے اٹھی۔اس کے کانوں میں ''چھن چھن'' کی آوازیں آرہی تھیں۔پتہ نہیں یہ آوازیں پائل کی تھیں یا کچھ ٹوٹنے کی۔

افسانچہ

چلو دلدار چلو!

جبیں نازاں (دہلی)

ٹیلی ویژن سیٹ آن تھا،بریکنگ نیوز آرہی تھی۔تمام ممالک کے سربراہان،ان کا عملہ بشمول اس خطے کے تمام امیرالبحر ہجرت پہ آمادہ۔۔۔۔۔

ناظر نے سوچا_ کہاں جارہے ہیں یہ لوگ۔۔۔؟

فلیش نیوز آئی

چاند پہ بسنے جارہے ہیں

کیوں۔۔۔؟ناظر کے دماغ میں سوال ابھرا

دوسری فلیش نیوز۔۔۔کیونکہ نظام شمسی کا یہ سیارہ۔۔۔ناکارہ ہوچکا ہے۔۔۔مطلب۔۔۔؟کہ اب رہنے کے قابل نہیں۔۔۔کہیں جائے اماں نہیں۔۔۔امن وامان غارت ہوچکا ہے۔۔۔بدامنی کس نے پھیلائی۔۔۔؟ناظر نے اینکر سے یوں پوچھا کہ جیسے وہ اس کے روبرو ہو۔۔۔روبرو تو تھا لیکن مصنوعی برقی ترسیل کے توسط۔۔۔ناظر کے دماغ میں ایک لفظ بجلی کی سرعت کوندا

"دہشت گرد"۔۔۔۔۔

اتنے سارے نت نئیا سلحے کس دن کے لئے بنا گئے؟اور نہ جانے کون کون سے بم۔۔۔یہ سب کس دن کام آئیں گے؟؟ہلاک کرو"دہشت گرد" کو۔۔۔ٹی،وی اسکرین پہ دہشت گرد نمودار ہوا۔۔۔سائز 4 قطر سے بھی چھوٹا۔۔۔جس کی شکل دھتورے کے پھل کی طرح گول اور خاردار۔۔۔رنگ بدلتا ہوا کبھی سرخ کبھی بلیو۔۔۔دیکھتے دیکھتے پورے ٹی،وی اسکرین پہ پھیل گیا۔۔۔ٹی،وی اسکرین سے باہر نکل پڑا تو۔۔۔؟مجھے بھی نگل لے گا۔۔۔ناظر کی گھگھی بندھ گ ۓ۔۔خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔اس نے خود کو آئیسولیشن وارڈ میں پایا۔اردگرد نظریں گھمائیں۔۔گھبراہٹ اور بےچینی حد سے سوا۔۔۔دھڑکن تیز ہوئی۔۔۔یہ پسینہ میں تربتر۔۔۔لڑکھڑاتی زباں "کہا" دل نے دھڑکنا بند کردیا۔۔۔

یہ مریض بھی چاند کے پار چلا گیا!

'' تاریخ گم گشتہ ''

واصف حسین واصف

(نیویارک)

ہمارا مان تھا وہ، بے وفا ہونے سے پہلے
خدا جیسا نہیں تھا وہ، خدا ہونے سے پہلے

نظر کا زخم، دل کا کرب، سانسوں کی اذیت
مراحل کس قدر تھے انتہا ہونے سے پہلے

کہاں کی میکشی، ادراک اپنی ذات کا تھا
وہ نشّہ تو روا تھا، نا روا ہونے سے پہلے

ہتھیلی پر مری وہ کتنے آنسو دھر گیا ہے
اسے بھی رنج تھا کیسا جدا ہونے سے پہلے

نشّہ کوزہ گری کا، اور انساں کی پرستش
میں خود سے آشنا تو تھا خدا ہونے سے پہلے

مراق مرزا

(ممبئی)

ایک سورج جو نہاں وسعت افلاک میں ہے
روشنی اس کی ہر اک سمت بتِ خاک میں ہے

خواب کے شہر میں بکھرے ہیں اجالوں کے ہجوم
آج کی رات سجی تاروں کی پوشاک میں ہے

دیکھئے مجھ کو مرے فکر کے آئینے میں
میری تصویر مرے خامۂ بے باک میں ہے

گل کسی وقت بھی ہو سکتا ہے سانسوں کا چراغ
موت اے زندگی ہر لحہ تیری تاک میں ہے

فکر میں اپنی وہ رکھتا ہے مقام لاہوت
ہے وہ مجذوب جو بیٹھا خس و خاشاک میں ہے

اس میں پوشیدہ ہر اک شے کے فسانے ہیں مراقؔ
اک ستارہ جو ازل سے مرے ادراک میں ہے

عبدالسلام عارف

(ٹورنٹو)

افق کی سُرخیوں سے یا کہیں ڈوبے ستاروں سے
کبھی تم ہی نکل آؤ زمانے کے حصاروں سے

محبت ڈھونڈتی پھرتی ہے اپنی کھو چکی منزل
ہمارا پوچھتی ہو گی وفا کے رہ گزاروں سے

کوئی اک دو برس کا تذکرہ ہوتا تو کہہ دیتے
مرتب ہے یہاں تاریخ گم گشتہ بہاروں سے

کبھی بے بس تڑپتا ہے، کبھی منہ زور رہتا ہے
ہے جیون برسرِ پیکار، اپنے شہ سواروں سے

کرشمے حسن کے دیکھو وہ جلوہ گر ہوئے ایسے
نہا کر اک پری نکلی ہو جیسے آبشاروں سے

وفا ہو، درد ہو، چاہے محبت ہو کہ وحشت ہو
مجھے ان سے نہیں مطلب، مری توبہ ہے چاروں سے

تگ و دو میں بہت عارف، بڑے ہلکان بیٹھے ہیں
بہت محدود ہے دنیا تو لا حاصل کناروں سے

○

نزہت شاہ

(نیویارک)

اک موبائل نامی جن کیا دنیا میں آ گیا
وہ دیکھتے ہی دیکھتے نسلوں کو کھا گیا

نسلیں ہوئیں تباہ تو یہ عقدہ بھی کُھل گیا
اک نیٹ کا ہے جال آنکھوں پہ چھا گیا

بُلندی پہ ہو گر کوئی تو کرتے نہیں حسد
جو چلتا گیا مسلسل وہ منزل کو پا گیا

قابو نہ رکھ سکے ہم اک دردِ دل پہ بھی
بے بس ہوئی نگاہ تو اشکوں میں چھا گیا

دنیا کی وحشتوں سے گھبرا گیا تھا کوئی
دستک دئے بغیر مرے گھر میں آ گیا

آساں نہیں تھا اسکو سمجھنا کبھی مجھے
اُلجھا ہوا ہے پھر بھی میرے دل کو بھا گیا

○

نسیم عزیزی

(ہوڑہ)

گلشن شاداب شکستہ ہوا
زرد ہوا پوچھتی ہے کیا ہوا

اس کو گناہوں کی سزا مل گئی
ہم ہوئے مجرم، وہ فرشتہ ہوا

سبز نقابوں کے سلگتے ہیں تار
آئینۂ دہر کہ شعلہ ہوا

چشم حقارت سے کبھی دیکھا تھا
آج اسی شوخ پہ شیدا ہوا

کس نے سمندر کی طرف کی نظر
لشکر طوفان ہے سہما ہوا

آتش سیال ہے چشم غزال
ابر سیہ ساغر و مینا ہوا

عشق میں ایک ایک قدم امتحاں
شعلہ فشاں نقش کف پا ہوا

آنکھ دکھاتے رہے طوفان کو
ایک تماشا لب دریا ہوا

○

اُفق فریدی

(میرٹھ)

متاعِ ہوش لٹی ہے کہاں نہیں معلوم
ہماری نسل کو سود و زیاں نہیں معلوم

چراغِ حق کی حفاظت میں جان بھی حاضر
ہمارے بعد ہو کیا کچھ یہاں نہیں معلوم

رقم میں کرتا رہا کیفِ دل کو اور ادھر
یہ جوئے اشک ہوئی کب رواں نہیں معلوم

ہمارا خون بھی شامل تھا تیرے قصے میں
مٹائے وقت نے کیا کیا نشاں نہیں معلوم

ہمارے شہرِ سیاست میں آگ برپا ہے
یہ کس کے گھر سے اٹھا ہے دھواں نہیں معلوم

سنا ہے صاحبِ عالم ہیں آج رنجیدہ
یہ رنگ لائی ہے کس کی فغاں نہیں معلوم

سخنوری کے ہیں زیور رموز و تشبیہات
یہ کون ہیں جنھیں حسنِ زباں نہیں معلوم

مرا نصیب رہا انکی بے نیازی ہی
وہ آج مجھ پہ ہیں کیوں مہرباں نہیں معلوم

پڑی نظر جو مقدر کے فیصلے پہ افق
بیاضِ عشق جلائی کہاں نہیں معلوم

○

وشال کھلر

(لدھیانہ)

اُجڑی ہوئی ہواؤں کا اب کے بھرم کہاں
بُجھتے ہوئے چراغ کا ایسے میں غم کہاں

آنکھیں اداسیاں گئیں، جنگل ہوئی دُکاں
میری وفائیں کون سی، ان کا کرم کہاں

تیروں کے حوصلے ہی جہاں ڈگمگا گئے
کھنچی گئی کمان پہ چڑھنے کا دم کہاں

رِستے یہاں وہاں سے یہ زخموں کے قافلے
بھیگے خیال وخواب ہیں، آنکھیں ہیں نم کہاں

اُن کا خدا ثواب ہے میرا خدا الگ
میرا دیار اور ہے، اُن کا حرم کہاں

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

جب سے ہوا ہے قتل وہ رستہ نہیں جاتا
اب تیری گلی میں کوئی لڑکا نہیں جاتا

ملتے ہیں مقدر سے وفادار جہاں میں
کپڑوں کی طرح دوست تو بدلا نہیں جاتا

سجدہ میں کروں گا تو فقط ایک خدا کو
سر تو ہر اک در پہ جھکایا نہیں جاتا

دنیا کی نہیں کوئی حقیقت یہاں لیکن
پانے کا اسے پھر بھی ارادہ نہیں جاتا

اترا ہو ہمیشہ ہی کسوٹی پہ کھرا جو
اس کو تو کسی حال میں پرکھا نہیں جاتا

کتنا ہی اُڑیں آپ زمیں پر ہی گریں گے
اونچائی کی جانب کبھی دریا نہیں جاتا

نفرت کے دریچوں سے نکلنا بہت مشکل
اِک بار جو پھنس جائے تو نکلا نہیں جاتا

○

حبیب الرحمٰن چوہان

(سکھر)

پابجولاں تہِ شمشیر و سناں بولتا ہے
عشق جب بولتا ہے حق کی زباں بولتا ہے

یوں تو خاموش نظر آتی ہے محفل لیکن
تیرا احساس سرِ بزمِ گماں بولتا ہے

مجھ کو اس درد کی شدت نے سنوارا ہے یوں
اب مرے ساتھ زماں اور مکاں بولتا ہے

چاک داماں؛ تہی حال مگر حوصلہ مند
ایسے لوگوں سے تو منزل کا نشاں بولتا ہے

جز ترے کون ہے ویرانیِ گلشن کا سبب
لاکھ چھپ جائے مگر سارا جہاں بولتا ہے

وقت نے جانے کیا بدلا ہے کہ معلوم نہیں
کون زندہ ہے یہاں کون یہاں بولتا ہے

لوٹ آتا ہوں کبھی وجدِ سخن میں ورنہ
تیری خاطر ترا مجبور کہاں بولتا ہے

اس پہ الزام دھرے جاتے ہو تو رکھنا یاد
اس کی جانب سے تو ہر حاملِ جاں بولتا ہے

چاند تارے یہ گل و رنگ یہ طائر اڑتے
صوتِ یزدان میں یہ سارا سماں بولتا ہے

تم نہ بولو گے مگر واقعۂ درد حبیب
دل سے اٹھتا ہوا ہر وقت دھواں بولتا ہے

پریم ناتھ بسمل

(ویشالی)

کبھی تو پوری مرے دل کی آرزو ہوگی | کبھی وہ شام بھی آئے گی پاس تو ہوگی
کھلے گی گلشنِ امید کی کلی تو کبھی | فضا میں خوشبو تمہاری ہی چارسو ہوگی
وہ دن بھی آئیگا ایک دن کہ اے صنم تم سے | مری بھی پیار سے دن رات گفتگو ہوگی
عجب نہیں کہ خوشی میں مچل بھی سکتا ہوں | کھلیگی آنکھ مری اور تو روبرو ہوگی
کبھی افق پہ شفق اور ہوگی تو چھت پر | میں دیکھتا ہی رہوں گا تو سرخرو ہوگی
جہاں میں جاؤں میں بسمل کہیں مگر جانم | مری نظر کو تمہاری ہی جستجو ہوگی

○

جہانگیر اشرف

(برمنگھم)

میری ذات سے تجھ کو منہا کرتے ہیں | ناداں ہیں گُل سے خوشبو کو جدا کرتے ہیں
دیارِ عشق میں خامشی بھی اک طرزِ تکلم ہے | دلفگار تو آنسوؤں سے بیاں مدعا کرتے ہیں
جاگ اُٹھتی ہیں خوابیدہ حسرتیں پھر سے | میری جانب وہ جب نگاہ کرتے ہیں
اس طرح تو بھی آ کے مل مجھ سے | جس طرح دریا سمندر سے ملا کرتے ہیں
مری بربادیوں کا سبب مرا دل ہی تو ہے | تجھ سے جانِ وفا ہم کب گلہ کرتے ہیں

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیارپور)

میرے اندر ہی چھپ کے بیٹھا ہے | مجھ سے جو دشمنی نبھاتا ہے
وہ بہت خوش مزاج ہے لیکن | گھر میں اکثر اداس رہتا ہے
شہر کے ایک سوکھے کنوئیں میں | کوئی رہ رہ کے چیخ اٹھتا ہے
تم جسے زخم دل دکھاتے ہو | چارہ گر وہ جنم سے اندھا ہے
سب کے دکھ درد بانٹنے کا خیال | عمر بھر خود کو ہی رلاتا ہے
وہ نہیں آئے اتنی رات ہوئی | سو طرف میرا دھیان جاتا ہے

○

تصور اقبال

(اٹک)

ماضی میں آج حال سے پھر آ گیا ہوں میں
بچ کر کسی کی چال سے پھر آ گیا ہوں میں
اُس میں جگہ نہیں تھی کوئی میرے واسطے
چُپ چاپ اُٹھ کے ہال سے پھر آ گیا ہوں میں
وہ ڈھونڈتا رہا تھا مجھے پھر جنوب میں
چھُپ کر وَرے شمال سے پھر آ گیا ہوں میں
ششدر ہے آج تک وہ شکاری کچھ اس طرح
کیسے نکل کے جال سے پھر آ گیا ہوں میں
ملنے گیا تھا دُور کہیں میں "سکون" سے
دلشادیوں کیہال سے پھر آ گیا ہوں میں
اُس نے چھپا دیا تھا مجھے مال جان کر
یہ دیکھئے منال سے پھر آ گیا ہوں میں
ممکن ہے کوئی قرض چکانا ہو آپ نے
"محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں"
بیٹھا ہوا تھا جس پہ وہی اُس نے کاٹ دی
اقبالؔ اُڑ کے ڈال سے پھر آ گیا ہوں میں

○

احمد سوز

(ممبئی)

جتنا بیدار ہو رہا ہوں میں
اتنا دشوار ہو رہا ہوں میں
خود پسندی نے کر دیا تنہا
اپنی دیوار ہو رہا ہوں میں
مجھ میں کچھ بھی نہیں رہا میرا
ایک اخبار ہو رہا ہوں میں
سارا ماحول ہے پراگندہ
اور بیمار ہو رہا ہوں میں
کوئی وقعت نہیں رہی میری
روز بسیار ہو رہا ہوں میں
فاصلے دل کے جسم تک پہنچے
سوز آزار ہو رہا ہوں میں

○

اجے مالویا

(الہ آباد)

اُس نے دِل کا حال بتانا چھوڑ دیا
ہم نے بھی گہرائی میں جانا چھوڑ دیا
جب اُس کو ہی دُوری کا احساس نہیں
ہم نے بھی احساس دِلانا چھوڑ دیا
میں نے کہا راستے ہیں دُشوار بہت
اُس نے تب سے ساتھ نبھانا چھوڑ دیا
جب یہ کہا کہ کرنا یاد دعاؤں میں
اُس نے دعا میں ہاتھ اُٹھانا چھوڑ دیا

○

رونالڈ فلوریس (Ronald Flores) ۱۹۷۳ء میں گوائٹے مالا میں پیدا ہوئے۔ان کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''چوتھا گھڑ سوار'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد شائع ہونے والے ان کے دوسرے مختصر کہانیوں کے مجموعے کا نام تھا ''رات کی مٹر گشتی'' (To Wander The Night)۔ان کے علاوہ انہوں نے نان فکشن کی صنف میں نو کتابیں تحریر کیں ہیں۔

یہ کہانی پڑھنا شروع کرنے سے قبل قارئین سے درخواست ہے کہ وہ سانحہ بلدیہ ٹاؤن، کراچی یاد کریں اور سوچیں کہ بھتہ نہ ملنے پر ڈھائی سو سے زائد افراد کو کارخانہ باہر سے مقفل کر کے کن لوگوں نے زندہ جلا دیا تھا۔اس جرم کا ارتکاب کرنے والے آج بھی زندہ ہیں۔انہیں سزا اس واقعے کے کئی سال بعد بھی نہیں ملی ہے۔خبریں آتی ہیں کہ اس واردات میں ملوث فلاں مجرم فلاں ملک کے فلاں شہر سے گرفتار کر کے لے آیا گیا ہے۔معمولی باتوں پر اللہ کا شکر بجا لانے والوں سے سوال ہے کہ کیا انہیں کبھی وہ لوگ یاد آتے ہیں جو اس کارخانے میں بلاوجہ، بلاقصور مار دیئے گئے تھے؟ ذیل کی کہانی ایسے ہی کسی کارخانے کی ہے جو اس ملک میں واقع تھا جس کے شہری اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یسوع مسیح نے ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

☆

اپنی پہلی ماہواری کے بعد ہی وہ گھر چھوڑ کر دارالحکومت چلی گئی تھی۔ وہ اپنی حالت بہتر بنانا چاہتی تھی وہ کچھ بننا چاہتی تھی۔مرد ابھی سے اس کی طرف توجہ دینے لگے تھے۔عام خیال تھا کہ ان مردوں مین سے کوئی اس کی جھگی پر دستک دینے ہی والا تھا۔اس طرح کے مہمان روایتاً خالی ہاتھ نہیں آیا کرتے تھے۔دیگر تحفے نہ سہی وہ چولہے میں استعمال ہونے والی لکڑی کا گٹھر ہی کم از کم لے آیا کرتے تھے۔لیکن وہ ابھی شادی کے لیے تیار نہیں تھی۔وہ جانتی تھی کہ زیادہ عرصے گھر میں رہی تو تقدیر میں چولہا ہی ہو جائے گا۔دن میں دو بار روٹیاں (Tortillas) تیار کرو، کھانا پکاؤ۔جسم کے بانجھ ہونے تک بچے جنتے رہو، شوہر کی پینے والی راتوں کو زبان قابو میں رکھو تا کہ اس کے ہاتھوں پٹنے سے محفوظ رہ سکو۔اگر وہ دیر تک جاگنے کا خواہشمند ہے تو اس کے ساتھ ہنستے مسکراتے رات گزارو۔اس کے ماں باپ نہیں چاہتے تھے کہ وہ گھر چھوڑے مگر بچپن ہی سے وہ خود سر اور ضدی تھی علاوہ ازیں وہ اس تجربے سے یقینی طور پر گزرنا چاہتی تھی جس سے اس کی سہیلیاں گزر چکی تھیں۔اب یہ ایسی بھی بات نہیں تھی کہ وہ کوئی نادر روزگار کام کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔اس کے ماں باپ اسے کسی ایسی حرکت کی اجازت نہیں دیتے تھے جو وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔اپنی باغی طبیعت کے باوجود وہ گھر سے بھاگی نہیں تھی۔ البتہ ان کے دلوں میں یہ خوف ضرور تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن انہیں چھوڑ جائے گی۔ادھر اسے بھی معلوم تھا کہ جب وہ گھر چھوڑنے کے فیصلے کا اعلان کرے گی تو وہ اسے ضرور روکیں گے لیکن اس نے ان کی مخالفت کی پرواہ نہیں کی اور بالآخر گھر چھوڑ دیا۔

اس کی ایک کزن دارالحکومت میں رہتی تھی اور ایک دولتمند گھرانے میں خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔دارالحکومت پہنچنے کے بعد اس نے اپنی کزن سے رابطہ کیا اور اس سے کہا کہ کیا وہ میرے لیے کسی نوکری کا بندوبست کر سکتی ہے؟ کزن نے صاف انکار کر دیا کیونکہ نوکریاں تھیں ہی نہیں۔اس کی کزن نے کہا کہ ''نوکری تو تمہیں خود تلاش کرنا ہوگی اور کوشش کرنا کہ جلد برسر روزگار ہو جاؤ کیونکہ تمہارے پیسے تو پلک جھپکتے میں خرچ ہو جائیں گے۔''اس نے مزید کہا کہ ''کاش میرے پاس جگہ ہوتی تو میں تمہیں اپنے ساتھ ٹھہرا لیتی۔میرے پاس یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، تمہیں میں رکھوں گی تو میری مالکن کو اعتراض ہوگا۔''

اس کی کزن نے ایک قریبی علاقے میں ایک مکان کا پتہ دیا جس کے مالکان نے چھوٹے چھوٹے کمرے بنا رکھے ہیں جو وہ کرائے پر اٹھاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ خود بھی اس مکان میں کچھ عرصہ قبل رہ چکی تھی۔کزن سے پتہ لے کر وہ باہر نکلی اور لوگوں سے پوچھتے پوچھتے اس مکان تک پہنچ ہی گئی۔وہ مکان شہر کے وسط میں ریلوے لائن کے قریب تھا لیکن محلّہ خطرناک تھا۔مکان سے کچھ فاصلے پر کسٹمز کا دفتر تھا۔شام کو یہ گلی اپنی طوائفوں کے لیے مشہور تھی جو تعمیراتی مزدوروں، شرابیوں، چوروں اور اچکوں کی خدمت کیا کرتی تھیں۔مکان والوں نے اسے ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر دے دیا۔کمرے کی دیواریں گتے کی تھیں۔ کچن مشترکہ تھا جبکہ تیس کرایہ داروں کے لیے ایک حمام تھا جس میں ٹوائلٹ بھی شامل تھا۔کبوتروں کے کابک جیسے ایک درجن کمروں میں یہ تیس افراد رہتے تھے۔ مکان کی چھت جست کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ کمرے سردیوں میں ٹھنڈے، گرمیوں میں گرم اور برسات میں اتنا شور مچاتے تھے کہ لگتا تھا کہ بارش باہر نہیں اندر ہو رہی ہے۔اتنا شور مچاتے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔اس کے کمرے کا کرایہ ڈیڑھ سو ماہوار مقرر کیا گیا تھا۔پانی اور بجلی کے بل میں سب کو حصّہ ڈالنا پڑتا تھا۔انفرادی طور پر کوئی کتنا بھی پانی یا بجلی خرچ کرے بل کی ادائیگی میں سب کو شامل ہونا پڑتا تھا۔اس نے اپنا معمولی سا سامان کمرے میں رکھا اور نوکری تلاش کرنے کے لیے باہر نکل آئی۔

ابتدائی دو ہفتوں کے دوران وہ روزانہ صبح سویرے نوکری تلاش کرنے کی غرض سے شہر کے گلی کوچوں میں منڈلاتی رہتی اور شام کو ناکام اور نامراد لوٹتی تو اس کے پاؤں سوجھے ہوئے ہوتے۔وہ دن میں ایک ہی بار کھانا کھاتی اس

لیے کہ اسے خوف تھا کہ تھوڑے سے جو پیسے ہیں جلد خرچ ہو جائیں گے۔ پھر کسی نے ایک کارخانے کا ذکر کیا کہ وہاں بھرتی ہو رہی ہے۔ کارخانے والوں کو ناتجربہ کار کارکنوں کی فوری ضرورت ہے۔ انہوں نے اسے سرکاری طور پر منظور شدہ کم سے کم اجرت کی پیش کش کی اور کہا کہ وہ قانون کا تحفظ بھی فراہم کریں گے۔ شفٹ صبح سات بجے شروع ہوتی اور شام چھ بجے تک جاری رہتی۔۔۔ اگر کارکن وقت مقررہ پر دیا گیا کام مکمل کرلیں تو انہیں گھر جانے کی اجازت ہوتی۔

وہ پہلے دن سات سے چند منٹ قبل کام پر پہنچی۔ کچھ مردوں نے انہیں قطار میں کھڑے ہونے کی ہدایت کی۔ قطار میں کارخانے کے عام ملازم بھی کھڑے ہوئے تھے۔ فورمین نے وہ جگہ بتائی جہاں کھڑے ہو کر اسے کام کرنا تھا۔ کام یہ تھا کہ جوتوں میں بنے ہوئے سوراخوں میں سے تسمے گزارنے کے لیے دھات کے بنے ہوئے کاج چپکانے تھے۔ ایک جوتے میں چار چھید تھے اور دن بھر میں سے ساٹھ جوڑی جوتوں میں سے یہ کاج لگانے تھے۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کوئی کاج گم جاتا تو اس کی قیمت اجرت میں سے منہا کرلی جاتی۔ غلطی کی صورت میں جرمانہ جوتے کی قیمت کے مساوی ہوتا۔ کام سخت تھا لیکن یونہی تھا۔ اسی لیے لوگ کہتے تھے کہ کام توجہ کے ساتھ کرو، احتیاط اور صبر کے ساتھ۔ فورمین نے اسے بتایا کہ دن کے بارہ بجے اسے لنچ کے لیے پچیس منٹ ملیں گے، جن میں وہ اگر چاہے تو باتھ روم بھی جا سکے گی۔ اس کے بعد اسے کوئی وقفہ نہیں ملے گا۔ فورمین نے تمام نئے ملازمین کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا۔ سب کو اپنی جگہ کام پر لگا کر فورمین کارخانے کا بیرونی دروازہ باہر سے یہ کہتے ہوئے مقفل کر گیا اب وہ دوپہر کے کھانے کے وقت واپس آئے گا۔ اگر کسی کو باتھ روم جانے کی ضرورت ہو تو اسے فورمین کی آمد کا انتظار کرنا ہوگا۔

اگلے پانچ گھنٹوں کے دوران اس نے پوری توجہ کے ساتھ اپنا کام کیا۔ جس مشین پر وہ کھڑی تھی اسی پر کھڑی رہی۔

بنیادی طور پر اس کی نوکری یہ تھی کہ جوتے کے سوراخ کے نیچے ایک دھات کا چھید والا کیل جیسا ٹکڑا، سوراخ میں پھنسائے اور سوراخ کے اوپر اسی طرح کا چھید والا لیکن سپاٹ ٹکڑا اس طرح رکھے کہ جب مشین کا ہتھوڑی نما آلہ سوراخ پر گرے تو چھید تسمہ یا دوڑی قبول کرنے کے قابل ہو جائے۔ مشین پر کام کرنے والے یا والی کا کمال یہ تھا کہ کاج کو مکمل کرتے ہوئے اپنی انگلی اور انگوٹھا بھی بچائے رکھے۔ اگر سوراخ کے اوپر یا نیچے دونوں ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا پھسل کر مشین کی ٹیبل پر گر جاتا تو وہ ٹکڑا دوسری بار استعمال کے قابل نہ رہتا اور مشین پر کام کرنے والے یا والی کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا۔ یہ کام توجہ طلب اور ایک لمحے کا تھا اور وہ اپنے کام میں مشغول تھی۔ ایک مرحلے پر اس نے کاج مکمل کرنے کی غرض سے مشین کے پیڈل پر پیر رکھا ہی تھا کہ اسے احساس ہوا کہ پیڈل کام نہیں کر رہا۔ شاید پیڈل کو تیل کی ضرورت تھی کیونکہ پیڈل پھنس سا گیا تھا۔

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اب کیا کرے کہ اتنے میں کھانے کے وقفے کا اعلان ہو گیا۔ وہ تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ گر پڑتی۔ وہ بہت آہستگی سے مشین سے خود کو علیحدہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی دونوں ٹانگیں سن ہو گئی تھیں جیسے سو گئی ہوں۔ اس کے کندھوں کے رگ پٹھے اکڑ گئے تھے۔ وہ اب تک بیس جوڑے تیار کر سکی تھی۔ کھانے کے بعد وقت پر گھر جانے کے لیے چالیس جوڑے مکمل ہونے باقی تھی۔ شفٹ ختم ہونے کے وقت وہ اپنا آدھا کوٹا (Quota) یعنی تیس جوڑے مکمل کر پائی تھی۔ فورمین (Foreman) نے کہا کہ چونکہ یہ اس کا پہلا دن تھا اس لیے کام مکمل نہ کر سکی۔ اس نے کہا، کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ کام کی رفتار بڑھ جائے گی۔ تاہم اس نے کہا کہ اسے آدھی اجرت ملے گی کیونکہ اس نے آدھا کام کیا تھا۔ ''ٹھیک ہے؟'' فورمین نے پوچھا۔ اس نے اقرار کیا کہ حساب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ اختلاف کیا کرتی اور یہ اجرت بھی نہ ملتی تو وہ کیا کر لیتی۔ گھر پیدل جاتے ہوئے وہ شدید تکلیف میں تھی۔ چلنا اسے دوبھر ہو رہا تھا۔ پیڈل کو ٹانگوں سے دباتے ہوئے جو زور لگتا تھا اس کی وجہ سے ٹانگیں سوج گئی تھیں۔ وہ چل کیا رہی تھی باقاعدہ لڑکھڑا رہی تھی۔ تھکن اور غصے کے باوجود وہ بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ کچھ نیند مل گی تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

اگلی صبح وہ وقت پر فیکٹری پہنچ گئی تھی حالانکہ ٹانگوں کی سوجن کم نہیں ہوئی تھی۔ کام کرتے ہوئے تھوڑا سا آگے کو جھکتی تو کمر کے نچلے حصے میں ٹیس سی اٹھتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی خشک شاخ کی طرح درمیان سے ٹوٹ جائے گی۔

نامساعد صورتحال کے باوجود اس نے دوسرے دن بھی بے حد توجہ کے ساتھ کام کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ کوٹا مکمل کر کے ہی گھر جائے لیکن شام کو شفٹ ختم ہونے کے وقت تک وہ ایک بار پھر تیس ہی جوڑے مکمل کر سکی۔ اس پورے پہلے ہفتے میں اس کی طرح دیگر نئے کارکن بھی اوسطاً تیس ہی جوڑے مکمل کر سکے۔ اگلے ہفتے فورمین نے انہیں خبردار کیا کہ اگر انہوں نے محنت سے کام نہ کیا تو جرمانے عائد کیے جائیں گے۔ جرمانے ادا کرنے کے باوجود کارکردگی بہتر نہ ہوئی تو انہیں نااہل قرار دے کر ملازمت سے مجبوراً نکالنا پڑے گا۔ یا پھر دوسری صورت یہ ہوگی کہ کوٹا مکمل کرنے کے لیے انہیں رات میں رکنا پڑے گا اور وہ رات گئے کوٹا مکمل کر کے ہی جا سکیں گے۔ فورمین کے مطابق کمپنی کو ایک مخصوص تعداد میں جوتے تیار کرنے کا آرڈر ملا تھا۔ جس رفتار سے وہ کام کر رہی تھی اس سے آرڈر کی تعداد پوری ہوتی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ فورمین نے مزید کہا کہ رات دیر تک کام کرنے کے باوجود اسے توقع ہے کہ تمام کارکن صبح سات بجے ٹھیک وقت پر کام پر آئیں گے ورنہ۔۔۔ ''صاف ظاہر ہے کہ میں دیر سے آنے والیوں کو نوکری سے نکالنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔'' فورمین نے آخری دھمکی دی تھی۔

کام کا کوٹا مکمل کرنے کے لیے اسے رات دو بجے تک رکنا پڑا۔ رات دو بجے تن تنہا فیکٹری سے گھر جاتے ہوئے اسے خوف آ رہا تھا۔ کہیں کھٹکا ہوتا، کوئی سایہ نظر آتا اسے اپنی طرف لپکتا دکھائی دیتا، ہر کھٹکے پر وہ اچھل اچھل

پڑتی۔اگلے دن صبح وہ پھر ٹھیک وقت پر فیکٹری پہنچ گئی۔البتہ ناکافی نیند کے سبب جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں۔اسے اپنے حالت پر رونا آ رہا تھا۔کبھی کبھی تو وہ سوچ کر گھبرا جاتی کہ کہیں مارے تھکن کے گر ہی نہ جائے۔پچھلی رات کے مقابلے میں اس رات اس نے اپنے کوٹے کا کام ذرا جلد ختم کرلیا۔

پورا ہفتہ یہی سلسلہ رہا۔جیسے جیسے دن گزر رہے تھے وہ اپنے کام میں رواں ہوتی جارہی تھی لیکن پھر بھی کام ختم کرتے کرتے اسے آٹھ،نو اور دس تو بج ہی جاتے۔کارکنوں کو خوش کرنے اور ان کا دل بڑھانے کے لیے فورمین نے فیکٹری میں موسیقی کا انتظام بھی کر دیا تھا۔فیکٹری بند ہونے کے اوقات کے بعد رات گیارہ بجے فورمین کی طرف سے کارکنوں کو دودھ میں بنا ہوا ایک ایک کپ دلیہ دیا جانے لگا۔اس موقع پر اس نے کہا کہ کمپنی کی طرف سے اب ہر مہینہ کے آخری ہفتہ یا اتوار کو کارکنوں کو پکنک پر لے جایا جائے گا۔پکنک کے اخراجات کمپنی ادا کرے گی۔

ابتدا میں اسے لگتا تھا کہ وہ یہاں ایک ہفتہ بھی مکمل نہ کر پائے گی لیکن گرتے پڑتے،روتے کراہتے اس نے ایک مہینہ مکمل کرلیا۔اسے پہلے مہینے کی تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلے کمرے کا کرایہ اور چھوٹے موٹے قرضے ادا کر دیئے جو وہ اپنی کزن سے لیا کرتی تھی اور جس سے اس کی ملاقات ہفتے میں ایک دن ضرور ہوا کرتی تھی۔اتوار کے دن۔

جلد ہی پکنک کا دن بھی آ گیا۔سارے کارکنوں کو وہ دو بسوں میں لاد کر ساحلِ سمندر پر لے گئے۔اس نے کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ موقع اس کے لیے واقعی ایک بڑا تجربہ تھا۔

وہ اسی جوش وخروش کے ساتھ پانی میں اتری تھی جیسے اپنے چھوٹے سے شہر کے دریا میں اترتی تھی۔اس نے پیراکی کا لباس پہن رکھا تھا جسے عریاں تو نہیں لیکن نیم عریاں ضرور کہا جاسکتا تھا۔اس کا گندمی رنگت کا بدن دمک رہا تھا اور اس کی ٹانگیں گذشتہ چند دنوں کی محنت کی وجہ سے سخت ہوگئی تھیں اور چمک رہی تھیں۔اس کی چھاتیاں پیراکی کے لباس کی انگیا سے نکل نکل جاتی تھیں۔وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس میں ایک خاص قسم کا وقار تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ جوان تھی۔فورمین جو ساحل سے دور ایک جھگی کے اندر بنے ہوئے بار میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا اسے دور سے دیکھ رہا تھا۔وہ اب اسے اچھی لگنے لگی تھی۔

واپس پر فیکٹری کے تمام کارکن بسوں میں بیٹھ گئے تھے لیکن وہ ابھی تک باہر تھی۔فورمین نے اپنے اسسٹنٹ سے کہہ کر اسے اپنی کار میں بٹھا لیا۔وہ گاڑی میں بیٹھنے پر رضامند تو ہوگئی لیکن خوفزدہ تھی۔وہ ناتجربہ کار تھی اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ خوفزدہ کیوں تھی۔ابھی فورمین کی گاڑی چلی نہیں تھی کہ اس نے کہا کہ وہ بار کے باتھ روم میں جانا چاہتی ہے۔دراصل اس نے گیلے کپڑوں پر خشک کپڑے چڑھا لیے تھے اور اب اچانک اسے ان گیلے کپڑوں سے نجات حاصل کرنے کا خیال آ گیا تھا۔فورمین اور اس کے اسسٹنٹ نے گاڑی روکی تو وہ اتر کر بار کی جانب بھاگی۔بار کے باتھ روم میں گھس کر اس نے جلدی جلدی کھال کی طرح اس کی جلد سے چپکا پیراکی لباس اتارا اور دوبارہ خشک لباس پہننے لگی تھی کہ فورمین باتھ روم میں گھس آیا۔اس نے دھکا دے کر اسے باتھ روم میں رکھے ایک ٹیبل پر گرا دیا۔انگیا کھینچ پھینکی اور ایک جھٹکے میں اس کی چڈی اتار کر ایک طرف اچھال دی۔اس نے پہلے کبھی مرد نہیں دیکھا تھا۔فورمین نیا یک ہاتھ سے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس کے ساتھ زبردستی کرنے لگا۔خوفزدہ لڑکی دہشت کے مارے کانپنے لگی۔اب فورمین اس پر باقاعدہ سواری کر چکا تھا۔وہ اپنے دانت پیس رہی تھی۔اچانک اسے شدید اور ناقابل فہم قسم کی تکلیف محسوس ہوئی۔اس کے منہ سے اس وقت چیخ بھی برآمد نہ ہوسکی۔اس نے سوچا کہ اگر فورمین نے کچھ کیا بھی ہے تو اس حرکت کو فراموش کر دوں گی۔

وہ ساحلِ سمندر سے شہر واپس آئے۔فورمین نے اسے اس کے گھر پر چھوڑا اور اگلے دن سے کام اسی طرح شروع ہوگیا جیسے پکنک سے پہلے ہو رہا تھا۔شام کو حسبِ معمول کام کا کوٹا ختم نہیں ہوا۔فورمین اور اس کے اسسٹنٹ نے فیکٹری کے دروازے مقفل کر دیئے اور اسے حکم دیا کہ کام ختم کرلو گی تو ہم خود تمہیں گھر چھوڑ دیں گے۔رات دس بجے کے لگ بھگ جب اس نے کام ختم کرلا اور گھر جانے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔وہ ان کے ساتھ گاڑی میں نہیں جانا چاہتی تھی جب اس نے اصرار کیا تو انہوں نے گیٹ کھول کر اسے نکالا۔اب وہ پیدل آگے آگے چل رہی تھی اور پیچھے گاڑی میں اس کا تعاقب ہو رہا تھا۔ایک بیابان اور تاریک گلی میں انہوں نے اسے دبوچ لیا اور گاڑی کے اندر اس کے ساتھ زبردستی کرتے رہے۔دونوں اس کے ساتھ وہ سب کچھ کرتے رہے جیسا ان کا دل چاہتا تھا۔اس کے بعد انہوں نے اسے دھمکیاں دیں:اگر اس نے کوئی شکایت کی یا نوکری چھوڑنے کی کوشش کی یا کسی سے کچھ کہا تو اسے جو کچھ ہوگا وہ دیکھ کر دنیا عبرت پکڑے گی۔کئی مہینے گزر گئے۔پھر ایک دن اسے احساس ہوا کہ وہ تو حاملہ ہو چکی ہے۔اس انکشاف کے بعد میں انہوں نے اسے نوکری سے نکال دیا۔ملازمت سے علیحدہ کرتے ہوئے فورمین نے اسے وجہ یہ بتائی:

''تو رنڈی بن گئی تھی!''اور یہ کہہ کر فیکٹری کا دروازہ اس کے منہ پر بند کر دیا۔

وہ اپنے شہر واپس نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے کہ وہ ابھی پندرہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ حاملہ ہوگئی تھی۔اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کے پیٹ میں کس کا نطفہ تھا۔فورمین کا یا اس کے اسسٹنٹ کا۔

اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ اس حالت میں اس کے گھر والے قبول نہیں کریں گے چنانچہ سب کچھ اسے تنہا ہی برداشت کرنا تھا۔اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ بہت غمزدہ ہوئی۔اس نے کھانا پینا بند کر دیا۔وہ ایک بڑے پیٹ والی بے روزگار عورت تھی۔لوگوں نے اسے بتایا کہ اس حالت میں تو کوئی اسے نوکری

باقی صفحہ ۱۰۸ پر ملاحظہ کیجیے

ایل ایس ڈی (Lysergic acid or LSD) ایک ایسا نشہ آور کیمیائی مادہ ہے جو ایک قسم کی کھمبیوں (Ergot of Rye) سے حاصل کیا جاتا ہے۔ سوئیز لینڈ کی دوا ساز کمپنی سینڈوز کے کیمیادان البرٹ ہوفمین (Albert Holfman) نے پودوں اور کھمبیوں کی طبعی تحقیق کے دوران سب سے پہلے اسے ۱۹۳۸ء میں دریافت کیا تھا۔ LSD ایک ایسا مالیکیول ہے جو ہاتھ لگانے سے جسم میں مساموں کے راستے داخل ہوسکتا ہے۔ ایک بار ڈاکٹر کی انگلی کے مساموں کے راستے جسم میں داخل ہوا تو اس نے اپنے محسوسات قلم بند کیے۔ یہ واقعہ ۱۹۔ اپریل ۱۹۴۳ء کا ہے اور اس واقعے کو LSD کا پہلا سفر بھی کہا جاتا ہے۔

امریکہ میں LSD کو عارضی طور پر دماغی حالت تبدیل کرنے (Mind Altering Ability) والی دوا کے طور پر استعمال کرنے کے لیے سینڈوز نے پچھلی صدی کی چوتھی دہائی کے دوران متعارف کرایا۔ ڈاکٹر کیمرن (Psychiatrist, Dr. Cameron) نے ایلن میموریل میں ۱۹۴۹ء میں راکفیلر فاؤنڈیشن کے زیرِ پرستی (McGill University) میں LSD پر تجربات شروع کیے۔ اس کی تحقیق کے مطابق مریض کا ذہن اس نشے کے زیرِ اثر قابو کیا جا سکتا ہے اور اس سے بُری عادات چھڑائی جا سکتی ہیں۔ ایک امریکی سائیکالوجسٹ ڈاکٹر ہمفری نے اپنے ایک مریض جو شراب چھوڑنا چاہتا تھا، کو LSD کے نشے کے زیرِ اثر ہپناٹائز کرنے کے بعد شراب نہ پینے کی تاکید کی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس واقعے کے بعد اس نے واقعی شراب ترک کر دی۔ اس کے بعد تو جیسے LSD کو شراب، نشہ آور ادویات، جوا اور بری عادات چھڑانے والے جادوئی کیمیائی مادے کا نام دیا گیا۔ اس دوران LSD کی دماغی حالت تبدیل کرنے والے تجربات کی بھنک CIA کو پڑی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ جاری تھی اور CIA کے ڈائریکٹر ایلین ڈلس (Allen Dulles) کا بیٹا کوریا کی جنگ کے دوران سر میں گولی لگنے سے زخمی ہو گیا تھا اور وہ نیورالوجسٹ ڈاکٹر ہیرالڈ ولف (Harold Wolff) کے زیرِ علاج تھا۔ ولف اور ڈلس نے LSD کے تجربات کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ ڈلس کا خیال تھا کہ جاسوسوں پر تشدد کرنے کی بجائے LSD کے زیرِ اثر ان سے آسانی کے ساتھ راز اُگلوائے جائیں اور ان جاسوسوں کو اپنے ہی ملک کی ذمہ دار اور امریکہ کی ناپسندیدہ شخصیات کا قتل کروانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ ڈلس نے CIA کی جانب سے LSD کو بیرین واش (Brain Wash) کرنے والے کیمیائی مادے کے طور پر تجربہ کرنے کے لیے ڈاکٹر ولف کو تیار کیا۔ ڈلس نے ولف سے وعدہ بھی کیا کہ اس تجربے کی تمام فنڈنگ CIA کی جانب سے ہوگی۔

ڈاکٹر ولف کے پاس اب CIA کی رقم بھی تھی اور LSD بھی تھی لیکن اسے خود کو تجربے کے طور پر پیش کرتے انسان میسر نہیں تھے۔ انسانوں کو کسی سائنسی تجربات کے لیے (Human Guinea Pigs or Experimental humans) استعمال کرنا امریکہ میں غیر قانونی اور ناپسندیدہ تھا اور اب بھی ہے۔ اس کا تدارک انہوں نے دماغی امراض کے مریضوں کو ان کے علم کے بغیر Human Guinea Pigs کے طور یا Candidates کے طور پر استعمال کرنے سے کیا۔

CIA نے اس پراجیکٹ کا نام مینچورین کینڈیڈیٹس (Manchurian Candidates Project) رکھا۔ ہالی وڈ نے ۱۹۷۴ء اور ۲۰۰۴ء میں اس پر دو فلمیں بھی بنائی تھیں۔ اس پراجیکٹ کے تحت دماغی امراض کے مریضوں کو بتائے بغیر LSD دینے کے بعد ان کو ہپناٹائز کیا جاتا اور اسی عالم میں انہیں کچھ کرنے کو کہا جاتا۔ نشہ اترنے کے بعد ان کو دیکھا جاتا کہ آیا وہ ہمارا کہا کام کر بھی رہے ہیں یا نہیں۔ ان ہی دنوں ایلین ڈلس کا انتقال ہو گیا اور CIA کے نئے سربراہ نے ڈاکٹر ولف کو یقین دہانی کراتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا جس کے تحت Psychiatrist ڈاکٹر کیمرن (Dr. Cameron) کی سرکردگی میں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں یہ مشن درپردہ زور پکڑ گیا اور ذہنی مریض اس تجربے میں Manchurian Candidates طور پر استعمال کیے جانے لگے۔ مثال کے طور پر مسز اورلیکو (Mrs. Orlikow) نے ۱۹۵۶ سے ۱۹۵۸ء تک ڈاکٹر کیمرن سے LSD سے علاج کروایا۔

دماغی مریضوں پر CIA کے فنڈز سے بظاہر علاج کے درپردہ LSD کے استعمال کے زیرِ اثر ہپناٹائز کرنے کے بعد ان کا برین واش کیا جاتا۔ اس کے بعد ان کو کچھ ایسی حرکات کرنے کو کہا جاتا جو وہ اپنے طور پر نہ کر سکتے اور پھر ان کے اردگرد ایسا ماحول تخلیق کیا جاتا جس کے تحت وہ یہ کام کر گزرتے۔ مثال کے طور پر لورن جی (Lauren G) مونٹریال میں دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر ہنکل (Lawrence Hinkle) کے زیرِ علاج تھی۔ اس کو LSD کے زیرِ اثر ۱۹۵۹ء میں ہپناٹائز کر کے کہا گیا کہ وہ سخت برف باری والے دن کینیڈا کے ماؤنٹ رائل کی چوٹی سر کرے۔ اس نے برف باری کے دوران پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ تجربات کرنے والوں نے ۱۹۶۸ء کو CIA کے صدر دفتر رپورٹ بھیجی کہ LSD کا اثر صرف کمزور دماغوں پر ہوتا ہے اور کند ذہن لوگوں کو ہی Manchurian Candidates کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ وہی سال تھا جب سعودی عرب کا ایک چوبیس سالہ کند ذہن شہزادہ

اور شاہ فیصل کا بھتیجا فیصل بن سعود بر کلے یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یہاں اس کی ملاقات صوفیہ نامی ایک گوری سے کرائی گئی۔ کرائی گئی سے میری مراد ہے کہ وہ CIA کی ایک ایجنٹ تھی اور اس کا صوفیہ نام بھی فرضی ہے۔ اس نے بے وقوف شہزادے کو اپنے حسن کے جال میں پھانسنے کے ساتھ ساتھ LSD کے نشے سے متعارف کرایا۔ شہزادہ یونیورسٹی اور اپنے گھر سے کئی کئی روز صوفیہ کے ساتھ غائب رہنے لگا۔ صوفیہ LSD کے نشے کے دوران شہزادے کی برین واشنگ کرتی اور اسے نشے سے نکلنے کے بعد عجیب عجیب حرکتیں کرنے کو کہتی۔ مثال کے طور پر ایک دن صوفیہ نے اسے LSD کے نشے کے دوران کہا کہ کل تم یونیورسٹی کی لائبریری میں ڈانس کرنا۔ شہزادہ دوسرے روز واقعی لائبریری میں ڈانس کرنے لگا۔ کسی طالب علم نے بر کلے یونیورسٹی پولیس کو فون کر کے رپورٹ درج کر دی۔ بر کلے یونیورسٹی پولیس نے ۱۹۷۰ء میں شہزادے کو ڈانس کے دوران یونیورسٹی لائبریری میں گرفتار کر لیا۔ تلاشی لینے پر اس کے قبضے سے LSD برآمد ہوئی اور پولیس نے اسے نشہ آور کیمیائی مادہ رکھنے کے جرم میں حراست میں لینے کے بعد اس پر مقدمہ درج کر دیا۔ یونیورسٹی پولیس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شہزادے سے LSD کے نشے کے تجربات CIA کے ایک Manchurian Candidates کے طور پر کروائے جا رہے ہیں۔ CIA کو خبر ہونے سے پہلے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے امریکہ کی اخبارات میں شائع ہو گئی۔

CIA نے فوراً معاملہ رفع دفع کروا دیا اور شہزادے پر کوئی مقدمہ نہ چلا۔ اس کے بعد شمالی کیلیفورنیا کے آس پاس کی تمام قانون کی محافظ ایجنسیوں کو ایک خفیہ آرڈر کے تحت شہزادے سے دور رہنے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ ۱۹۷۲ء میں شہزادے کو بر کلے یونیورسٹی کے گریجویٹ سکول میں داخلہ مل گیا اور اس پر LSD کے خفیہ تجربات بھی جاری رہے اور اسے مینچو رین کینیڈیٹس کے طور پر تیار کیا جاتا رہا۔

ان دنوں بھٹو پاکستان کے افق پر ایک سیاسی لیڈر کے طور پر ابھر رہا تھا اور سعودی عرب اور دنیائے اسلام میں شاہ فیصل کا طوطی بولتا تھا اور یہ دونوں لیڈر امریکہ کو کھٹکتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان میں بھٹو برسرِ اقتدار آئے۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل بھٹو کو ایک فارن ڈپلومیٹ کی حیثیت سے اچھی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک ملاقات کے دوران مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیے بھٹو نے شاہ فیصل کو تین نکاتی فارمولا پیش کیا جس کا نام یونائیٹڈ سٹیٹس آف اسلام رکھا۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۹۷۳ء میں پہلی اسلامی سربراہان کی کانفرنس پاکستان کے شہر لاہور میں بلائی گئی۔ جس میں اسلامی تاریخ میں پہلی اور شاید آخری بار دنیائے اسلام کے سربراہان نے یہ سہ نکاتی فارمولا صد فی صد ووٹ دے کر منظور کر دیا۔ (United States of Islam) کے تحت منظور کیے جانے والے پہلے نکتے کے مطابق مسلمانوں کا پیسہ امریکی اور یورپی بینکوں کے بجائے مسلمان بنکوں میں ہونا چاہیے۔ حل کے طور پر ایک مسلمان بنک بی سی سی آئی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی قیادت آغا حسن عابدی کے حصے میں آئی۔ دوسرے نقطے کے تحت عرب ممالک کی رقم سے پاکستان میں مسلم بم یعنی ایٹم بم بنایا جائے گا جس کے تحت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تقرر عمل میں آیا۔ تیسرے نقطے کے تحت تیل کو بڑی طاقتوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اگر امریکہ اور یورپی طاقتوں نے مسلمانوں کا پیسہ مسلمان بنکوں میں ٹرانسفر کرنے سے انکار کیا تو تیل کا ہتھیار خصوصی طور پر آزمایا جائے گا۔ قارئین کی اطلاع کے لیے یہاں عرض کرتا جاؤں کہ اگر آج مسلمانوں کے تیل کا پیسہ مغربی ممالک سے نکل جائے تو یہ ممالک قرق ہو جائیں اور ان کی اکانومی اپنی موت آپ مر جائے۔

اپنے ان نکات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شاہ فیصل نے بھٹو کے اشارے پر امریکہ سے ۱۹۷۲ء کی گرمیوں میں تمام سعودی رقم بی سی سی آئی میں ٹرانسفر کرنے کا پہلا مطالبہ کر دیا اور اس کے ساتھ امریکہ کو تیل کی سپلائی آدھی کر دی جس کے نتیجے میں امریکہ میں تیل کا بحران خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ جس نے نہ صرف امریکہ بلکہ دنیائے مغرب کے پاؤں اکھاڑ دیے اور یہ وہ وقت تھا جس نے مغرب کو تیل کے ہتھیار کی طاقت کا احساس دلایا اور تمام دنیا یکجا ہو کر مسلمانوں کے خلاف ایک صف میں کھڑی ہو گئی۔ تیل کا بحران اینٹی اسلام عمارت کی پہلی اینٹ ثابت ہوا جو آج بہت بڑی طاقت بن کر مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والی ایک سنگلاخ عمارت کی صورت ہمارے درمیان نفرت کو ہوا دے رہی ہے۔

ہم آپس میں مل بیٹھیں تو ایک سمندر ہو جائیں
اسی لیے تو دشمن ہم کو قطرہ قطرہ کرتے ہیں

۱۹۷۳ء کے درمیان تک CIA نے بھٹو اور شاہ فیصل کو مغرب کے لیے خطرناک ترین سربراہانِ مملکت قرار دے کر ان کے اقتدار کی مخالفت میں اپنی تمام قوت لگا دی۔ چونکہ شاہ فیصل امریکہ کو آنکھیں دکھا رہا تھا، شاہ فیصل نے امریکہ کا تیل بند کیا تھا اور شاہ فیصل امریکہ کے بنکوں سے پیسہ نکلوانا چاہتا تھا اس لیے شاہ فیصل کو راستے سے ہٹانا سی آئی اے کی پہلی ذمہ داری بنا دی گئی اور یہ بہت ضروری ہو گیا کہ امریکہ یہ کام جلد ہی انجام دینا چاہتا تھا۔ CIA پر حکومت کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے پاس وقت کم تھا۔

CIA والوں کی عادت ہے کہ وہ کسی سربراہ کو یا امریکہ کی کسی بھی ناپسندیدہ شخصیت کو ان کی کمزوریاں اچھال کر بدنام کرتی ہے جیسا انہوں نے مینویل نوریاگا کے ساتھ ۱۹۸۹ء کیا تھا۔ شاہ فیصل اور بھٹو اپنے شفاف کردار کے مالک ہونے کی وجہ سے بدنامی یا بلیک میلنگ سے ہاتھ آنے والے نہیں تھے اس لیے CIA اس میدان میں بے بس نظر آتی تھی اور CIA اپنا آخری حربہ آزمانے کو تیار ہو گئی۔ CIA نے بھٹو کو شرابی کے طور پر مسلمانوں اور پاکستانیوں میں مولویوں کے ہاتھوں بدنام کرنے کی ٹھانی اور بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو اس نے ان کے دام میں آنے کی بجائے پوڈیم پر کھڑے ہو کر ایک عام خطاب میں اپنے شراب پینے کا اعلان کر دیا جس نے سی آئی اے کو اور بوکھلا دیا۔

باقی صفحہ ۱۰۰ پر ملاحظہ کیجیے

ہو چی منہ سٹی

ہمارا جہاز صبح نو بجے کوالالمپور کے ہوائی اڈہ سے اڑا تو فضا سے شہر کے چاروں طرف سرسبز کھیت کھلیان نظر آنا شروع ہوئے۔ جوں ہی جہاز نے ویت نام کے شہر ہو چی منہ کی طرف رخ کیا تو گھنے سرسبز جنگلات کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں پہاڑ، ندی نالے اور جھیلیں نظر آتی رہیں۔ ویت نام اور ملائشیاء کے درمیان بحیرہ جنوبی چین کا سمندر ہے جو ایک خلیج کی شکل میں نظر آتا ہے جسے عبور کیا تو پائلٹ نے اعلان کیا اب ہم ویت نام پہنچ چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے......اس اعلان کے ساتھ ہی چند منٹوں کے اندر جہاز ہو چی منہ کے ہوائی اڈہ پر اُتر گیا۔

تب مقامی وقت کے مطابق صبح کے دس بجے تھے۔

ہوائی اڈہ پر امیگریشن حکام نے ہمارے پاسپورٹ کا جائزہ لیا اور دو ہفتے کا ویزہ بغیر فیس وصول کیے جاری کر دیا۔ ویزہ کے بعد ہم ہوائی اڈہ کے اندر ایک بنک میں گئے تا کہ مقامی کرنسی حاصل کی جائے تو یہ جان کر میں ہوا میں اڑنے لگا کہ چند لمحات کے اندر میں......کروڑ پتی......بن گیا۔

میں نے بنک میں ایک سو برطانوی پونڈ دیئے تو انھوں نے اس کے متبادل تین کروڑ ویت نامی ڈنگ Dong دیئے۔ یعنی ایک پونڈ کے تیس ہزار...... جبکہ ایک برٹش پونڈ کے ڈیڑھ سو پاکستانی روپے اور بھارت کے نوے روپے ملتے تھے۔ کروڑ پتی بن کر میں ابھی اکڑ کر چلنے ہی والا تھا کہ بیگم نے فرمائش کی......

مجھے چائے پینی ہے میں نے سینہ تان کر کہا جتنی مرضی پیو......

ہم نے ایک قہوہ خانہ سے تین کپ چائے خریدی تو دکاندار نے دو لاکھ ڈنگ وصول کر لیے۔ اس سے مہنگی چائے میں نے زندگی میں کبھی نہیں پی۔ اس طرح معلوم ہوا یہ جس حساب سے دیتے ہیں اُسی حساب سے واپس بھی لے لیتے ہیں۔

ہم ہوائی اڈے سے باہر نکلے تو سامنے بیٹے خرم کا دوست ثاقب ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ثاقب نے بتایا کہ خرم اس وقت کالج میں پڑھا رہا ہے اس لئے میں آپ کو لینے حاضر ہوا ہوں۔

ثاقب کا خاندان پاکستان سے نقل مکانی کر کے برطانیہ آباد ہوا ہے۔ اس وقت اس کے امی ابو اور بہن بھائی بریڈفورڈ میں رہتے ہیں لیکن ثاقب میرے بیٹے کی طرح ویت نام میں انگریزی پڑھاتا ہے۔

ثاقب نے فون کیا تو سفید رنگ کی ایک ٹیکسی ہمارے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس پر گریب Grub لکھا ہوا تھا۔ انگریزی میں گریب تو پکڑنے یا گرفت میں کرنے کو کہتے ہیں لیکن یہ ایک ٹیکسی فرم ہے جو گاہکوں کو نہ صرف پکڑتی ہے بلکہ منزل مقصود پر پہنچاتی بھی ہے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے تو معلوم ہوا یہ ائر کنڈیشن اور صاف ستھری ہے۔ ڈرائیور سفید قمیص اور پتلون، کالا کوٹ اور کالی ٹائی میں بڑا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ اگر میں اس کے سینے پر ڈرائیور کا بیج نہ دیکھتا تو میں اسے ویتنام کا کوئی وکیل ہی سمجھتا۔

ڈرائیور نے ہمارا سامان گاڑی میں رکھا اور گیئر لگا کر گاڑی کا رخ شہر کی طرف موڑ دیا۔ ہم ہوائی اڈہ سے نکل کر جب بڑی شاہراہ پر پہنچے تو دیکھا شہر کی سڑکیں کشادہ، علاقہ میدانی اور حدنظر تک پھیلا ہوا شہر ہی شہر نظر آ رہا تھا۔

ہوائی اڈے سے ہوٹل کے سفر کے دوران میں نے دیکھا......ایک طویل جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے ایک ہنستا کھیلتا شہر جو کھنڈرات میں بدل گیا تھا......اب اُن کھنڈرات میں سے ایک نیا شہر اُبھر رہا تھا۔ بڑی بڑی عالی شان عمارتیں آسمان کو چھوتی اپنی کامیابی کے ترانے گاتی نظر آئیں......جو سینہ تان کر کہہ رہی تھیں کہ دنیا میں ہم سے بہادر کوئی اور قوم ہے تو سامنے آئے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف قطار در قطار عمارتیں کچھ مکمل اور باقی زیر تعمیر جن پر دھڑا دھڑ کام ہو رہا تھا۔

اور دوسری طرف

کھلی چار چار لائین پر مشتمل سڑکیں

جن پر گاڑیاں کم اور سکوٹر اس قدر کہ یہ شہر مجھے سکوٹروں کا شہر نظر آنے لگا۔

عورتیں مرد نوخیز لڑکے اور لڑکیاں فراٹے بھرتے سکوٹر دوڑا رہے تھے۔ ٹریفک لائیٹ پر جب گاڑیاں رکتیں تو حد نظر تک رنگ برنگے سکوٹر ہی سکوٹر نظر آتے۔

جیسے ہی سبز بتی جلتی یہ پھر دوڑ لگا دیتے......

دبلی پتلی عورتیں اور مرد جب سکوٹر سڑکوں پر دوڑاتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی یہ ہوا کے دوش پر اڑ جائیں گے......لیکن اپنے قیام کے دوران کسی کو اڑتے نھیں صرف فراٹے بھرتے دیکھا۔

سدابہار جوان

اے سی ای ACE نامی ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ جسے ہم نے برطانیہ سے پیشگی بک کروا دیا تھا۔ ہوٹل کے دفتر استقبالیہ پر موجود لڑکیاں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے یہ آج سکول سے بھاگ کر کام پر آئی ہیں۔

میں نے بیگم سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا یہ سکول گرلز نھیں بلکہ

کافی عمر کی پختہ عورتیں ہیں لیکن اس ملک کی غذا اور موسمی اثرات کی وجہ سے یہ فربہ نہیں اور پھر دن رات محنت کی وجہ سے سلم اور سمارٹ ہیں۔

یہ سن کر میں نے کہا تو اس کا مطلب ہے......

ویت نام کے لوگ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔

یہ سدا بہار جوان رہتے ہیں۔

ویت نام کی دبلی پتلی عورتوں کو دیکھ کر مجھے وطن عزیز کی آسودہ حال گھرانے کی وہ خواتین یاد آنے لگیں جو خوش خوراکی کی بدولت اپنے وزن کے نیچے دبی جارہی ہیں۔ اگر یہ خواتین اپنے آپ کو ہلکا پھلکا صحت مند رکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں تو انھیں چاہئے کہ چند ماہ ویتنام میں مقامی خواتین کی طرح زندگی بسر کریں تو انشاءاللہ آفاقہ ہوگا۔

اے سی ای ACE نامی ہوٹل سٹی سنٹر کے قریب ڈسٹرکٹ ون میں تھا۔ یہ کثیر منزلہ ہوٹل تھا۔ ہمیں دوسری منزل پر کمرہ نمبر 203 اور بیٹی نفیسہ کو کمرہ نمبر 202 الاٹ ہوا۔ کمرے کھلے ساتھ ملحق باتھ روم، خوبصورت بیڈ اور بیٹھنے کے لئے کرسیاں اور لکھنے پڑھنے کے لئے الگ میز اور کرسی۔ ہوٹل دیکھ کر بیگم خوشی سے چہکنے لگی اور پھر مجھ سے پوچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چارستاروں والا ہوٹل بہت ہی مہنگا ہوگا۔؟

میں نے جواب دیا بالکل نہیں۔

بیگم سمجھی کہ میں مزاق کررہا ہوں......

لیکن

جب میں نے بتایا کہ ایک رات کے بمعہ ناشتہ کے ہم پچیس پونڈ ادا کریں گے تو بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اُس نے کہا تو اس کا مطلب ہے یہ مفت میں ملا۔ ہم جس ملک میں بھی گئے اس طرح کے ہوٹل کا کرایہ سو پونڈ سے کہیں بھی کم ادا نہیں کیا۔

خرم سے ملاقات

ہم گذشتہ چوبیس گھنٹوں سے سفر میں تھے۔

ہوٹل پہنچتے ہی سو گئے۔ ہماری آنکھ شام سات بجے اُس وقت کھلی جب بیٹے خرم نے آکر ہمیں گہری نیند سے بیدار کیا۔

خرم سے مل کر ہم خوش ہوگئے۔

ماں تو اُسے چوم رہی تھی۔

میں نے دیکھا اس کی صحت قدرے بہتر تھی۔

اب نفیسہ بھی بیدار ہوکر ہمارے کمرے میں آگئی تھی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ باہر چلتے ہیں تاکہ تھوڑا گھوم پھر لیں اور پھر شام کا کھانا بھی کھا لیا جائے۔

ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو سامنے ایک سکوٹر کھڑا تھا۔

خرم نے کہا......ڈیڈ یہ میرا ہے۔

میں نے کہا تم نے بھی رومنوں کے اُس مقولے پر عمل کیا......

جیسا دیس ویسا بھیس یعنی Do in Rome as the Romans do

خرم کا سکوٹر دیکھ کر شمیم تھوڑی پریشان ہوئی کہ اس رش میں میرا بیٹا اسے کیسے چلاتا ہوگا......لیکن خرم نے کہا یہ سب لوگ بھی تو میری طرح کے انسان ہیں اگر یہ چلا سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں......!!!

خرم کی بات سچ تھی۔

ہوٹل سے نکل کر ہم نے چہل قدمی شروع کردی۔ اس دوران شمیم ماں کی ممتا کو عملی جامعہ پہناتے ہوئے خرم کے ساتھ لپٹی اُسے بغل میں لیے آہستہ آہستہ چلتی اور ساتھ ساتھ بیٹے سے پوچھتی جاتی ......

میری جدائی میں تمہارے دن کیسے بسر ہوئے......؟

تم گھبرائے تو نہیں......؟

کھاتے کیا ہو......؟

پکاتے کس طرح ہو......؟

کپڑے کون دھو کر دیتا ہے......؟

استری کون کرتا......؟

گھر سے کالج کتنا دور ہے......؟

اس شہر میں کوئی مسجد یا حلال کھانے کا ریسٹورنٹ ہے۔؟

تنخواہ کے پیسے بنک میں رکھنے کی بجائے خرچ کرو......اگر مزید پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔ یوں ہی باتیں کرتے ہم ایک ریسٹورنٹ جا پہنچے۔

ریسٹورنٹ میں بہت رش تھا۔

استاد کہتے ہیں......

جس ریسٹورنٹ میں رش ہو وہاں کھانا کھانا چاہئے۔

رش ہمیشہ لذیز کھانوں کی نشاندھی کرتا ہے۔ ہم اندر گئے تو ایک جواں سال میزبان لڑکی نے جھک کر ہمیں خوش آمدید کہا اور پھر ایک جگہ بٹھا کر کھانوں کا مینیو ہمارے سامنے رکھ دیا۔

خرم نے مشورہ دیا......

ڈیڈی اس ملک میں تکے کباب والی بات تو نہیں......اس لئے بہتر ہے سبزیوں پر مشتمل کھانوں کا انتخاب کیا جائے......

ہم نے خرم کی رائے کو معتبر سمجھا اور اُسی کو اختیار سونپا کہ وہ اپنے تجربے کے مطابق کھانوں کا آرڈر دے۔

خرم نے میزبان لڑکی کو ویت نامی زبان میں کچھ کہا جو ہمیں سمجھ نہ آیا۔ لیکن لڑکی سمجھ گئی جو جی ہاں کہتی چلی گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھانوں کی ٹرے اٹھائے آئی اور میز پر سبزیوں پر مشتمل رنگ برنگے کھانے سجا دیئے۔

کھانا کھایا تو مزہ آگیا۔

کھانے کے بعد ہم واپس ہوٹل آئے تو خرم نے کل دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور اپنے سکوٹر پر بیٹھ کر مقامی لڑکوں کی طرح یہ جا......وہ جا......
خرم چلا گیا تو میں نے شمیم کو کہا کہ یہ اچھی بات ہوئی کہ خرم نے مقامی زبان سیکھ لی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اردو اور پنجابی میں اچھی طرح بات چیت نہیں کرسکتا۔ لیکن ویت نامی زبان سیکھنا اس لئے ضروری ہے چونکہ اس سے اس کی نوکری جڑی ہوئی ہے۔ اس طرح مجھے یہ بات سمجھنے میں تقویت ملی کہ اگر کسی بھی زبان کے ساتھ معاشی وابستگی ہوجائے تو لوگ اُسے سیکھنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔
انگریز جب برصغیر پہنچا تو اپنے مطلب کی خاطر مقامی زبانیں سیکھیں۔
بلکہ......
اردو کی آبیاری کرتے ہوئے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔
خرم نے ہمیں بتایا کہ......
جب یورپ نے دنیا کو اپنے قبضہ میں لے کر کالونیاں بنانی شروع کیں تو ویت نام پر اہل فرانس نے قبضہ کیا۔ جنھوں نے فرانسیسی طرز پر ویت نام کے شہروں کو ڈیزائین کیا۔ مغربی ممالک کے باشندے تجارتی اور فوجی روپ دھار کر جب کسی ملک پر قبضہ جماتے تو لوگوں کے زخموں پر مرہم لگانے کے لئے ان کے ساتھ پادری بھی ہوتے تھے۔
پادری......
تبلیغ عیسائیت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔
اگر چہ ویت نامی لوگوں کی اکثریت کا کوئی مذہب نہیں......
لیکن اس کے باوجود شہر میں فرانسیسیوں کے تعمیر کردہ کئی چرچ موجود تھے۔

☆

- بقیہ -

مینچورین کینڈیڈیس

دوسری جانب چھ سال کے مسلسل LSD کے استعمال اور برین واشنگ کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے تجرباتی ادوار سے گزرنے کے بعد شہزادہ Manchurian Candidate کے طور پر تیار ہو چکا تھا اور اسے شاہ فیصل کے ایک مخفی قاتل کے طور پر واپس سعودی عرب بھجوانے کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں دکھتا تھا۔ صوفیہ بھی اس کی زندگی سے اچانک غائب ہوگئی تھی۔ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی امید پر CIA نے برکلے یونیورسٹی پولیس کو شہزادہ فیصل پر ۱۹۷۰ء والے LSD کا پرانا کیس کھول کر مقدمہ چلانے کا اشارہ کر دیا۔ تیسری جانب شہزادے کو فارن ڈپلومیٹ کی رعایت دیتے ہوئے کہا گیا کہ وہ امریکہ چھوڑ کر اپنے ملک واپس چلا جائے ورنہ اسے مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بہانہ شہزادے کو وطن واپس بھجوانے کے لیے تھا اور جس کا پوشیدہ مقصد اس کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا کہ وہاں شہزادہ Manchurian Candidate کے مطابق اپنا کام سرانجام دے گا۔

شہزادے پر CIA کی چھ سال کی محنت رنگ لائی۔ وہ ۲۳۔ مارچ کو وطن پہنچا اور اس نے دربارِ عام میں شاہ فیصل کو ۲۵۔ مارچ ۱۹۷۵ء کو شہید کر دیا۔ شاہ فیصل کی شہادت کے فوراً بعد CIA نے Manchurian Candidates Project کو سرِعام ناکام کہتے ہوئے اس سے متعلق تمام ریکارڈ نذرِآتش کر دیے۔ شاہ فیصل کے بعد پاکستان میں جنرل ضیا کا مارشل لاء بھٹو کو راہ سے ہٹانا اس سلسلے کی دوسری کڑی تھی اور CIA نے جنرل ضیا کے توسط سے بھٹو کا جو حشر کروایا وہ بھی ہم سب جانتے ہیں۔ بی سی سی آئی بینک کو بھی بدنامی میں گم کر دیا گیا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو بھی نیک نام نہ رہنے دیا گیا۔
قارئین حضرات نوٹ فرمائیں کہ یہ مقالہ کافی اختصار سے لکھا گیا ہے حالانکہ اس پر تاریخی شواہد کے ساتھ ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اگر قارئین میں کوئی دوست اس پراجیکٹ پر میرے ساتھ مل کر کام کرنا چاہے تو مجھے خوشی ہوگی اور پراجیکٹ جلدی کتابی شکل میں تیار ہوسکتا ہے۔ اگر میں اکیلا رہا اور زندگی نے وفا کی تو میں اس پر ایک سیر حاصل کتاب پیش کروں گا۔

"جبیں پر شکن"

نورا

اسرارالحق مجاز

(●)

وہ نوخیز نورا وہ اک بنت مریم
وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پر خم
وہ ارض کلیسا کی اک ماہ پارہ
وہ دیر و حرم کے لیے اک شرارہ
وہ فردوس مریم کا اک غنچۂ تر
وہ تثلیث کی دختر نیک اختر
وہ اک نرس تھی چارہ گر جس کو کہیے
مداوائے درد جگر جس کو کہیے
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی
ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پر رعب تیور وہ شاداب چہرہ
متاع جوانی پہ فطرت کا پہرہ
مری حکمرانی ہے اہل زمیں پر
یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر
سفید اور شفاف کپڑے پہن کر
مرے پاس آتی تھی اک حور بن کر
وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا
کہ انداز تھا اس میں جبریل کا سا
وہ اک مرمریں حور خلد بریں کی
وہ تعبیر آذر کے خواب حسیں کی
وہ تسکین دل تھی سکون نظر تھی
نگار شفق تھی جمال نظر تھی
وہ شعلہ وہ بجلی وہ جلوہ وہ پرتو
سلیماں کی وہ اک کنیز سبک رو
کبھی اس کی شوخی میں سنجیدگی تھی
کبھی اس کی سنجیدگی میں بھی شوخی
گھڑی چپ گھڑی کرنے لگتی تھی باتیں
سرہانے مرے کاٹ دیتی تھی راتیں
عجب چیز تھی وہ عجب راز تھی وہ
کبھی سوز تھی وہ کبھی ساز تھی وہ
نقاہت کے عالم میں جب آنکھ اٹھتی
نظر مجھ کو آتی محبت کی دیوی
وہ اس وقت اک پیکر نور ہوتی
تخیل کی پرواز سے دور ہوتی
ہنساتی تھی مجھ کو سلاتی تھی مجھ کو
دوا اپنے ہاتھوں سے مجھ کو پلاتی
اب اچھے ہو ہر روز مژدہ سناتی
سرہانے مرے ایک دن سر جھکائے
وہ بیٹھی تھی تکیے پہ کہنی ٹکائے
خیالات پیہم میں کھوئی ہوئی سی
نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی
جھپکتی ہوئی بار بار اس کی پلکیں
جبیں پر شکن بے قرار اس کی پلکیں
وہ آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے
وہ عارض کے شعلے بھڑکتے ہوئے سے
لبوں میں تھا لعل و گہر کا خزانہ
نظر عارفانہ ادا راہبانہ
مہک گیسوؤں سے چلی آ رہی تھی
مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی
جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لب لعل افشاں سے اک شے چرا لی
وہ شے جس کو اب کیا کہوں کیا سمجھیے
بہشت جوانی کا تحفہ سمجھیے
شراب محبت کا اک جام رنگیں
سبو زار فطرت کا اک جام رنگیں
میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائے گی وہ
ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائے گی وہ
میں دیکھوں گا اس کے بپھرنے کا عالم
جوانی کا غصہ بکھرنے کا عالم
ادھر دل میں اک شور محشر بپا تھا
مگر اس طرف رنگ ہی دوسرا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر
کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر
نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ
یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہو کر

ماندگی

پروین شیر
(نیوجرسی)

گو تعلق کا مظبوط اک تار ہے
اک کنارہ مری مٹھیوں میں ہے اور
دوسرا ہفت گردوں کا سنگ گراں توڑ کر
پار اُترا ہے جو اُس کے ہاتھوں میں ہے
پائیداری کی بانہوں میں سمٹا ہوا
ہے یہ بندھن جسے
آندھیاں بھی شکستہ نہیں کر سکیں
برق ہاتھوں میں اپنے چمکتی ہوئی
تیز قینچی لیے حملہ آور ہوئی
تار پھر بھی ہمیشہ سلامت رہا
جانے کیوں اب یہ موج صدا
اس کنارے سے بے چین بہتی ہوئی
اُس کنارے پہنچتی نہیں
التجاؤں کی لہریں کہیں راہ میں
تھک کے معدوم ہو جاتی ہیں
مدتیں ہو گئی ہیں مناجات کی
بھیگی پلکیں جھپکتی نہیں
آسماں کے گراں پتھروں پہ ٹکی
نیم وا چشم تر
آج بھی منتظر ہے، مگر......!

اُجلی روحیں

نصیر احمد ناصر
(اسلام آباد)

میں ان پودوں کو سلام پیش کرتا ہوں
جن سے مجھے
اَن کِھلے پھولوں کی خوشبو آتی ہے
اور ان جسموں کو
جن کی اُجلی روحیں
کہیں بھی، کسی بھی زمانے میں
اپنی جیسی روحوں کو اچانک پہچان لیتی ہیں
اور ان راستوں کو
جن پر محبت کرنے والے
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
بظاہر سایوں کی طرح خاموش
مگر باتیں کرتے ہوئے
ساتھ ساتھ چلتے ہیں
اور ان پرندوں کو
جو آتش دان کی چمنی میں
ہر سال نیا گھونسلا بناتے ہیں
اور ان عمارتوں کو
جو زمین پر پھیلی ہوئی
اور آسمان سے چپکی ہوتی ہیں
اور ان شاعروں کو
جن کی نظمیں پڑھتے ہوئے
اداس ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا!

اذیّت کی انتہا

فیصل عظیم
(کینیڈا)

اُفق کی آنکھ سے ٹپکا لہو اذیّت کا
فشارِ وقت سے لہروں کی تھم گئیں سانسیں
ہوا کے ہاتھ سے چھُوٹی لگام پانی کی
زمیں کی سمت نظر گاڑ دی تلاطم نے
اُٹھایا سر جو کسی ریت کے گھروندے نے
بڑھا کے ہاتھ، لپیٹا غلاف ساحل کا
کنارے موڑ کے کھینچا سِروں سے پانی کو
نمک سمیٹ لیا سارا آبِ وحشت کا
پلٹ کے چادرِ صد موج، تہ کریں لہریں
گرہ میں باندھ کے لب بستہ کر دیے ساحل
اک اضطراب میں کاندھے پہ لاد کر گٹھری
پٹخ دیا اُسے لے جا کے اپنے صحرا میں
سب عقدے کھول دیے دم بخود سمندر کے
دکھایا شور کو ان تھک سکوت کا چہرہ
پلائی تشنہ؟ ساحل کو پیاس کی وسعت
نظر نے گھول دیا سب نمک سرابوں میں
ہوائیں ہو گئیں چپ، دیکھ کر یہ ویرانی
سکوت دیکھ کے مٹّی میں مِل گیا پانی
بنا کے ریت کے ذرّوں کو آئینہ اپنا
کنارے بیٹھا ہے کب سے طویل صحرا کے

○

آ صدائے حسرت

نوید سروش
(میرپورخاص)

کیا بتاؤں کیا دیکھا
ایک پیڑ ننھا سا
ایک پھول کاغذ کا
ایک لڑکی پاگل سی
زندگی کے رستوں پر
کسی کی جستجو میں تھی

آنکھ میں نمی سی تھی
کوئی خواب جاگا سا
کوئی نیند خوابوں سی
اک صدائے حسرت پر
ان لبوں کی جنبش پر
ایک ہنسی سسکتی ہے
درد اک مچلتا ہے
اک اُمید بکھری سی
نیند کی مسافت میں
جب نکل گئی وہ دُور
پھر کوئی وفا کیسی
پھر کوئی دعا کیسی
پھر کوئی صدا کیسی

○

دلیپ کمار

مشیر طالب
(نیویارک)

وہ کہ اک جذبۂ حسین جیسا
ایک گلفام نازنیں جیسا
ایک فنکار دلنشیں جیسا
معجزے جیسا، اک نگیں جیسا

شاہ زادوں کا شاہزادہ وہ!
مہ جبینوں کا خواب زادہ وہ!
حسنِ فن کی بلندیوں کا ناز
بام و در فن پہ ایستادہ وہ!

نکھری شستہ روش پہ مستِ خرام
حسرتِ دید میں چھلکتے جام
حسن کے دل میں وصل کے پیغام
تھرتھراتے لبوں پہ اس کا نام

دل دھڑک اٹھیں ساری محفل کے
اس کے رستے میں قافلے دل کے
چلمنیں اس کو دیکھ کر اٹھ جائیں
پردے اٹھ جائیں چلتے محمل کے

حسنِ فن کے فلک سے اُترا وہ
فن کی ساری بصارتیں لے کر
ایک اوتار اک ولی کی طرح
ایک پیغامِ سوز فن لے کر

پنڈتِ فن بھی محوِ حیرت تھے
رمزکاری کو جو سمجھتے تھے
وہ بھی انگشت بدنداں ہوتے تھے
اُس کی طرزِ ادا پہ واری تھی

اس کے آگے تھے رنگ بے مایا
رنگ اس کا ہی سب نظر بھایا
کلیاں شرما کے پھول بننے لگیں
فخرِ گلشن "گلاب" شرمایا

فطرتِ زیست سے مرصع وہ
مسلکِ فن میں وہ حقیقت کار
اس نے فن کو دیئے نئے اسلوب
بخشا تہذیبِ فن کو اس نے وقار

رمز و ادراک کی اداکاری
اس نے دانشورانہ کی ساری
اس کا سب کچھ مدبرانہ تھا
درد و غم دکھ خوشی کے گُن کاری

اس نے جو بھی ادا کیا کردار
ایکٹنگ کا بنا وہی معیار
لہجہ و گفتگو کے مد و جذر
فن کے ٹھہرے وہی نئے معیار

شاعری جیسا اس کا ہر اسلوب
ایکٹنگ اس کی شعریت جیسی
ہر ادا اس کی نظمیائی غزل
مدھر سروں میں وہ بھیرویں جیسی

اک سحر اک طلسم اس کی ذات
اس کی برجستہ، برمحل ہر بات
اک شعور اک تمدنی مظہر
فکری تخلیق، اس کے احساسات

وہ کہ فنکاریت کا بابِ ادب
ایکٹنگ اس کی ایک فلمی ادب
وہ ادب ساز ایک فلمی ادیب
فلمی اُنساب میں وہ عالی نسب

روپ کا دیوتا کہیں اُس کو!
یا پیمبر بہ سوئے گُن کاری!
اک فقیہی دلیل اُس کی ذات!
بانیِ ہیکل اداکاری!

وہ کہ خانانِ خان، یوسف خانؔ
پردہ سیمی کا وہ دلیپ کمارؔ
بس اکیلا براجماں، طالبؔ
فلمی آکاش پہ وہ ماہِ شرار!

ناصر کے لئے ایک نظم

یوسف عزیز زاہد
(پشاور)

منت سے یا مراد سے دل دار تو ہوا
دے کر فریب شام وہ بیدار تو ہوا
اطراف میں ادب کے یہ دیدار تو ہوا
وحشت میں پھر جنوں کا خریدار تو ہوا

گاہے طبیب دل کا طلب گار تو ہوا
ناصر کسی کے واسطے بیمار تو ہوا

عادت کی اور بات طبیعت بُری نہیں
سوداگر جنوں کی یہ وحشت بُری نہیں
مقصود ہو جو صلح، عداوت بُری نہیں
ناصر سے گر نہ ہو تو شکایت بُری نہیں

مایوس ہونے دیتا نہیں اپنی ذات سے
ناصر ہے نام، ربط ہے شہر ِ ثبات سے

بولے تو شہرحرف کو تسخیر وہ کرے
ذرے کو آفتاب کی تصویر وہ کرے
اِک عالم ِ سکوت میں تقریر وہ کرے
غالب، فراز وفیض کی تفسیر وہ کرے

سازِ علوم پر کوئی نغمہ جو چھیڑ دے
اِک پل میں کائنات کے بخیے اُدھیڑ دے

استادِ محترم ہے، پڑھانے وہ آئے گا
شہر ِ سخن میں دھوم مچانے وہ آئے گا
اطراف میں، ادب کے بہانے، وہ آئے گا
شامیں فریب دیں گی زمانہ وہ آئے گا

تنقید کو کمان، سنانے کو ڈھال دو
پھر زندگی کے کھیل کو اوجِ کمال دو

موضوع بحث کچھ بھی ہو بولے شعور سے
ہر علم کی حدود پھلانگے غرور سے
سُر تال کی ہو بات تو کیجئے حضو سے
ہو آگ کی طلب تو یہ لے آئے طور سے

دارالعلومِ عشق کا جیّد کہیں اِسے
ناصؔر ہمیں عزیز ہے، سیّدکہیں اِسے

ذیشانِ ذی وقار کا کردار دیکھنا
افراز کے سکون کی رفتار دیکھنا
پھر ابتسام حسن کے اخبار دیکھنا
ناصر علی کو پیار میں سرشار دیکھنا

جنت یہ پیار کی جو سجائی حبیب نے
رفعت بھی شہرعشق میں پائی نصیب نے

حسرت موہانی کی شاعری

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

حسرت موہانی کی شاعری کے بارے میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصری ہونے کے ساتھ یہ شاعری کلاسیکی شاعری ہے۔ اردو کی کلاسیکی روایات کے ساتھ اس کا رشتہ گہرا اور غیر منقطع ہے۔ ان کا سلسلۂ سخن منشی امیر اللہ تسلیم سے ہوتا ہوا شاہ ظہورالدین حاتم تک پہنچتا ہے۔ حاتم کو شمالی ہند میں اردو شاعری کے بنیاد گزاروں میں اولیت حاصل ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار کو بیشتر تذکرہ نگاروں نے بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

حاتم جہاں کو جانکے فانی، خدا کو چاہ
اللہ بس ہے اور یہ باقی ہے بس ہوس

دامن تلک بھی اس کے نہ پہنچا مرا غبار
کہتے ہیں سچ، زمین کہاں آسماں کہاں

''باقی ہے بس ہوس'' والے شعر کی زبان پر تو قیامت کی چھاپ ہے لیکن ''زمین کہاں آسماں کہاں'' والا شعر تو آج کا شعر لگتا ہے۔ زبان کے لحاظ سے بھی اور شعری برتاؤ (Treatment) کے انداز سے بھی اور آپ نے یہ بھی محسوس کر لیا ہوگا کہ حسرت کے اسلوب و آہنگ شعری کا رنگ ڈھنگ اور بو باس حاتم کے ان اشعار سے لگّا کھاتا ہے۔

حسرت موہانی جس طرح تصوف میں صاحب سلسلہ تھے اسی طرح شاعری میں بھی صاحبِ سلسلہ تھے۔ ان کے اس سلسلے میں مرزا محمد رفیع سودا، شاہ نصیر، خواجہ میر درد، حکیم مومن خاں مومن جیسے اردو زبان کے زندہ جاوید شاعر شامل ہیں۔ میں اہل نقد و نظر کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ حسرت اکتسابی شاعر تھے یا ان کا اپنا کوئی منفرد رنگِ سخن نہیں تھا۔ آپ حسرت کو پڑھیں اور ان کے ساتھ ان کے ہم عصر غزل گو شعراء یگانہ (یاس) فانی، جگر اور اصغر گونڈوی وغیرہ کو پڑھیں تو حسرت کے رنگِ سخن کی انفرادیت آپ کی سمجھ میں آنے لگے گی۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے حسرت کے اسلوب اور آہنگ کا تانا بانا ان کی زبان کی انفرادیت ہے۔ ان کی زبان اور لہجہ ہم عصر شعراء سے مختلف اور منفرد ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب حسرت کی زبان سے سنئیے:

یہ زبانِ لکھنو میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

زبان و بیان کے اعتبار سے دہلی اور لکھنو کے دو باہم مختلف مکتبہ ہائے خیال وجود میں آئے تھے۔ حسرت خود بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی زبان اساسی طور پر لکھنو کی تھی لیکن اس میں ''رنگِ دہلی'' بھی آمیز تھا۔ حسرت بھی اپنی انفرادیت سے آگاہ تھے۔ اس انفرادیت کو انہوں نے دہلی اور لکھنو کی آمیزش سے تعبیر کیا۔ حسرت کے اس شعر کو ملاحظہ فرمائیں:

پسند آیا طریقِ شاعری تیرا ہمیں حسرت
کہ جب کہنا تو کچھ کچھ نغز کہنا، بے بدل کہنا

آپ نے دیکھا حسرت اپنے طریق شاعری کو خود ہی ''بے بدل'' یعنی دوسرے لفظوں میں ''منفرد'' قرار دے رہے ہیں۔

حسرت موہانی کی انفرادیت کا تجزیہ کرتے سے ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کی ۶۷۷ غزلوں میں سے ۳۷۳ غزلیں قید یا نظر بندی کے دوران کہی اور لکھی گئی تھیں (بقول نیاز فتح پوری) سیاسی قیدیوں کے بارے میں عام خیال یہ رہا ہے کہ انہیں برائے نام قید ہوتی ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ حسرت موہانی کو سیاسی قیدی کے طور پر جس طرح کی قید سے واسطہ پڑا تھا اس کو انہوں نے جیل کے اندر جیل کا نام دیا ہے۔ اس میں ان کو کاغذ، پنسل سے محروم رکھا جاتا تھا۔ وہ اپنی غزلیں کسی ساتھی قیدی کو لکھواتے تھے۔ حسرت نے نام لے کر اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے میر ظفر حسین فوق بجنوری کے زور دینے پر جیل کی مشکلات کے باوجود حروف تہجی کی ترتیب سے مردّف غزلیں کہیں (آخری دو دیوانوں کو چھوڑ کر حسرت کے ۱۱ دیوان باقاعدہ حروف تہجی کی ترتیب سے ہیں۔ ان کے کل ۱۳ دیوان ہیں۔ ۱۸۹۸ء سے قبل کا سارا کلام خارج کر دیا گیا تھا۔ دیوان اوّل میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۸ء تک کی غزلیات ہیں)

اب ہم حسرت موہانی کے ایک مشہور و معروف شعر کی جانب آ رہے ہیں:

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اک ''طرفہ تماشہ ہے'' حسرت کی طبیعت بھی

پہلے ''چکّی کی مشقت'' پہ بات کر لیتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں قید سخت کے تحت قیدیوں سے جبری مشقت انتہائی سخت لی جاتی تھی۔ چکّی کی مشقت سے یہ مراد ہوتی تھی کہ قیدی روزانہ ایک من اناج پیسے۔ حسرت نے مثال کے طور پر اپنی پہلی قیدِ فرنگ میں ایک سال چکّی پیسی اور اسی دوران دیوانِ اوّل مرتب ہوا۔ یہ سوچنا کتنا غلط ہوگا کہ حسرت کی شاعری کی انفرادیت پر قیدِ فرنگ کا اثر نہ ہوگا۔ اس معاملے میں وہ اپنے ہم عصر شعراء سے منفرد تھے۔ ''طرفہ'' کا لفظ بھی ''بے بدل'' کے ضمرے میں آتا ہے اور حسرت کی انفرادیت کی نشان دہی کرتا ہے۔

ایک جانب قیدِ سختِ فرنگ کے پورے ماحول کو ذہن میں اجاگر کیجیے اور دوسری جانب حسرت کے دیوانِ اوّل کی اس مشہور اور زبانِ زدِ خواص و عوام غزل کی فضا کو ذہن میں تشکیل دیجیے جس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

حسنِ بے پروا کو خودبین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

ہواؤں کی لہروں پر جیسے برسوں پرانی خوشبو اور نغمگی تیر رہی تھی۔ فضاؤں کے کینوس پر جیسے کسی موقلم کے گونا گوں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف حسین پھول سحرانگیزیاں لیے جھوم رہے تھے اور تالاب میں پانی کے سینے پر دمکتے، مسکراتے پھول۔

میرے قدم اُس سرزمین پر پڑے اور آنکھیں حیران ہوگئیں۔ وہ پرسکون قصبہ جورنی (Giverny) جسے ایک عظیم فنکار کی آنکھوں نے چنا تھا اور اپنالیا تھا وہ تھا کلاوڈ مونے۔

ندی Seine کے کنارے صوبہ نورمنڈی کے قریب یہ بستی مشہور مصور کلاوڈ آسکر مونے (Claude Oscar Monet) کی بستی کہی جاتی ہے جو پیرس سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ خوبصورت جگہ پہاڑوں کے درمیان ہے جو مونے کے باغ اور رہائش گاہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ بہت پہلے اس کا نام Warnacum تھا۔ ان دنوں وہاں انگور کی کاشت کاری ہوا کرتی تھی۔ زیادہ کاشت کار اور کچھ متوسط طبقے کے لوگ رہا کرتے تھے۔

مونے جو بہترین Impressionist مصور تھا ۱۴۔نومبر ۱۸۴۰ء پیرس میں پیدا ہوا اور ۵۔دسمبر ۱۹۲۶ء کو یہ دنیا چھوڑ گیا۔ یہ جورنی اپنے پسندیدہ قصبے میں دفن ہے۔ جذباتی ہونے کے ناتے کسی ناخوشگوار حالات کے تحت ۱۸۶۸ء میں اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔ اسے Master of Impressionist کہا جاتا ہے۔ اپریل ۱۸۷۴ء میں سب سے پہلی Impressionist نمائش پیرس میں ہوئی تھی۔ اس نمائش میں وہ مصور تھے جنہیں ججوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اس میں تیس فنکاروں نے حصہ لیا تھا جن میں Edgar Degas ,Birthe Morisot, Pissaro,Renion اور Alfred Sisley وغیرہ بھی شامل تھے۔ مونے کی تخلیق Impression Sunrise اس نمائش میں شامل تھی۔

۱۹۲۳ء میں اس کی بینائی تقریباً ختم ہوگئی تھی لیکن سرجری کے بعد بہتر ہوگئی تھی۔ مونے نے ایک دن ٹرین میں سفر کرتے ہوئے کھڑکی سے اس خوبصورت قصبے کو دیکھا اور دل فریفتہ ہوگیا۔ یہ ۱۸۸۳ء کی بات ہے۔ اس وقت جورنی کی آبادی ۳۰۰ تھی۔ مونے کو یہ جگہ اس قدر پسند آگئی کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا اور یہیں سے اس دنیا سے کوچ کیا۔ مونے نے یہاں اپنا گھر بنایا اور بے حد حسین باغ خود اپنی پسند کا بنوایا جو ساری دنیا میں مشہور ہے۔ کیونکہ اسے کھلی ہوا میں قدرت کے نظارے کینوس پر اتارنا پسند تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی کشتی کو بھی اپنا ایک اسٹوڈیو بنالیا تھا۔ پانی کی لہروں پر رواں رنگوں سے مکالمہ کرتا تھا۔ مونے کی زندگی دوسرے مصوروں کے برعکس تھی کیونکہ اس نے ایک بے حد دولت مند عورت سے شادی کی تھی اور ہمیشہ خوش حال رہا۔ جورنی جیسی حسین بستی صرف مونے کے لق ودق مکان، اس کے وسیع اسٹوڈیو اور اس کے عجوبہ باغ کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں سال میں پانچ سو ہزار سیاح آتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں جب مونے کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے مائیکل کو یہ گھر مل گیا۔ ۱۹۶۶ء میں اسے مائیکل نے آرٹ اکیڈمی بنا دیا۔ مونے کے خاص باغبان نے دوبارہ اس باغ کو پھر بنایا اور اپنی اصلی صورت میں لایا کیونکہ دوران جنگ یہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ تالاب دوبارہ زمین کی تہوں سے باہر نکالا گیا اور وہی پھول اُگائے گئے جو مونے کی موجودگی میں تھے۔ اس کے لیے امریکہ نے بھی خاص مدد کی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں یہ مکان اور باغ ٹورسٹ کے لیے کھولا گیا۔ فرانس کا سب سے پرانا آرٹ کارگاہ (Work Shop) جورنی میں ہے۔ یہاں مصوری کی تعلیم کے لیے ۵۰۰ طالب علم ہر سال آتے ہیں۔ براہِ راست قدرتی رنگوں سے مصوری کو جلا بخشتے ہیں۔ قدرت سے مکالمہ کر کے تخلیقی تصورات کو راستہ دکھاتے ہیں۔ مشہور مصور جیسے پسارو (Pissarro) میری کساٹ (Mary Cassat) وغیرہ بھی یہاں بیٹھ کر مصوری کرتے تھے۔ اپریل سے اکتوبر تک یہاں پھولوں کے گونا گوں رنگ شباب پر ہوتے ہیں۔ سردیوں میں جورنی بند ہو جاتا ہے سیاحی کے لیے۔

وہ دن بہت حسین تھا۔ تقریباً گیارہ بجے صبح ہم لوگ جورنی پہنچے پیرس سے ڈرائیو کرتے ہوئے اور راستے میں قدرتی مناظر سے سرشار ہوتے ہوئے۔ خوش گوار موسم کی نرم دھوپ باغ کے پھولوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ پھولوں اور پتوں کی لتوں کی رنگین چادر اوڑھے مونے کا لق ودق مکان جو لمبا زیادہ ہے اور چوڑائی میں کم، اب بھی بہترین حالت میں موجود ہے۔ گلابی رنگ کا یہ مکان جس کے دریچے سبز ہیں اُس وقت سیّاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ مکان کی دیواریں ہی جیسے پھولوں کی ہوں ایسا لگتا تھا۔ باغ کے دو حصے ہیں۔ پھولوں کا حصہ جو مکان کے سامنے ہے اور جاپانی واٹر گارڈن (Water Garden) جو دوسری طرف ہے جس میں جاپانی پُل ہے اور ہر طرف Weeping Willows۔۔۔ پانی کی طرف سرنگوں ہیں۔ ان کے اور مختلف پھولوں کے پیکر عکس افگن ہیں۔ مونے کے لیے یہ باغ الہام پذیر تھا۔ پانی میں سبز رنگ کے پُل اور پھولوں کا عکس دیکھ کر یہ محسوس ہوا جیسے وہاں ایک الگ دنیا تحلیل ہو کر رواں ہے۔ اس باغ میں ۶ عدد چھوٹے بڑے پُل ہیں۔ کنول کے تالاب (Water Lilly) پر جاپانی برج ہے۔ دن کی بدلتی روشنی کے ساتھ پانی پر پھولوں اور پتوں کے عکس بدلتے رہتے ہیں۔ سورج اور پانی کا خوبصورت تماشہ کسی اور دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ مونے پَو پھٹنے سے قبل اٹھ جاتا تھا اور سورج نکلنے پر پانی اور سورج کی ایک دوسرے سے چھیڑ خانی دیکھنا بہت پسند کرتا تھا۔ یہ باغ کسی مصور کا

Palette ہے جہاں زندہ رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کو قدرتی حسن سکون بخشتے ہیں۔

جورنی ایک قصبہ نہیں بلکہ پھولوں کا عجائب خانہ ہے۔ پھولوں کے باغ میں درمیان میں ایک تنگ سا راستہ ہے جو مونے کی قیام گاہ کی طرف جاتا ہے۔ جس کے دونوں طرف حسین پھولوں کا سیلاب ہے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر سب کچھ کاغذ پر اسکیچ کرلیا۔ مونے کا مکان، کنول کا تالاب (Lilly pond) جاپانی پُل۔ اس دل کی عجیب ہی کیفیت تھی کہ اتنے اہم اور تاریخی مقام پر میں بھی مصوری کررہی ہوں جہاں عظیم فنکاروں نے بھی اپنا کینوس سجایا تھا۔

مونے کے گھر میں داخل ہوئی تو یہ بھی ٹورسٹ سے بھرپور تھا۔ گھر کے اندر تصویر لینے کی اجازت نہ تھی۔ کچن بے حد کشادہ اور خواب گاہ میں بستر بہت چھوٹا۔ مونے اور المیس (بیوی) کی خواب گاہ الگ الگ۔۔۔ کیونکہ وہ بیوی کی نیند خراب کیسے بغیر پَو پھٹنے سے پہلے اُٹھ کر کُہاسے کے ساتھ مصوری کرتا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں تین کھڑکیاں ہیں جن سے باغ کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ کھانے کا کمرہ بے حد کشادہ جس کا رنگ ابھی تک برقرار رکھا گیا ہے پیلا اور نیلا جو اُس وقت تھا۔ ہر طرف دیواروں پر جاپانی نقش ونگار آویزاں ہیں۔ مونے گھر کے اندر اپنی تخلیقات نہیں بلکہ دوسرے فنکاروں کی پسندیدہ تخلیقات سجایا کرتا تھا۔ اسٹوڈیو بہت وسیع و عریض ہے اور بے حد روشن کیونکہ اس کی چھت بیشتر شیشے کی ہے۔ سب دیواریں مونے کی شاہکار مصوری تھامے کھڑی ہیں۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی وہاں۔ ایسا لگا جیسے وقت Rewind ہوگیا ہو۔ جیسے مونے وہیں کہیں آس پاس موجود ہو۔

Water Garden مونے کی شاہکار تخلیق ہے۔ ایک الگ کائنات یہاں نظر آتی ہے۔ رنگوں، لہروں اور کرنوں کی۔ پانی کے چاروں طرف پھول، پتوں اور درختوں کی پرچھائیاں اور بیچ میں چھوٹا سا آسمان Weeping Willow جھک کر پانی کے بدن کو چومتا ہوا تالاب کے رخسار پر تیرتے ہوئے کنول کے حسین رنگ۔۔۔ اور پھر کرنوں اور رنگوں کا امتزاج ایسا نشہ طاری کرتا ہے کہ دل وہیں کھو جاتا ہے۔

یہ بستی جورنی (Giverny) گرمیوں میں پھولوں کی بستی بن جاتی ہے۔ فنکارانہ زندگی کا مرکز۔ رنگوں کی موسیقی ہر طرف گونجتی ہے۔ میں۔۔۔ جورنی سے کتنی مالا مال ہوکر واپس آئی ہوں۔ وہاں کی برسوں پرانی یادیں، باغ کے سرخ، پیلے، سفید اور نیلے پھولوں کے یعقوت، زمرد، ہیرے جواہرات سب کچھ اپنے کینوس کے آنچل میں بھر کر چرا لائی ہوں۔

- بقیہ -

کوئی پرانی کہانی

نہیں دے گا۔ اس نے کچھ پیسے بچا کر رکھے تھے جو دو تین ماہ کے کرائے اور کھانے پینے کے اخراجات کے لیے کافی تھے۔ اس نے اپنی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ دیا اور اپنے کمرے تک محدود ہوکر رہ گئی۔ کبھی کبھی غصّے میں احساسِ جرم کے تحت یا خود کو آلودہ سمجھ کر اپنے پیٹ پر مکّے برسانے شروع کردیئے۔ کمرے میں پڑے پڑے جب وہ بیزار ہو جاتی تو دیوار سے اپنے آپ کو سامنے سے ٹکرا دیتی تا کہ پیٹ پر چوٹ پڑے۔ ایک دن، ایک صبح کو وہ اپنے آپ کو زدوکوب کرتی رہی حتی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ لہولہان ہوکر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔ اس کے برابر کے کمرے کے رہائشی نے اسے جنرل ہسپتال کے ہنگامی طبّی امداد کے مرکز میں پہنچایا۔ انہوں نے اسے فوری طور پر داخل کرلیا۔ چند گھنٹوں کی کوشش کے بعد اسے اس کے کمرے میں پہنچاتے ہوئے نرسوں نے بتایا کہ اس کا بچہ ضائع ہوگیا ہے۔ اس کے لیے یہ اطلاع خوشخبری تھی۔

اتوار اس کے آرام کا دن تھا۔ اس کی کزن اس سے ملنے کے لیے آئی۔ دونوں گلے مل کر بہت روئے۔ اس کی کزن نے بتایا کہ اس نے شادی کرلی ہے اور اب وہ اپنے اور اس کے آبائی شہر میں جارہی ہے۔ جب دونوں نے ایک دوسرے کو الوداع کیا تو اس نے اپنی کزن سے ایک آخری احسان مانگا:

''اگر میرے گھر والے تم سے میرے بارے میں کچھ پوچھیں تو کہہ دینا کہ تمہاری مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ دارالحکومت مجھے نگل گیا ہے۔ کوئی پرانی کہانی مجھ سے منسوب کردینا۔''

ایک صدی کا قصّہ

ثریا

دیپک کنول (ممبئی)

رانا پرتاپ کی فلم ''جیت'' کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اسمیں ایک شادی کا سین تھا جو کہ فلمایا جانا تھا۔اس فلم کے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے۔وہ شادی کرنا چاہتے تھے مگر ہیروئن کے گھر والے اس رشتے کے سخت خلاف تھے کیونکہ ان کے مذاہب آڑے آرہے تھے۔ یہ پچاس کی دہائی کی بات ہے۔اُن دنوں اس طرح کی چیزوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔اُن کی دیوانگی کو دیکھ کر اُن کے چند دوستوں نے مل کر ایک منصوبہ بنالیا کہ فلم میں جو شادی کا سین ہے اُسے حقیقی بنایا جائے۔اس کے لئے اُنہوں نے ایک پنڈت کا انتظام کیا جو ہندو رسم و رواج سے ان دونوں کا لگن کرا دے گا۔اس منصوبے میں یونٹ کے لوگوں کے علاوہ اُس زمانے کی مشہور اداکارہ درگا کھوٹے اور کیمرہ مین دوارکا دیو یچہ بھی شامل تھا۔ ہیروئن کی نانی جو کہ سایے کی طرح ہیروئن کے ساتھ لگی رہتی تھی اور جو سب سے زیادہ مخالف تھی، اُس دن بھی سیٹ پر موجود تھی۔وہ اس سین کو فلمی سین سمجھ رہی تھی اس لئے وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔اس یونٹ میں ایک ایسا اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا جو کہ اس ہیروئن سے یکطرفہ پیار کرتا تھا۔ وہ اس پریم کہانی سے واقف تھا اور دل ہی دل میں ہیرو سے نفرت کرتا تھا۔اس سے پہلے کہ بیل منڈھے چڑھ جائے اسی ٹیکنیشن نے جا کر نانی کو خبردار کر دیا۔بس پھر کیا تھا، سیٹ پر ہنگامہ مچ گیا۔نانی نے پوری شوٹنگ رکوادی اور وہ اپنی ناتی کو سیٹ سے کھینچ کر لے گئی۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

اس ہیروئن کا نام ثریا جمال شیخ تھا۔ثریا کا جنم 15 جون 1929 کو لاہور میں عزیز جمال شیخ اور ممتاز شیخ کے گھر میں ہوا۔وہ ایک سال کی تھی جب وہ لاہور سے بمبئی منتقل ہو گئے۔اُنہوں نے بمبئی کے پوش علاقے میرین ڈرائیو کے کرشنا محل میں ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا۔تھوڑے دنوں کے بعد ثریا کا ماموں ایم ظہور بھی اُن کے ساتھ ٹھہرنے لگا۔ بعد ازاں وہ بہت بڑا ویلین بن گیا۔ثریا کو فورٹ کے نیو ہائی اسکول میں داخل کیا گیا۔ یہ اسکول آج جے بی پیٹیٹ گرلز ہائی اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ثریا آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے بچوں کے پروگرام میں حصہ لینے لگی جہاں اُسکی دوستی اداکار راج کپور اور موسیقار مدن موہن سے ہوئی۔

ثریا کو نرگس کی ماں جدن بائی کی فلم ''میڈم فیشن'' میں بطور بال کلاکار کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ فلم 1936 میں ریلیز ہوئی۔اس میں وہ بے بی ثریا کے نام سے پیش ہوئی۔اسکے بعد اُسنے بطور بال کلاکار 1942 کی فلم ''تمنا'' میں کام کیا جسمیں اداکاری کے ساتھ اُسنے گانے بھی گائے۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم آئی جس کا نام ''سٹیشن ماسٹر'' تھا۔بمبئی ٹاکیز کی روح رواں دیوکا رانی نے اس اُبھرتی ہوئی اداکارہ کی صلاحیتوں کو پہچانا اور اُسنے پانچ سال کے لئے پانچ سو روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر اُسے معاہدہ بند کر لیا۔اُسے فلم ''ہماری بات'' میں اداکاری کے ساتھ گانے بھی گائے جن میں سے ایک گانا اُسنے گوندا کے باپ ارون کمار کے ساتھ گایا جس کے بول تھے، بستر بچھا دیا ہے تیرے گھر کے سامنے۔ یہ گانا بیحد مقبول ہوا۔

1942 میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ڈائرکٹر تھے ذوالفقار علی بخاری۔اُس نے ایک دن نوشاد کو ثریا کا ایک گانا سنایا۔جب نوشاد نے ثریا کا گانا سنا تو وہ اسقدر متاثر ہوا کہ اُسنے اُسے اے آر کاردار کی فلم ''شاردا'' میں گوانے کا فیصلہ کیا۔''شاردا'' کی ہیروئن مہتاب تھی۔وہ اُس وقت کی کامیاب ترین ہیروئن تھی۔اُسے جب بتایا گیا کہ اُس کے لئے ایک گانا ثریا نام کی ایک گلوکارہ کی آواز میں ریکارڈ کیا جا رہا ہے تو جب مہتاب نے اس تیرہ سال کی دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا تو وہ اُسے اپنے پلے بیک کے طور پر استعمال کرنے سے ہچکچائی۔جب نوشاد کے کہنے پر اُس نے اُسکا گانا سنا تو وہ مسحور ہو کے رہ گئی۔اسی سال نوشاد کی موسیقی میں فلم ''نئی دنیا'' کے لئے بھی ایک گانا ریکارڈ کیا جس کے بول تھے۔بوٹ کروں میں پالش بابو۔

اُسے اپنے ماموں کی مدد سے ایک اہم رول ادا کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہوا یوں کہ جس دن اسکول میں چھٹی تھی وہ اپنے ماموں کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے موہن اسٹوڈیو پہنچ گئی۔وہاں پر نانو بھائی وکیل فلم ''تاج محل'' کی شوٹنگ کر رہا تھا۔نانو بھائی کی نظر جب ثریا پر پڑی تو اُس کی معصومیت اور دلکشی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔اُس نے اُسی وقت اُسے ممتاز محل کے رول کے لئے منتخب کر لیا۔کے آصف فلم ''پھول'' بنا رہا تھا۔اُسنے ثریا کو فلم میں کام کرنے کے لئے چالیس ہزار روپے کی پیش کش کی۔ یہ بہت بڑی رقم تھی جسے وہ ٹھکرانا نہیں چاہتی تھی مگر اُس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ معاہدے میں بندھی ہوئی تھی۔اُسنے دیوکا رانی کے پاس جا کر اُس سے درخواست کی کہ وہ اُسے معاہدے سے آزاد کر دے۔دیوکا رانی بھی بڑے دل کی عورت تھی۔اُس نے اُسے آزاد کر دیا اور اُس نے فلم ''پھول'' میں پرتھوی راج کپور کی بہن کا رول ادا کیا۔چودہ سال کی عمر میں وہ فلم ''اشارہ'' میں پرتھوی راج کپور کے مدمقابل ہیروئن کا رول ادا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

کے ایل سہگل جو کہ اپنے عروج پر تھا۔اُس نے ایک گانے کی ریہرسل میں ثریا کو سنا۔اُسے ثریا کی آواز اتنی بھا گئی کہ اُس نے ''تدبیر'' کے ڈائرکٹر جینت ڈیسائی سے سفارش کی کہ وہ ثریا کو اس فلم میں بطور ہیرئن لے لیں۔ اس فلم کا ہیرو کے ایل سہگل تھا۔اُسنے کے ایل سہگل کے ساتھ دو فلمیں اور کیں جن کا نام ''عمر خیام'' اور ''پروانہ'' تھا۔ان فلموں میں اُسکے کئی گانے ہٹ ہوئے۔

ثریا کا عروج محبوب خان کی فلم ''انمول گھڑی'' سے شروع ہوا۔اس فلم میں سریندر کے ساتھ نور جہاں تھی۔سنگیت کار نوشاد تھا۔اس فلم کے گانوں نے

دھوم مچا دی۔ یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوئی ۔ اسکے بعد آئی فلم ''درد'' جس میں
ہیروئن منور سلطانہ تھی اور ہیرو تھا نصرت ۔ وہ معاون رول میں تھی ۔ یہ فلم 1947
میں ریلیز ہوئی۔اسکے بعد آئی فلم ''پیار کی جیت'' جس کا ہیرو رحمان تھا اور ہیروئن
ثریا تھی۔اسکا سنگیت کار حسن لال بھگت رام تھا۔اس فلم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ
ثریا کے گھر کے باہر لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ اُنہیں ہٹانے کے لئے پولیس
طلب کرنی پڑی۔اس کے بعد آئی فلم ''بڑی بہن''۔فلم ''بڑی بہن'' کا ہیرو رحمان
تھا جب کہ اُسکے مقابل دو ہیروئنیں تھیں۔ثریا اور گیتا بالی۔اس فلم کو مدہوش کرنے
والے سنگیت سے حسن لال بھگت رام نے آراستہ کیا تھا ۔ ثریا کی مقبولیت اس
حد تک بڑھ چکی تھی کہ جب وہ اس فلم کے پریمیر پر چلی گئی تو اُسکے چاہنے والے
اُسے دیکھ کر پاگل ہو گئے ۔اُنہوں نے اُس کے ساتھ بڑی غیر مہذبانہ حرکتیں
کیں۔ثریا کو اس بے قابو بھیڑ سے چھڑانے کے لئے پولیس کو لاٹھی چارج کرنا
پڑا۔ اس کے بعد ثریا نے کسی بھی پریمیر میں شامل ہونے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
توبہ کر لی۔

دیوآنند ایک خوبرو اداکار تھا جس کی کئی فلمیں ریلیز تو ہو گئی تھیں البتہ
اُسے زیادہ مقبولیت نہیں ملی تھی۔اسی بیچ جب اُسے ثریا کے ساتھ فلم ''ودیا'' میں کام
کرنے کا چانس ملا تو اُسے یقین ہی نہیں آیا۔ثریا اُسوقت ٹاپ کی ہیروئن تھی۔کہا
جاتا ہے کہ وہ سب سے مہنگی ہیروئن تھی۔جب کہ دیو ایک نوخیز ایکٹر تھا جس نے
اب تک اپنی کوئی پہچان نہ بنائی تھی۔ایسے حالات میں اتنی بڑی ہیروئن کے ساتھ
کام کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔دیوآنند یہ خبر سن کر خوشی سے اُچھل پڑا۔ساتھ ہی
دل گھبرا بھی رہا تھا کہ پتا نہیں ثریا کا برتاؤ اُسکے تیئں کیسا ہو گا۔شروع شروع میں دیو
آنند ثریا سے دبا دبا سا رہتا تھا، دھیرے دھیرے وہ ثریا کے قریب آنے کی کوشش
کرنے لگا۔وہ جب بھی اُسکے قریب ہوتا تھا تو وہ اُسکی تعریفوں کے پل باندھنے
لگتا تھا۔کبھی اُسکی اداکاری تو کبھی اُسکی گلوکاری کو لیکر وہ آسمان زمین کے قلابے
ملانے لگتا تھا۔اسمیں شک نہیں کہ ثریا بہترین اداکارہ کے ساتھ ساتھ گلوکارہ بھی
تھی۔نور جہاں کے پاکستان منتقل ہونے سے ثریا کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو گیا
تھا۔فلمی دنیا کے بہترین موسیقار ثریا کے ساتھ کام کرنے کے لئے بے تاب رہتے
تھے۔ثریا جب دیو کے منہ سے اپنی تعریفیں سنتی تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی
تھی۔اب وہ بھی دیو کی تعریفیں کرنے لگی تھی۔ایک دن کی بات ہے کہ وہ فلم ''ودیا''
کی شوٹنگ ایک جھیل کے پاس کر رہے تھے۔ایک گانا بوٹ میں فلمانا تھا۔ یہ ایک
لانگ شاٹ تھا۔فلم کا عملہ اُن سے دور دوسرے بوٹ میں سوار تھا۔وہ دونوں ایک
بوٹ میں سوار تھے تو بوٹ اچانک جھیل کے بیچوں بیچ اُلٹ گئی اور وہ دونوں پانی
میں گر گئے۔دیو کو تیرنا آتا تھا اسلئے وہ بوٹ سیدھا کر کے اُس پر پھر سے سوار
ہوا جب کہ ثریا بڑی بدحواسی کے عالم میں ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی کیونکہ ثریا
کو تیرنا نہیں آتا تھا۔وہ جب پانی میں ڈوبنے لگی تب جا کے دیو کو احساس ہوا کہ وہ
ڈوب رہی ہے۔ وہ اُسے بچانے کے لئے پانی میں کودا اور اپنی جان کی پرواہ نہ
کر کے اُسنے ثریا کو بچا لیا۔

ثریا نے دیو سے کہا۔''اگر تم مجھے نہ بچاتے تو میں مر گئی ہوتی'' تو دیو
کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔''اُس سے پہلے تو میں مر گیا ہوتا'' اس ایک جملے
نے ثریا کی زندگی بدل کے رکھ دی ۔وہ اس دبلے پتلے، تیکھے نین نقوش والے
شرمیلے نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ثریا جیسے دیو کی زندگی میں خوشیوں کی
سوغات لے کر آ گئی۔

ثریا جو کہ گیگری پیک کی زبردست مداح تھی۔دیو میں گیگری پیک
جیسی ادائیں اور نزاکتیں تھیں۔وہ اس وجہ سے بھی اُس پر فدا ہو گئی تھی۔نانی بادشاہ
بیگم ہر دم ثریا کے ساتھ رہتی تھی۔اُس کا پریوار پر ایسا دبدبہ تھا کہ اُسکی رضا کے بنا
پتہ بھی نہیں ہلتا تھا۔وہ بڑی سخت گیر اور بدزبان عورت تھی۔ثریا اور دیوآنند ایک
دوسرے سے جنون کی حد تک پیار کرتے تھے مگر بادشاہ بیگم کی دہشت کی وجہ سے
وہ کھل کر مل نہیں سکتے تھے۔اُن کے محبت نامے ایک دوسرے تک پہنچانے کا کام
اداکارہ کامنی کوشل، درگا کھوٹے اور کیمرہ مین دوارکا دویچہ کیا کرتے تھے۔کامنی
کوشل ''ضدی'' میں اُسکی ہیروئن تھی ۔''ودیا'' 1948 میں ریلیز ہو گئی ۔فلمی
شائقین نے دیو اور ثریا کی جوڑی کو پسند کیا اسلئے کئی اور فلم سازوں نے اس جوڑی
کو اپنی فلموں کے لئے سائن کیا۔ان میں ایک رانا پرتاپ تھا جو فلم ''جیت'' بنانے
جا رہا تھا۔اُس نے ان دونوں کو اس فلم کے لئے سائن کیا۔فلم کی شوٹنگ شد و مد
سے جاری تھی ۔دیو اور ثریا کے قریبی لوگ ان کے معاشقے سے واقف تھے اور
انہیں ایک دوسرے سے ملانے کے لئے کوششیں بھی کر رہے تھے۔

بادشاہ بیگم نے ثریا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بہت بڑی اداکارہ
ہے۔اُسکے لاکھوں کروڑوں چاہنے والے ہیں۔دیوآنند ہندو ہے۔اگر اُس نے
دیو کے ساتھ شادی کی تو جب یہ خبر پھیل جائے گی تو ملک میں ہندو مسلم فسادات
پھوٹ پڑیں گے۔دیوآنند کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ثریا ڈر گئی۔

دیوآنند اس واقعے سے اس قدر بے چین ہو گیا کہ وہ اپنی بے
قراری کو چھپا نہیں سکا۔اُسے اب بھی یقین تھا کہ وہ ثریا کو شادی کے لئے منائے
گا۔وہ جب ثریا سے ملنے اُس کے گھر گیا تو اُسکے ماموں ظہور نے اُس دیکھا۔
اُس نے اُسے کالر سے پکڑا اور دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ایک طرف ثریا
کے گھر والے اُسے دیوآنند سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف فلم
ساز اُنہیں اپنی فلموں کے لئے سائن کرتے جا رہے تھے۔ایک طرف دیوآنند نے
اپنے دیرینہ خواب کو عملی جامہ پہنایا تھا۔اُسنے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر اپنی
فلم کمپنی ''نوکیتن فلمز'' کی بنیاد رکھی تھی۔''ثریا اور دیو ایک کے بعد ایک فلم سائن
کرتے جا رہے تھے۔1949 میں ان دونوں کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔پہلی فلم''
جیت'' تھی اور دوسری فلم ''شاعر'' تھی۔ان دو فلموں کے ساتھ وہ ایک دوسرے
کے اور قریب آتے گئے۔دیو اور ثریا اس حد تک ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے
کہ وہ سیٹ پر ہوں یا سیٹ سے باہر ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے
رہتے تھے۔دیو نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ تھا کہ جب وہ اور ثریا اکیلے بیٹھے
ہوتے تھے تو ثریا اُسکے لئے اپنے گانے گنگنایا کرتی تھی اور وہ ان گانوں کے سوز و

گداز میں کہیں کھو جاتا تھا اسی بیچ نوکیتن نے اپنی پہلی فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔اس فلم کا نام تھا ''افسر''۔اس فلم کے مکھیہ اداکار دیو اور ثریا تھے جب کہ اسکے ہدایت کار چیتن آنند تھا۔اُن کے پیار کو اس فلم سے اور جلا ملی۔اس فلم کی فلمبندی کے دوران دیو آنند نے تین ہزار روپے میں ایک شادی کی انگوٹھی خریدی جو اُسنے ثریا کو پیش کی ۔ثریا نے یہ انگوٹھی بخوشی قبول کی۔ایک دن جب اُس نے یہ انگوٹھی پہنی تو بادشاہ بیگم کی نظر انگوٹھی پر پڑی۔اُس نے ثریا سے پوچھا کہ یہ انگوٹھی اُسے کس نے دی ہے تو وہ جھوٹ نہ بول سکی۔اُس نے دیو کا نام لیا۔بادشاہ بیگم نے غصے سے وہ انگوٹھی اُس کی انگلی سے اُتار دی اور اُسے سمندر میں پھینک دیا۔کہتے ہیں نا عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔وہ پیار کے معاملے میں جتنی بھی رازداری برتتے جارہے تھے اتنے ہی اُنکے عشق کے چرچے پھیلتے چلے گئے۔اُنکے رومانس کی خبریں فلمی پرچوں کی شہہ سرخیاں بننے لگیں۔جو لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ثریا دیو آنند سے شادی کرے اُن میں سنگیت کار نوشاد، گیت کار نخشب، ہدایت کار اے آر کاردار اور ہدایت کار ایم صادق شامل تھا۔ایم صادق تو ایک دن اپنے ساتھ قران شریف کی ایک کاپی لے کے آگیا اور ثریا کو اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کے لئے کہا کہ وہ دیو آنند سے شادی نہیں کرے گی۔وہ شادی شدہ تھا پھر بھی وہ رضا کار بن کر ثریا سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔دیو کے ساتھ شادی میں بس ایک ہی عذر تھا کہ وہ ہندو ہے۔محبت کے بیچ دھرم حائل ہو گیا تھا۔

جس دن وہ اداکار شیام کی شادی میں بانہوں میں بانہیں ڈالے آ پہنچے تو اُن کے رومانس کی خبریں ہر پرچے میں چھپیں۔دیو اور ثریا کے رومانس نے پورے دیش میں ہلچل مچادی تھی۔ایک ماں تھی جو دیو آنند کو پسند کرتی تھی مگر ماں کی تو کچھ چلتی نہیں تھی۔ثریا کی زندگی پر ماموں اور نانی اس طرح حاوی ہو چکے تھے کہ اُنکی مرضی کے بنا ایک پتا تک نہیں ہلتا تھا۔فلموں سے متعلق وہی سارے فیصلے لیتے تھے۔نانی ایک قدامت پسند مسلم خاتون تھی۔وہ ان دونوں کے ملن کے خلاف تھی۔

ایک دن فلم ''نیلی'' کے شوٹنگ کے دوراں دیو آنند نے ثریا سے پوچھا کہ کیا وہ اُس سے شادی کے لئے تیار ہے تو جواب میں وہ بولی کہ وہ اُس سے شادی نہیں کرسکتی۔وہ اُس کی موت کا سبب بننا نہیں چاہتی۔دیو نے تاؤ میں آکر اُسے بزدل کہہ کر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔اُس نے اُف تک نہ کی۔بعد میں دیو کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ نادم ہو کر اُس سے معافیاں مانگتا رہا۔نانی نے اُسکے پر پوری طرح سے کتر دئے تھے۔خبر پھیلنے کے بعد نانی کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گئی تھی۔اب وہ ہر دم سیٹ پر خود موجود رہتی تھی۔کوئی بھی پیار و محبت کا سین فلمانا ہوتا تھا تو اگر دیو ثریا کو چھو بھی لیتا تھا تو نانی سیٹ پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی۔کئی مرتبہ اُسنے شوٹنگ رکوائی۔ثریا کی ماں کو دیو پسند تھا مگر وہ دیو اور ثریا کے لئے کچھ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ماں اور بھائی کے سامنے لاچار پاتی تھی۔نانی اور ماموں نے ثریا اور دیو کے ملنے جلنے پر روک لگا دی تھی۔دیو اپنے پریم پتر اپنے کیمرہ مین دوست دارکا دویچہ کے ہاتھ ثریا تک پہنچاتا تھا۔ایک دن نانی کو شک ہوا۔اُسکے بعد کیمرہ مین کی آوا جاوی پر بھی پابندی عائد کردی گئی تھی۔

1950 میں اُنکی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔پہلی فلم ''افسر'' تھی جس کے اس گانے نے سینما پریمیوں کو ثریا کا اور زیادہ دیوانہ بنا دیا تھا۔وہ گانا تھا۔ایس ڈی برمن کا ترتیب دیا ہوا۔''من مور ہوا متوالا، یہ کس نے جادو ڈالا۔ارے کس نے جادو ڈالا''۔اس فلم کی شوٹنگ میں نانی کی مداخلت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہر سین پر اُسکی نظر ہوتی تھی۔کوئی بھی رومانٹک سین اُسکی منظوری کے بنا فلمایا نہیں جاسکتا تھا۔

''افسر'' ریلیز ہو چکی تھی۔دیو ثریا کی ملاقات پر قدغن لگ چکا تھا۔ ثریا کے انکار کے باوجود دیو اُسے بھولنے کے لئے تیار نہیں تھا۔وہ اُس سے ملنے کے لئے بن آب مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔وہ ثریا سے ملنے اُس کے گھر پر پہنچ جاتا تھا تو وہاں پر اُسکی ملاقات ثریا سے نہیں بلکہ ثریا کی نانی اور ماموں سے ہوجایا کرتی تھی جو کہ اُسے دروازے سے ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتے تھے۔وہ اپنا من مسوس کر رہ جاتا تھا۔جتنا دیو ثریا سے ملنے کے لئے تڑپ رہا تھا اُس سے کہیں زیادہ ثریا اُس سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔جب بھی دیو ثریا کے گھر میں فون کرتا تو فون ہر مرتبہ بڑھیا ہی اُٹھاتی تھی۔دیو کی آواز سن کر اُسکے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور وہ دیو کو متنبہ کر دیتی تھی کہ وہ ثریا سے دور رہے نہیں تو وہ اُسکے خلاف پولیس میں شکایت درج کرا دیں گے۔دیو ان دھمکیوں سے بھلا کہاں ڈرنے والا تھا۔ایک دن اتفاق سے فون ثریا کی ماں نے اُٹھایا۔دیو نے ثریا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ثریا کی ماں نے اُسے رات کے ساڑھے گیارہ بجے اُنکی بلڈنگ کی چھت پر ملنے کے لئے کہا۔جس بلڈنگ میں ثریا رہتی تھی وہ چھ مالہ عمارت تھی اور اُسکے گراؤنڈ فلور پر ثریا اور اُسکا پریوار رہتا تھا۔اُسکی ماں نے اُسے اسی بلڈنگ کی چھت پر ملنے کے لئے کہا تھا۔دیو کو لگا کہ یہ اُسے پھانسنے کی کوئی چال ہے۔وہ شاید اُسے گرفتار کروانا چاہتے ہیں پر وہ ڈرا نہیں۔اُسکا پیار تو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔وہ بھلا کہاں رکنے والا تھا۔اُسنے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔اُسکا ایک پنجابی دوست تھا جسکا نام تارا تھا اور جو بمبئی پولیس میں کام کرتا تھا۔وہ اُسی کو ساتھ لے کے چلا۔تارا کے پاس ایک پستول ہمیشہ اُسکی جیب میں رہتا تھا۔اُسنے دو ٹارچ لے لئے۔ایک خود رکھا اور ایک دیو کو یہ کہہ کر تھما دیا کہ جب بھی اُسے کچھ گڑ بڑ لگے تو وہ فوراً بیٹری آن کردے وہ اُسکی مدد کے لئے دوڑ پڑے گا۔

وہ حسب وعدہ چھت پر پہنچا۔چھت پر پہلے سے ثریا کھڑی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر بہت دیر تک روئے اور پھر دیو نے ثریا سے کہا کہ اگر وہ اُس سے سچ مچ پیار کرتی ہے تو اُسے اسی وقت اُسکے ساتھ چلنا ہوگا۔آدھے گھنٹے کی اس ملاقات میں دیو نے پایا کہ ثریا اتنی کمزور اور لاچار ہے کہ وہ اس گھیرے کو توڑ کر باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرسکتی۔اُسی وقت دیو نے فیصلہ لیا کہ یا تو وہ اُس کے ساتھ ابھی چل کر شادی کرے یا پھر دونوں کبھی نہ ملیں۔ثریا نانی اور ماموں کے نرغے سے باہر نہ نکل پائی اور اسطرح دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔جب دیو ثریا سے بچھڑ کے گھر پہنچا تو اُسکا دل ٹوٹ چکا تھا۔چیتن آنند کو

دیو کے اس معاشقے کا پوری طرح علم تھا۔جب دیو چیتن کے پاس پہنچا تو وہ اُسکے شانے پر سر رکھ کر بچے کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رویا۔

اسی سال دیو اور ثریا کی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔''دوستارے'' اور ''صنم''۔ان دو فلموں کے بعد وہ پھر کبھی ساتھ کام نہ کر سکے کیونکہ ثریا کو نانی اور ماموں نے دیو آنند کے ساتھ آگے فلم سائن کرنے سے منع کر دیا۔ثریا اس قدر ماموں اور نانی کے دباؤ میں تھی کہ وہ چوں تک نہ کر سکی۔اُنہوں نے اُسے جسطرح چاہا اُسکا استحصال کیا۔اصل میں اُنہیں ثریا کے چلے جانے سے معاشی غیر یقینی کا ڈر کھائے جا رہا تھا کیونکہ ثریا اُن کے لئے سونے کے انڈے دینے والی مرغی تھی۔وہ اُسی کی کمائی پر اللے تللے کر رہے تھے۔

دیو ثریا کی یادوں کی تمام تر زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا تھا اسلئے وہ رات دن اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھتا تھا۔''بازی'' کی ہیروئن شملہ کی ایک دبلی پتلی لڑکی تھی جس کا نام کلپنا کارتک تھا۔دیو آنند نے خاموشی کے ساتھ اُس سے شادی کر لی۔بے شک اُس نے کلپنا سے شادی کی تھی مگر وہ اپنے دل سے ثریا کی یادوں کو مٹا نہ سکا۔ایک بار اُس نے اسکرین کے ایک رپوٹر کو جب انٹرویو دیا تو اُسنے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ اُسنے ثریا سے سچا پیار کیا تھا جسے وہ تاعمر بھول نہیں پائے گا۔ثریا کو یاد کر کے اُس کی آنکھیں بھر آتی تھیں اور کبھی کبھی تو آنسو آنکھوں سے چھلک پڑتے تھے۔وہ دو ہی لوگوں کو یاد کر کے روتا تھا۔ایک جب وہ اپنی ماں کو یاد کرتا تھا تو اُسکی آنکھیں بھر آتی تھیں اور ایک ثریا کو یاد کر کے۔اُسکا کہنا تھا کہ اُن کی پریم کہانی میں ایک کامیاب لو اسٹوری کے تمام تر عنصر موجود تھے۔اس میں وصل کی لطافت بھی تھی اور جدائی کی کسک بھی۔اس میں قربت کی لذت آمیزی بھی تھی اور فرقت کی دردانگیزی بھی۔وہ نہیں جانتا کہ محبت کی تقدیر کون لکھتا ہے۔اگر وہ خدا ہے تو اُسے اُنہیں اسطرح ایک دسرے سے جدا نہیں کرنا چاہیے تھا۔بہر حال جب تک وہ زندہ ہے وہ ثریا کو اپنے دل میں بسائے رکھے گا۔

جس دن دیو آنند اُسے چھوڑ کے چلا گیا اُسکے بعد اُسکا دل ٹوٹ کے رہ گیا۔اُس نے اپنی سرگرمیاں ایکدم کم کر دیں۔بادشاہ بیگم اپنے بھائی اور بیٹے کے ساتھ پاکستان منتقل ہوگئی۔اب ایک ماں رہ گئی تھی جو اُس کا بڑا خیال رکھتی تھی۔یہ اُسکی زندگی کے خوشگوار سال تھے جب وہ آزاد تھی اور اکثر و پیشتر اپنے فلمی دوستوں سے ملنے جایا کرتی تھی۔اُسکے دوستوں میں جے راج، نروپا رائے، نمی اور فلم اور ٹیلی ویژن اداکارہ تبسم شامل تھے۔تبسم نے ''بڑی بہن'' اور ''موتی محل'' میں اُسکی چھوٹی بہن کا کردار ادا کیا تھا۔وہ اکثر مل لیا کرتے تھے یا فون پر بات کیا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب دیو اور ثریا عشق کے دور سے گزر رہے تھے تو وہ گھنٹوں اکیلے بیٹھے رہتے۔ثریا اپنے پیار کا اظہار اپنے گانوں کے زریعے کرتی تھی۔دیو اپنی محبوبہ کی آواز سے تر و تازہ ہو جایا کرتا تھا۔یہ دونوں پریمی دنیا و مافیہا کو بھول کر کسی اور دنیا میں پہنچ جاتے تھے جہاں نہ کوئی دین دھرم کی بندش تھی اور نہ کسی سماج کی پرواہ۔ایک دن ثریا نے دیو سے کہا کہ جب اُنکا پہلا بچہ ہوگا چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی وہ اُسکا نام دیویانہ رکھیں گے۔برسوں بعد جب یہ دونوں ایک فلمی تقریب میں ملے تو ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ثریا نے دیو سے اُسکے بچوں کے نام پوچھے تو دیو نے ثریا سے کہا کہ اُسے تو بچوں کے نام یاد ہونے چاہیں۔اُسنے اُسے یاد دلایا کہ اُسنے اپنی بیٹی کا نام دیویانا ہی رکھا ہے جو اُس نے کبھی تجویز کیا تھا۔یہ تھی اُس پیار کی شدت اور معصومیت۔

''رستم سہراب'' اُسکی آخری فلم تھی جس کے بعد اُس نے فلموں سے پوری طرح سنیاس لے لیا۔اس سے پہلے اُسکی کئی فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں ''شمع پروانہ''، ''مالک''، ''خوبصورت''، ''شمع''، ''معشوقہ''، ''دیوانہ''، ''ریشم'' اور ''راجپوت'' قابل زکر ہیں۔فلم ''مرزا غالب'' میں اُسکے کام کو بیحد سراہا گیا۔اُس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اُس کے کام کی تعریف کی۔اُسنے اس سے کہا۔تم نے مرزا غالب کی روح کو زندہ کر دیا۔اس فلم کو نیشنل فلم اعزاز سے نواز گیا۔اداکار رحمان اور ہدایت کار ایم صادق نے اُسے شادی کے لئے راضی کرنے کے کافی جتن کئے مگر اُس نے دونوں کو ٹھکرا دیا۔اُسکی ماں ممتاز بیگم بھی چاہتی تھی کہ وہ اپنا گھر بسائے مگر اُس نے اس معاملے میں کسی کی نہیں سنی۔وہ جیسے طے کر کے بیٹھی تھی کہ اگر دیو کی نہیں بن سکی تو وہ کسی کی نہیں بنے گی۔ثریا کے دل میں دیو اب بھی بسا ہوا تھا۔1996 میں اُسے لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ دیا جانے والا تھا۔وہ گھر سے بہت کم نکلتی تھی۔جب ایک پریس رپورٹر نے اُس سے کہا کہ اس تقریب میں دیو آنند بھی شامل ہو رہا ہے تو وہ اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے فوراً راضی ہوگئی۔دیو آنند کسی وجہ سے آ نہ سکا۔جب ثریا نے دیو کو نہیں دیکھا تو وہ اُس لیڈی رپوٹر پر کافی گرم ہوئی۔اُسنے اُس سے کہا تم لوگ دھوکے باز ہو۔پیار کے نام پر کھلواڑ کرتے ہو۔تم لوگوں کا کبھی بھلا نہیں ہوگا۔

ثریا سب سے زیادہ معاوضہ پانے والی اداکارہ تھی۔اُس نے کافی جائیدادیں خرید لی تھیں۔بمبئ کے علاوہ اُس نے لونا والا اور پونا میں بھی زمین جائیداد خریدی تھی۔1987 میں اُسکی ماں کا انتقال ہو گیا۔وہ اکیلی ہوگئی۔آخری ایام میں اُسنے اپنے آپ کو گھر میں قید کر کے رکھا تھا۔وہ کسی سے ملتی جلتی نہیں تھی۔تبسم کا کہنا ہے کہ وہ کئی مرتبہ اُس سے ملنے گئی تو اُس نے دیکھا کہ اخبار اور دودھ دروازے کے باہر پڑا تھا۔وہ کھٹکھٹانے پر بھی دروازہ نہیں کھولتی تھی البتہ وہ فون پر آرام سے بات کرتی تھی۔ایک دن تبسم نے فون کر کے ثریا سے پوچھا۔آپا کیسی ہو؟ تو جواب میں اُس نے کہا، سب پوچھتے ہیں کیسی ہو کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ تمہارے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔یہ تھا اُسکی تنہائی کا عالم۔

ثریا 1936 سے لے کے 1963 تک فعال رہی۔1963 میں اُسکے باپ کا انتقال ہوا جو کہ کافی عرصے سے بیمار تھا۔اُسکی موت نے ثریا کو توڑ کے رکھ دیا۔اُسنے سڑسٹھ فلموں میں اداکاری کی۔338 گانے گائے۔ایک دہائی تک اُسکا ستارہ عروج پر رہا۔وہ سب سے مہنگی اداکارہ تھی۔کے آصف نے اُسے فلم ''جانور'' کے لئے دلیپ کمار کے مدمقابل سائن کیا۔اُسے وہ فلم چھوڑنی پڑی۔

اُسکا الزام تھا کہ دلیپ کمار نے ایک سین میں اُسکا بلاوز پھاڑ دیا اور اُسے اس حد تک زخمی کردیا کہ اُسکے زخم بھرنے میں ایک مہینے کا وقت لگا۔ اُسنے یہ بھی الزام لگایا کہ کے آصف نے اُس میں ایک بوسہ کا سین لکھوایا۔ جب اُسنے کے آصف سے پوچھا کہ وہ یہ سین سنسر میں کیسے پاس کرائے گا تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ دلیپ کمار اور کے آصف ایک دوسرے سے اس حد تک ملے ہوئے تھے کہ اُنھوں نے مل کر یہ سازش تیار کی تھی ثریا کو پریشان کرنے کی۔ اس کے پیچھے کی کہانی یہ تھی کہ ثریا نے بہت پہلے دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے سے منع کردیا تھا۔

وہ اسی بات کا بدلہ لے رہے تھے۔ اُن کے برتاؤ سے اس قدر دکھی تھی کہ اُس نے اس فلم میں کام کرنے سے انکار کردیا اور بالآخر اُس نے یہ فلم چھوڑ دی۔ اُسنے فلم ''انارکلی'' میں بھی کام کرنے سے انکار کردیا۔ وہ فلم بینارائے کے پاس چلی گئی۔

اُسکی زندگی کے آخری تیس سالوں کی قربت وکیل ہیمنت ٹھاکر اور اُسکے پریوار کے ساتھ رہی۔ اپنی زندگی کے آخری چھ مہینے اُس نے ٹھاکر پریوار کے ساتھ گزارے۔ اُنہوں نے ہی اُسے اسپتال میں بھرتی کرایا۔ وہ کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا تھی۔ اکتیس جنوری 2004 کو اُس نے آخری سانس لی۔ وہ اپنے پیچھے یادوں کا ایک خزانہ چھوڑ گئی۔ اُسکی جائیداد پر ایم ظہور کے بیٹے محفوظ احمد نے دعوی ٹھونکا۔ وہ دوبئی میں رہتا تھا اور پچھلے چالیس سال میں اُسنے کبھی کسی کی سدھ نہیں لی تھی۔ عدالت نے اُس کے حق میں فیصلہ دیا اور وہ کرشنا محل بیچ کر چلا گیا۔

اُسکے جنازے میں سنیل دت، نوشاد، فلمساز پرتاپ اے رانا اور اداکار دھرمیندر نے حصہ لیا جب کہ دیو آنند ندارد تھا۔ وہ اپنے گھر میں ثریا کا سوگ منا رہا تھا افسوس کہ اُنکا پیار تشنہ طلب ہی رہا۔ دیو آنند نے اپنا گھر سنسار بسا لیا جب کہ ثریا نے تاعمر کنواری رہنے کا فیصلہ کیا۔ اُسنے اپنے عہد کو پوری طرح نبھایا۔ جب اُس کا انتقال ہوا تو وہ اکیلی تھی۔ ایکدم اکیلی۔

- بقیہ -

مولانا حسرت کی شاعری

پڑھ کر تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرؔت اور دونا کر دیا

حسرؔت موہانی کی انفرادیت کا تجزیہ کرتے سمے ہم اس اہم نکتے کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں کہ حسرؔت کی شاعری کا محرک ان کا عشق تھا۔ آپ یہ سوال اٹھانے میں حق بجانب ہونگے کہ اس میں انفرادیت کا کیا دخل ہے؟ اردو اور ہندی کے قریباً ہر شاعر کا محرک عشق ہی تو ہوتا ہے۔ حسرت موہانی کا معاملہ یوں منفرد بن جاتا ہے کہ ان کے عشق میں انفرادیت ہے۔ اس عشق کی پہلی خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی بیگم کے عاشق تھے اور ان کی بیگم عام بیگمات سے ہی نہیں بلکہ عام خواتین سے بھی خاصی مختلف اور منفرد تھیں (بیگم پریم چند اور بیگم حسرت میں قدرے مماثلت ضرور ملتی ہے)

اس عشق کی دوسری خاص بات یہ ہے کہ وہ بہت سارے معاملات میں خاصا منفرد تھا۔ وہ بلند مرتبہ تھا بقول حسرت:

حسرت بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند
تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

وہ پارسا اور پاکباز تھا بقول حسرؔت:

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرؔت کا
وہ وضع پارسا اس کی وہ عشقِ پاکباز اس کا

حسرؔت موہانی کی شاعرانہ انفرادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اسی طرح ان کے عشق کی انفرادیت اور سچ پوچھیے تو ان کی شخصی انفرادیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

گلزار صاحب، السلام علیکم

مجھ ناچیز پر "چہارسو" کا خاص نمبر نکال کر آپ نے مجھ پر بڑی عنایت کی ہے- میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کروں- جس دقت نظری اور محنت سے آپ نے یہ شمارہ ترتیب دیا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے- سرورق کی تزئین، مضامین کا چناؤ، افسانوں اور شاعری کا انتخاب اور اس کے علاوہ رسالے میں شامل دوسرے شعرا اور ادباء کی تخلیقات بہت عمدہ ہیں- "چہارسو" کا یہ سلسلہ قابل تحسین ہے جس میں آپ مانوس اور غیر مانوس ادیبوں اور شاعروں کو دنیائے ادب سے متعارف کراتے ہیں- آج کل جب علمی اور ادبی رسالوں کی اشاعت بہ مشکل ہو رہی ہے، آپ نے یہ اہم کام اپنے ذمے لے رکھا ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں- "چہار سو" نے ایک اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور اس پر قائم ہے-

اردو کے شیدائی دنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں اور ہر جگہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بہترین ادب تخلیق کر رہے ہیں- اب تک ان لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ ان کی تخلیقات کو قومی دھارے کے ادب میں شامل نہیں کیا جاتا، یہاں تک کہ اعزازات اور انعامات کے لئے بھی غیر ممالک میں رہنے والے تخلیق کاروں کے فن پاروں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا- لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے- باہر کے ملکوں میں بھی بہت اچھا ادب تخلیق ہو رہا ہے جو پاکستان اور ہندوستان میں ہونے والی تخلیقات سے کسی طرح کم نہیں ہے- آپ نے دیار غیر کے بہت سارے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے صفحات پر متعارف کرایا جس کے لئے آپ ستائش کے مستحق ہیں-

جمیل عثمان (نیویارک)

محبّ گرامی گلزار جاوید، سلام۔

تازہ شمارہ پیش نظر ہے ہمارا خیال تھا کہ برقی روپ ’’چہارسوٗ‘‘ کی مقبولیت پر منفی اثرات مرتب کرے گا لیکن آپ اور آپ کے رفقائے کار نے ہمارے خیال کو غلط ثابت کر دکھایا۔ اسکے قاریوں کے حلقے میں ’’رس رابطے‘‘ کے تحت ملنے والے مکتوبات میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ قرطاس اعزاز کا گوشہ بھی مطابق معمول آباد ہے۔ دیگر شعبہ جات بھی اپنے تنوع اور عیاری قدر کے ساتھ قائم و دائم ہیں بلکہ شاید ایک آدھ نئے شعبے کا اضافہ بھی ہوا ہے اور ہاں مشمولات حسب روایت ہند و پاک کے صف اوّل کے قلم کاروں کی منتخب نگارشات کی نمائندگی کا حق ادا کر رہی ہیں۔ آپکی اور آپکے رفقائے کار کی خدمت میں ہماری طرف سے ہدئیہ تبریک پیش ہے۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

یارِ دلدار گلزار نویدِ بہار، سلام مسنون۔

طبیعت خراب، دو دن سے بخار بھی ہے اور دیگر معاملات بدستور ہیں، مگر کچھ دن سے بے چینی تھی کہ دیکھیں ’’زہریلا انسان‘‘ کی آخری قسط کیسی ہوتی ہے۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ یہ آخری قسط ہوگی کہ جناب تابش خانزادہ نے مجھے فون پر بتا بھی دیا تھا۔ اور جب کسی طور یہ آخری قسط ڈاؤن لوڈ کر کے پرنٹ کر لی تو بس پھر کچھ نہ پوچھیے، بیشمار سوالات جو گذشتہ اقساط پڑھ کر سامنے آ رہے تھے اور جو خود ناول نگار نے بھی ان اقساط میں اٹھائے تھے، اب اس آخری قسط میں ان کی زبانی ان کے جوابات بھی مل گئے، یہ آخری قسط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی منجھا ہوا قلمکار کس طرح آخری قسط میں کہانی کو ’’وائنڈ اپ‘‘ کرتا ہے، ویسے جس جگہ اس ناول کا اختتام ہوتا ہے اور جہاں رامو دس برس کے بعد اپنے بابا (باپو) سے اس کی آخری گھڑیوں میں ملاقات کرتا ہے وہیں اسے دیویوں کی جانب سے ایک نومولود بچہ بھی بطور امانت ملتا ہے، اب وہ اسی نومولود رامو کا باپو ہے۔ ممکن ہے کبھی کسی مرحلے پر تابش خانزادہ صاحب اس ناول کا دوسرا حصہ اسی تسلسل کے ساتھ لکھیں۔ یہ دلچسپ ناول میں پہلی قسط سے ہی پڑھتا آیا ہوں اور کمال یہ ہے کہ کہانی جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی اس کی پراسراریت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

اس شمارے میں قرطاسِ اعزاز کے حقدار جناب جمیل عثمان ٹھہرے ہیں، میرا سعودی عرب میں ان سے کئی سال قریبی تعلق رہا ہے اور ان کے افسانوں کے مجموعے ’’جلاوطن کہانیاں‘‘ کی تقریبِ رونمائی میں مجھے ان پر مضمون پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس کی دوستی اور محبت کی بیشمار یادیں ان کے بارے میں بہت کچھ پڑھ کر تازہ ہو گئیں، انہوں نے ’’براہِ راست‘‘ میں میرے حوالے سے جو لکھا ہے کہ میں نے انہیں بھنور کی آنکھ میں کہا تھا یہ بھی میرے مضمون ہی کی ایک لائن تھی۔ ماشاءاللہ یہ ایک بڑے تہذیبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، جمیل عثمان سے تو اب رابطہ کم کم ہی رہتا ہے لیکن ان کے بھائی نوشاد عثمان جواب بھی سعودی عرب ہی میں ہوتے ہیں، کبھی کبھی فون بھی کر لیتے ہیں۔

نسیمِ سحرؔ (راولپنڈی)

میرے بھائی میرے دوست، گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ بنام جمیل عثمان نظر نواز ہوا۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ شمالی امریکا میں رہنے والے ادب دوست جمیل عثمان کے نام سے واقف نہ ہوں مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں جمیل عثمان صاحب سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان سے کئی دفعہ ہمکلام بھی ہو چکا ہوں مگر چہارسو کی روایات اور آپ کی انتہائی محنت کے سبب آپ نے جس تفصیل سے انکے محاسن سے قارئین کو واقف کروایا ہے اسکی مثال ملنا ناممکن ہے۔ سب سے پہلے تو انعام

الحق نے انکے کارناموں کی جو تفصیل لکھی ہے کہ وہ کہاں کہاں کن محفلوں میں مہمان خصوصی رہے، کتنی جگہوں پر انہوں نے اپنی تخلیقات پیش کیں یا کن جگہوں پر انکی کتب کی رونمائی ہوئی وہی قاری کے دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ وہ نہ صرف اچھے نثر نگار ہیں بلکہ اتنے ہی اچھے اور قادر کلام شاعر بھی ہیں۔ مغربی ممالک میں کارٹونسٹوں نے جو توہین آمیز خاکے بنائے اس پر انکی نظم، مشرق وسطیٰ میں بلند و بالا عمارتوں کے وجود مگر علم وفن کی غیر موجودگی، شہر نگاراں کھلنا (مشرقی پاکستان) کی یاد میں انکی شاعری جس نے مجھے اختر شیرانی کی مشہور نظم اے دیس سے آنے والا بتا کی یاد دلا دی اور سب سے بڑھ کر پشاور میں دہشت گردوں کے ہاتھوں بچوں کی ہلاکت پر بھی انکا نوحہ دل کو چھو جاتا ہے اور اسکا ثبوت ہے کہ وہ اپنی شاعری میں کس طرح قابل ذکر واقعات کو پرو دیتے ہیں۔ اسکے علاوہ عطیہ سکندر نے انکے کلام سے جو انتخاب کیا ہے وہ بھی انتہائی متاثر کن ہے۔

انکا افسانہ حشر ساماں بھی پر تاثیر ہے مگر یہ موضوع اب پرانا ہو چکا ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اولاد اپنے ماں باپ کو بھول جاتی ہے مگر یہاں انکے مشہور افسانے خالی ہاتھ کا تذکرہ ضروری ہے کہ اس میں ایک دل گداز سچے واقعے کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے جو پڑھنے والے کو لرزا کر رکھ دیتا ہے۔

سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں انکی سچی کہانیاں اتنی اثر انگیز ہیں کہ ہر سچے اور محب وطن پاکستانی کو آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہیں۔ پھر جس چیز سے میں بہت متاثر ہوا وہ انکی زندگی کے نشیب وفراز ہیں۔ میں ویسے بھی نرم دل انسان ہوں اور اللہ کے خوف سے ڈرتے ہوئے ہمیشہ یہ دعائیں مانگتا ہوں کہ وہ کسی کو آزمائش میں نہ ڈالے۔ جمیل جن حالات سے گذرے وہ نہایت صبر آزما اور تکلیف دہ تھے مگر شاید اللہ کی مدد اور اسکے رحم وکرم پر انکا یقین پختہ تھا اسی لئے نہ صرف وہ ان حالات سے نکل آئے بلکہ اب امریکا میں ایک نہایت کامیاب اور شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ خاص طور سے کھٹمنڈو میں کئی سال اور وہاں اجنبی دیس اور تنہائی میں بیمار ہو جانا یہ سب ایسی آزمائشیں تھیں کہ کوئی بھی ہمت ہار جاتا۔

جمیل عثمان کے فن پر مشاہیر نے شاندار مضامین لکھیں ہیں جن میں انکے ادبی کارناموں کو سراہا ہے ان میں ابوالخیر کشفی، انور سدید، ابوالحسن نغمی و دیگر شامل ہیں۔ اس لئے میں ان پر مزید رائے دینے کا اہل نہیں پاتا، مجھے ان پر لکھے مضامین میں حسرت کاسگنجوی کا مضمون اچھا لگا۔

مجلّے کے دیگر مشمولات میں حصہ شاعری میں نوید سروش، شگفتہ نازلی، ڈاکٹر ریاض، میرے بھائی سمان اور محبت اور خلوص کے پیکر یوگندر بہل، حمیرا رحمٰن، نسیم سحر، منظر بھوپالی اور یونس شرر شمارے کو رونق بخش رہے ہیں۔

افسانوں میں حمید شاہد کا برشور قابل توجہ ہے۔ اسکے علاوہ آغا گل اور رینو بہل حسب دستور بہترین تخلیقات لیکر موجود ہیں ان دونوں کا ایک خاص اور منفرد اسلوب ہے جسکی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ مجھے اچھا لگا کہ عبداللہ جاوید نے تحریک آزادی کی ایک ایسی عظیم شخصیت پر مضمون لکھا جسے پاکستان میں بوجوہ بھلا دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ جوان نسل کو ان کے نام سے بھی واقفیت نہ ہوگی۔ صد افسوس۔

جاوید خانزادہ کا قسط وار ناول کئی شماروں کی زینت بن کر اختتام کو پہنچا، کئی سال پہلے میں نے اسے جستہ جستہ پڑھا تھا میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ اس ناول کی زبردست پذیرائی ہوئی، ہر شمارے میں قارئین کی ایک بڑی تعداد نے اسکی تعریف کی اور آنے والی قسط کا انتظار کیا۔ حقیقت میں تو کسی ناشر کو اسے مجلد صورت میں شائع کرنا چاہئیے مگر پاکستان میں جو ماحول ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ ممکن نظر نہیں آتا۔

ماسٹر غلام حیدر، نوشاد، نور جہاں شمشاد بیگم اور لتا منگیشکر کے محسن تھے۔ انہوں جو لتا کے سلسلے میں لکھا ہے میں نے خود یوٹیوب پر لتا سے یہی کہانی سنی ہے۔ اس میں لتا کی بھی تعریف کرنی چاہیے کیونکہ کم لوگ ہیں جو اپنے محسنوں کو یاد رکھتے ہیں۔

یہاں آپ کے افسانے قرب قیامت کا ذکر بہت ضروری ہے اس لئے کہ یہ ایک چونکا دینے والا افسانہ ہے۔ اگر چہ یہ ایک مشکل تحریر تھی۔ اس کے لئے میں ایک ہی لفظ لکھ سکتا ہوں یعنی گنجلک۔۔۔ آپ نے بہت واضح طور پر ان بین الاقوامی سازشوں، جو مغربی ممالک تیسری دنیا اور خاص طور سے اسلامی دنیا کے خلاف کرتے ہیں کی دہشت ناک تصویر کشی کی ہے۔ آپکا طرز بیان بہت ہی پر زور ہے اور اس میں انکی طرح طرح کی سازشوں جیسے نو گیارہ، تیل کے چشموں کی خاطر جنگیں اور لاکھوں لوگوں کی ہلاکت اور، موجودہ وائرس کی وبا کا ہوّا کے علاوہ اسلامی ممالک میں اپنے ایجنٹ حکمراں تعنات کرنا اور اب امریکا اور چین کے درمیان تنازعات کا بہت خوب اور بڑا مدلل تذکرہ کیا ہے۔ آپکی تحریر اس قدر تیکھی ہوتی ہے کہ وہ جگر کو چھلنی کر دیتی ہے۔ اسکے اختتام سے میں متفق ہوں کہ ہم یعنی ہماری تمام امت ہاتھ پر ہاتھ دھرے دعاؤں اور معجزات کا انتظار کر رہی ہے۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ یہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ طویل تھا اور مطالعہ ذرا مشکل اور خشک تھا مگر یہ اپنی اثر انگیزی میں لاجواب تھا۔

اب آخیر میں میں محترم مہندر پرتاب چاند صاحب کی وفات پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں میں ان سے ملا تو نہیں تھا مگر دو ایک بار جب وہ امریکا آئے تو انہوں نے ہمیشہ مجھ سے فون پر بات کی۔ میری ان سے واقفیت دس بارہ سال سے تھی جب انہوں پاکستان کا سفرنامہ لکھا تھا۔ وہ نہایت مہذب، بیحد محبت کرنے والے، اپنی جائے پیدائش یعنی کروڑ لعل عیسن سے وابسطہ ہونے والے اور اردو کے ایک بڑے ادیب تھے۔ وہ بہت اعلیٰ پیمانے کی اردو بولتے اور لکھتے تھے۔ انکی رحلت سے مشرقی پنجاب میں اردو کی نسبت سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ میں انکی مغفرت کی دعا کرتا ہو۔

گلزار صاحب شمارے میں اور بھی کئی ایسی تحریریں تھیں جن پر میں، باوجود خواہش کے کوئی تبصرہ نہیں کر سکا کیونکہ مواد اتنا زیادہ تھا کہ میرا خط خود ایک

شمارہ بن جاتا۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

جمیل عثمان صاحب ایک طویل ادبی ریاضت اور خدمات کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ ان کی خدمات سے تمام قارئین کو آگاہ کرنا وقت کی ضرورت اور انصاف کا تقاضا تھا۔ چہارسو کا شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۲۰ء اُن کے نام سے موسوم کر کے آپ نے یہ حق ادا کر دیا جو قابلِ تحسین ہے۔

شمارہ میں دلچسپ افسانے، مضامین اور شاعری شامل کی گئی ہے۔ ''جہانِ نو کی نوید'' رینو بہل صاحبہ کا یہ افسانہ ایک حیران کن سفرنامہ کی مانند ہے۔ وسیع پیمانہ پر پھیلے ہوئے امیزون (Amazon) کے جنگلات اور ان میں رہنے والے وحشی اور آدم خور قبائل ایک الگ اور خوفناک تہذیب اور تاریخ کے حامل ہیں جو باقی مہذب دنیا سے بالکل الگ منظرنامہ ہے جس پر رینو بہل صاحبہ نے روشنی ڈالی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر ہیں۔ آزاد ترقی یافتہ قومیں ان جنگلوں کو آگ لگا کر یا دیگر ہتھکنڈے اختیار کر کے ان قبائل کو ختم کرنا چاہتی ہیں تا کہ ان بیش قیمت ذخائر پر قبضہ کیا جا سکے۔

آغا گل صاحب کا افسانہ ''شوم کا مال'' بلوچستان کے سات آٹھ عشرہ پہلے کے حالات پر ایک تحریر ہے جس میں تصویر کے ایک ہی رُخ پر مبالغہ آمیز روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک دور گزر رہا ہے جب ۱۸۷۶ء سے پہلے اور بعد کے فرنگی مظالم کی داستانیں پڑھ کر خوف آتا ہے جب ہزاروں لوگوں کو مختلف وجوہات بشمول جنگ آزادی درختوں پر پھانسی دے کر لٹکایا جاتا رہا۔ تاہم آزادیٔ ہندوپاک کے بعد حالات بدل چکے ہیں۔ وطنِ عزیز کے ہر صوبہ میں اور مرکز میں آبادی کے لحاظ سے ہر صوبہ کے لوگ اپنے نمائندے منتخب کر کے حکومت کرتے ہیں۔ پورا ملک آزاد ہونے کے بعد ہندوپاک دونوں میں نوابوں یا دیگر امراء کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں صوبہ میں ضم ہو چکی ہیں۔ پرانے زخم کریدنا قوم کے مجموعی مفاد میں نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ ان پر نمک پاشی کے بجائے مرہم لگائی جائے۔ بلوچستان میں بلوچی، بروہی، پختون اور دُکر قومیتیں آباد ہیں۔ نئی نسل کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ وہ آج اور کل کے بارے میں فکرمند ہیں۔ جب کہ دشمن ملک اربوں روپیہ خرچ کر کے بلوچستان کے ترقیاتی منصوبوں بشمول سی پیک (C Pec) کو ناکام بنانا چاہتا ہے اور تخریبی سرگرمیوں کے ذریعہ علاقے کو غیر مستحکم کرنا چاہتا ہے جس کے ثبوت حال ہی میں میڈیا کے سامنے بھی پیش کر دیئے گئے ہیں۔ ان سے خبردار رہنا زیادہ دانشمندی کی بات ہوگی۔

''قربانی آن لائن'' رومانہ رومی نے ایک دلچسپ اور سبق آموز کہانی تحریر کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قربانی آن لائن کی سکیم پر سو فیصد بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور کس طرح ان کی فیملی کو ایک تلخ تجربہ سے گزرنا پڑا۔

''قربِ قیامت'' (گلزار جاوید) ایک زبردست مدبرانہ سیاسی تجزیہ ہے جو محض کہانی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اس میں وہ سب کچھ چند اوراق میں بیان کر دیا گیا ہے جو ہمارے سیاسی اور مذہبی قائدین کے علاوہ پوری قوم کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ قومیں جس طرح مذہبی، سیاسی اور قبائلی دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہیں اور ہر گروہ دوسرے ہم وطن اور ہم مذہب کو زچ کر دینے میں جتا ہوا ہے اور تقریباً سبھی اپنے ذاتی تعصب اور مفاد سے ہٹ کر سوچنے اور عمل کرنے سے محروم ہو چکے ہیں اس پس منظر میں صورتِ حال انتہائی مایوس کن ہے اور اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ بین الاقوامی سازشوں کی بدولت دنیا میں اکثر ممالک اور قومیں انجانے میں یا جانتے ہوئے بھی اس تباہ کن جال میں پھنس چکے ہیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے سو سال پہلے ہی اہلِ مشرق کو انتباہ کر دیا تھا کہ:

''مغرب کی رگ و جان پنجۂ یہود میں ہے''

چنانچہ دنیا کی نصف فی صد آبادی جن کا ذہانت، عیاری اور منصوبہ سازی میں جواب نہیں ہے پہلے لیگ آف نیشنز (League of Nations) بنوائی اور پھر اُس سے تجربہ حاصل کر کے اقوام متحدہ کا ادارہ U.N.O قائم کیا جس کا کنٹرول بالواسطہ طور پر اسی اقلیت کے پاس ہے۔ ایک جائزہ کے مطابق نصف فیصد آبادی رکھنے والے اقلیتی گروہ کا اقوام متحدہ کے کل سٹاف میں تناسب تقریباً 56% تھا اسی لیے شناختی کارڈ سے مذہب کا خانہ ختم کر دیا گیا تھا۔ مغرب کو پنجہ میں قابو کرنے کے بعد اب مشرق میں بھی یہی کیفیت ہے۔

''کیا زندہ رہو گے'' وحشی سعید صاحب نے اس وحشیانہ اور المناک واقعہ کو مدِنظر رکھ کر کہانی لکھی ہے جو میڈیا میں بھی رپورٹ ہوا اور جس میں مقبوضہ کشمیر میں پولیس نے ایک بزرگ شہری کو اُس کے پانچ سالہ معصوم پوتے کے سامنے روک کر بلا جواز گاڑی میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا جبکہ معصوم پوتا دادا کو اٹھانے کی کوشش میں گاڑی میں پڑے دادا کو پکار رہا تھا ''دادُو۔ اٹھو گھر جانا ہے''

شاعری میں بہت اچھا کلام شامل کیا گیا ہے۔ خصوصاً طالب جوہری، پروین شیر، ناصر علی سید، یونس شرر، افتخار عارف، جمیرا رحمان، منظر بھوپالی، العدروس اور یوگیندر بہل تشنہ کا کلام متاثر کن ہے۔ اس تمام کاوش کے ساتھ ''چہارسو'' کو کئی رنگوں میں خوبصورت بنا کر قارئین کی نذر کرنے پر آپ دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

مسلسل پانچ برس تک زہریلا انسان چھاپنے پر میں آپ کے حوصلے کی اور اتنے عرصے تک مسلسل پڑھنے پر قارئین کے صبر کی داد دیتا ہوں۔ ان پانچ برسوں میں آپ سے، آپ کے لکھاریوں سے، اور آپ کے قاریوں سے اتنا کچھ سیکھا ہے بیان سے باہر ہے۔ جہاں تک اسے کتابی شکل میں چھپوانے کا تعلق ہے تو میں اس کا ذکر آپ کے ہاں کر آیا تھا۔ جسے میرے محبوب دوست

اور حمد و نعت کے ہر دلعزیز شاعر نسیم سحر بھی اپنے ایک خط میں مجھ سے منسوب کر کے لکھ چکے ہیں کہ میرے اس ناول کو اپنے خرچے سے کتابی شکل میں چھپوانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ کے قارئین میں کوئی پبلشر ادارہ اسے چھاپنے کا خواہاں ہو تو میں بخوشی اپنے تمام حقوق دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ اسے میرے نام سے چھاپیں اور اگر ایسا ہو تو میں اپنے طور پر اس کی کئی کاپیاں پوری قیمت دے کر خریدوں گا۔ اس کتاب کا میں نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ اور آج کل اس کی پروف ریڈنگ میں مصروف ہوں اور دعا گو ہوں کہ کوئی مغربی پبلشر اسے چھاپنے کی ذمہ داری لے۔

میں رینو جی کا مشکور ہوں جنہوں نے مجھے بھگوان کی تمیز سکھائی۔ میں ایک بار پھر آغا گل، ثاقب، فیروز بھائی، یوگی جی، نسیم سحر، رینو جی، نوید سروش، دیپک کنول، سیمیں کرن، سیما پیروز کے علاوہ تمام چہارسو ریڈر اور رائٹر کلب کا پُر خلوص شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی رائے سے نوازا۔ ناول کے بارے میں آپ کے خطوط اور آپ کی رائے سے بڑا سرمایہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اور ایک لکھاری کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی صلہ ہو بھی نہیں سکتا۔ اگر ہو سکے تو اس مکمل ناول کے بارے میں اپنی چند سطور سے مجھے نوازیں تو مشکور رہوں گا۔

گلزار بھائی! آپ بھی کسی سے کم افسانہ نگار نہیں ہیں۔ آپ پچھلی تین دہائیوں سے ہر شمارے کے لیے ایک نئی طرز کا افسانہ لے کر آتے ہیں۔ لکھنا اور وہ بھی تسلسل سے، چھاپنا اور وہ بھی تسلسل سے، آپ کے ہر کام میں کمالِ تسلسل کا فن آپ کی خداداد صلاحیت ہے جس نے چہارسو کے اس پلیٹ فارم کو نہ جانے کب سے سجایا ہوا ہے۔ خدا اسے اور آپ کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔ آمین

تابش خانزادہ (نیویارک)

گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

صادقہ نواب سحر نمبر ملا تو اپنے تاثرات لکھنے لگی تھی لیکن چند مصروفیات نے یوں جکڑ لیا پورا نہ کر سکی تھی۔ پہلے تو یہ عرض کر دوں کہ آپ قابل تعریف ہیں جو ان دنوں وبا کے انتہائی اُداس موسم میں اور اس مشکل وقت میں بھی چہارسو کے ذریعہ لوگوں کو خوشیاں بانٹ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کار خیر اور کیا ہو سکتا ہے؟ بے حد شکریہ اور نیک خواہشات۔

صادقہ نواب سحر سے بھرپور ملاقات چہارسو کے توسط سے ہوگئی۔ یہ راہ راست کے ذریعہ ہمیشہ آپ یہ کارنامے انجام دیتے آرہے ہیں جو اردو ادب کی بہت بڑی خدمت ہے۔ دنیا کے تمام گوشوں سے ادیبوں کو متعارف کرنا اور انہیں جوڑنا قابل تحسین ہے۔ صادقہ نواب سحر سے مختصر سی واقفیت تھی لیکن چہارسو سے مکمل جان سکی۔ بہت ہمہ جہت ادیبہ ہیں جنھوں نے کئی اصناف میں ادب تخلیق کیا ہے۔ ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر کے از حد مسرت ہوئی۔ شمارے میں سبھی مشمولات عمدہ ہیں۔

ابھی جمیل عثمان نمبر موصول ہوا ہے جو زیر مطالعہ ہے۔ ان کی فتوحات بھی قابل ستایش ہیں۔ مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ ادب اطفال کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے جس کی بہت ضرورت ہے ۔خاص کر دیار غیر میں اردو کی نئی پود کے لیے اپنی زبان وتہذیب کو برقرار رکھنے کا یہ راستہ جمیل عثمان ہموار کر رہے ہیں جس کے لیے ہم سب ان کے ممنون ہیں۔ اردو کی درازیٔ عمر کے لیے ادب اطفال کی اہمیت ہمیشہ رہی اور رہے گی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ ابھی رینو بہل کا افسانہ... جہان نو کی نوید... پڑھ سکی ہوں۔ انسانیت کے لبادے میں حوانیت کا گھناؤنا سچ سامنے آیا ہے۔ امجد اسلام امجد صاحب کی نظم ’’محبت ایجاد کرو‘‘ کیا کہنے۔ ابھی اور پڑھنی باقی ہے۔ دعا ہے آپ اسی طرح ثابت قدم رہ کر دیواروں میں قید لوگوں کو تازہ ہوا مہیا کرتے رہیں۔

پروین شیر (نیوجرسی)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب

چہارسو کا حالیہ شمارہ پڑھا جو کہ جمیل عثمان نمبر تھا- پڑھ کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ واقعی ادب نواز اور سخن فہم ہیں-جمیل عثمان بلاشبہ شمالی امریکہ کے ادبی افق پر ایک جگمگاتا ہوا نام ہے- ان کی نظمیں، غزلیں، افسانے، کہانیاں اور مقالے الغرض ہر ایک صنف سخن ایک دوسرے سے بڑھ کے ہیں-شمالی امریکہ کے ادبی حلقوں میں ان کا ایک معتبر حوالہ ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم یہاں کی مختلف ادبی محافل میں ان کے کلام سے مستفید ہوتے ہیں- ہم تہہ دل سے آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے ایک معتبر ادبی شخصیت کو دنیا کے سامنے متعارف کرایا اور ان کو خراج عقیدت پیش کیا-

اعجاز حسین بھٹی (شمالی امریکہ)

محترم گلزار جاوید، تسلیم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نظروں سے گزرا۔ جمیل عثمان صاحب پر یہ خاص نمبر بیحد پسند آیا میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ جمیل صاحب کا تفصیلی انٹرویو کافی دلچسپ ہے اس سے قاری کو جمیل صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ آپ کے مشکل سوالوں کا بھی جواب جمیل صاحب نے جس خوش گوئی، متانت اور کسر نفسی کے ساتھ دیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ جمیل صاحب جتنے عمدہ فنکار ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ نارتھ امریکہ کی ادبی محفلوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور بہ حیثیت افسانہ نگار اور شاعر انکا یہاں خاص مقام ہے۔ ویسے میں آپ کی رائے سے متفق ہوں کہ اردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں جمیل صاحب کو ابھی تک انکا جائز مقام نہیں مل پایا ہے۔ امید ہے اس سلسلے میں آپ کی یہ کوشش کارآمد ثابت ہوگی۔

اظفر حسن (نیوجرسی نارتھ امریکہ)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسوٗ'' کا تازہ شمارہ ''جمیل عثمان'' کی پُر اثر نگارشات سے مزین ہے۔ آپ نے ''براہِ راست'' کے تعارف میں درست لکھا ہے۔

''مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر تخلیق کار دس بیس برس کی ریاضت کے بعد پختہ شناخت بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر جن لوگوں کو بے گھری اور بے دری کا سامنا ہوتا ہے وہ تمام عمر ریاضت کے باوجود نام و نمود سے محروم رہا کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتحال جناب جمیل عثمان کے ساتھ رہی۔ پٹنہ، کلکتہ، کھلنا، کراچی، جدہ اور نیویارک کے درمیان جہدِ مسلسل میں گزارنے کے باوجود قرطاس و قلم سے ایک پل کے لیے بھی ناطہ نہیں ٹوٹا۔''

''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات کے جوابات بڑی سادگی اور سچائی سے دیے ہیں۔ سنیل کی بیف کے کباب کی طلب، جمیل عثمان کا مندر میں (بحالت مجبوری) دیوی کے سامنے سر جھکانا (یہاں مسلم ملک میں بڑے قوم راہ نما اپنے عمل ''مندر جا کر اور زبان سے کیا کچھ نہیں کر رہے) اور پاکستان کے موجودہ حالات (سماجی، تعلیمی) معیارِ تعلیم اور اپنی کہانیوں کے حوالے آپ کے سوالات کے تفصیلی جوابات دیے ہیں۔ بہن عطیہ سکندر علی نے جمیل عثمان کی غزلیہ شاعری کا انتخاب کمال کا کیا ہے۔

اُڑا دیتا ہے فاقہ زندگی کا رنگ چہرے سے
بدن کی دل کشی کو بے لباسی چھین لیتی ہے

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے افسانوں میں مقید ایک دن بہت مختلف تحریر ہے ان کہانیوں کو ''جلاوطن کہانیاں ایک ادبی میورل ہے'' درست ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون جمیل عثمان کی شخصیت اور فکر و فن کو نمایاں کرتا ہے۔ عبدالحق حسرت کاس گنجوی، رفیع الدین راز اور پروفیسر خالدہ ظہور کے مضامین جمیل عثمان صاحب کے افکار کو سمجھنے کے لیے اہم ہیں بلکہ یہ تحریر پڑھ کر جمیل عثمان صاحب کی کتابیں پڑھنے کو دل کر رہا ہے۔ آپ نے ایک نئے (میرے لیے) ذہین اور اہم اہلِ قلم سے متعارف کروایا۔ داد و تحسین۔ جمیل عثمان کا افسانہ ''خالی ہاتھ'' زندگی کے مختلف رخ اور کیفیات کا آئینہ ہے۔ فکاہیہ ''زبان کی کھچڑی'' دلچسپ ہے۔ بہت خوب۔ نسیم سحر صاحب اور انیس الرحمان بھائی کی نعتوں میں فکر، محبت اور عقیدت کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔

غزلوں کے انتخاب کی داد نہ دینا ادبی بد دیانتی ہوگی۔ کچھ غزلیں بار بار پڑھی ہیں۔ طالب جوہری، احمد مشتاق، جاوید اشرف، منظر بھوپالی، تصور اقبال ،سیفی سرونجی، نیاز جیراج پوری، ڈاکٹر نزہت شاہ، سبھاش گپتا شفیق وغیرہ کی غزلوں کے اکثر اشعار اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں دل کو لگنے والی بات ہے۔

رسمِ دنیا بھی وہی، راہِ تمنا بھی وہی
وہی مل بیٹھ کے ہنسنا وہی تنہا رونا

(احمد مشتاق)

شکار گاہ شکاری کے خوں سے رنگیں ہے
زمیں کا رزق کسی جانور چھین لیا

(طالب جوہری)

جب سے ہوا ہے قتل وہ رستہ نہیں جاتا
اب تیری گلی میں کوئی لڑکا نہیں جاتا

(سیفی سرونجی)

حمید شاہد کا افسانہ ''مُرشِد'' اور رینو بہل کا ''جہانِ نو کی نوید'' اپنی پیش کش اور اندازِ بیانیہ کے لحاظ سے اچھے افسانے ہیں۔ ظفر قریشی کا ترجمہ (کافکا کی کہانی) رہائی اپنے وقت پر شروع ہوگی انتخاب اور ترجمہ دونوں بہت خوب ہیں۔ ابھی اتنا ہی چہارسو کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی مسلسل محنت اور لگن، ادب سے گہری اور سنجیدہ وابستگی لائق تقلید ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو مجھے پہلی بار محترمہ ڈاکٹر رینو بہل نے بھیجا تو بہت پسند آیا بلکل خالص ادب نہ صابن نہ تیل کا اشتہار اس کے بعد منور رانا صاحب کا شمارہ دیکھا تو طبیعت خوش ہوگئی اب تو میں اپنے پنشن کی طرح اس کا بھی انتظار کرتا ہوں اور جب ملتا ہے تو پڑھنے سے پہلے اس کو پچاس جگہ بھیجتا ہوں میں ابھی اس شمارہ میں سب سے پہلے ڈاکٹر رینو بہل کی کہانی جہان نو کی نوید پڑھی واقعی اب ہماری دنیا ایسی ہوتی جا رہی ہے۔ زمین سے گیس نکالو پٹرول نکالو اور سارے وہاں کلچر کو ختم کر دو اس کے بعد آغا گل کا افسانہ پڑھا ''شوم کا مال'' اب تو ہر جگہ یہی حال ہے۔ بہار میں ایک مثل مشہور ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس ویسے آغا گل بلکل کرشن چندر جیسے لکھتے ہیں اور بہت ہی نڈر قلم کار ہیں۔ میں بلوچستان تو جا نہیں سکتا لیکن جس سچائی اور بے باکی سے انھوں نے تصویر اتاری ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس کے بعد جمیل عثمان کو پڑھا ان کی پہلی کہانی حشر ساماں اور دوسری خالی ہاتھ مجھے بہت تعجب ہوا جمیل عثمان کو پڑھ کر ضلع چھپرا بہار ان کا آبائی وطن ہے اور میں ان سے تھوڑی دور بکسر کے پاس پٹھانوں کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں۔ ان کا افسانہ خالی ہاتھ پڑھ کر میں رو پڑا کیونکہ میں اس وقت آج کے بنگلہ دیش میں تھا وہاں جو کچھ ہوا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہاں جو دلی کا تھا اگر بنگلہ نہیں بولتا تھا وہ بھی بہاری تھا۔ جنگ کے بارہ دنوں میں ایسی تباہی نہ میں نے کبھی سوچی تھی نہ دیکھی تھی۔ وہاں اسوقت کوئی مذہب یا انسانیت نہیں تھی۔ دنیا میں پہلی بار ایک ہی مذہب کے لوگوں نے ایک دوسرے کا گلا کاٹا۔ اس سفا کی کے دوران بہاریوں پہ کیا گزری اسے بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ادبی رسالہ ہے اور قارئین کو اچھا نہیں لگے گا یہ بہاری مسلمان آج بھی جنیوا کیمپ میں تقریباً تین لاکھ ہیں اور کیسے جی رہے ہیں یہ بیان سے باہر ہے۔ ان کے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ کسی ملک کے شہری نہیں۔ آٹھ آدمیوں کے لیے ایک کمرہ تھا اور اتنے آدمیوں کے لے ایک لیٹرین تھی اب اتنے دنوں کے بعد کیا حال ہے

معلوم نہیں۔

زین العابدین خان (گارڈن گروبھ، کیلی فورنیا)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ "چہارسو" نظر سے گزرا- پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے قرطاس اعزاز کے لئے جمیل عثمان کا انتخاب کیا- جمیل بھائی بے شک نیو یارک میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں- میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کے دوستوں بلکہ چھوٹے بھائیوں کی فہرست میں موجود ہوں- جمیل بھائی کاروان فکر وفن شمالی امریکہ کے سرگرم رکن ہیں اور ہم لوگ ان کی مسکراہٹ بھری مشاورت سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں- چہارسو کے مضامین میں بچوں کے لئے لکھی گئی ان کی کتابوں پر تبصرہ کی تھوڑی سی کمی محسوس ہوئی- چہارسو کا یہ شمارہ ہر لحاظ سے خوبصورت اور دلپذیر ہے- میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے قرطاس اعزاز کے لئے جمیل عثمان کو منتخب کیا- آپ بے شک ہماری تہنیت کے حقدار ہیں-

اولیس راجا (نیو یارک)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

پہلی بار نیو یارک اور شمالی امریکہ کے ممتاز شاعر جناب جمیل عثمان کے توسط سے چہارسو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آپ کا جریدہ بہت پسند آیا۔ ہماری طرف سے خراج تحسین قبول کیجیے۔ جمیل عثمان صاحب کو نیو یارک اور نیو جرسی کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بارہا سننے کا شرف اس ناچیز کو حاصل ہے۔ واقعی آپ نے اس گوہر کی قدر کی اور ان کی شخصیت اور فن کو اپنے رسالے کے ذریعے اردو قارئین سے روشناس کرایا۔ جمیل عثمان نے بہت جلد نیو یارک اور شمالی امریکہ میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ان کی شخصیت کے ساتھ ان کا قلم بھی ساحرانہ ہے۔ ان کی تحریریں گو کہ سادہ ہوتی ہیں مگر اسی سادگی سے وہ معاشرے کو ایک پیغام دے دیتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں ان کی بعض کہانیاں اتنی پرتاثیر ہوتی ہیں کہ آنکھوں سے آنسو نکل جاتے ہیں جیسی کہ آپ کے اس خاص نمبر میں ان کی پہلی کہانی ''حشر ساماں''۔ آپ کو ایک بہت عمدہ نمبر نکالنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

خالد دلوی (نیو جرسی)

برادرِ من گلزار جاوید، السلام علیکم۔

گذشتہ تین دہائیوں سے اردو دنیا میں چہارسو کے چرچے ہیں اور کیوں نہ ہوں اس کی بنیادوں میں سید ضمیر جعفری صاحب کا نام ہے۔ وہی ضمیر جعفری جنہوں نے ہماری تنظیم (کاروانِ فکر وفن شمالی امریکہ) کا نام تجویز کیا تھا۔ اس حوالے سے آپ اور ہم بہت قریب ہیں۔ ایک ہی عظیم ہستی کے Extension ہیں۔ ہمارا آپ کا تعلق پرانا ہے۔ ہماری اور آپ کی ملاقات ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی کے اجلاس میں ہوئی تھی جہاں اردو کی نئی بستیوں پر بات ہو رہی تھی۔

جمیل عثمان ہماری انجمن کی مجلس عاملہ کے اہم رکن ہیں۔ ان پر چہارسو کا خاص نمبر دیکھ کر ہماری انجمن اور شمالی امریکہ کی ادبی دنیا بہت خوش ہے اور آپ کی شکر گزار ہے۔ رسالے کی ترتیب وتزئین بہت خوب ہے اور ہمیں مسرت ہے کہ آپ کا رسالہ اردو ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی میں پیش پیش ہے۔ ہمیں یہ بھی فخر ہے کہ آپ نے ہمارے اپنے ایک بہترین افسانہ نگار، مزاح نگار اور شاعر جمیل عثمان پر خاص نمبر نکالا۔ آپ کو بہت مبارک ہو۔

وکیل انصاری (نیو یارک)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو کے تازہ شمارے کی بات کرنے سے پہلے میں ہردلعزیز محترم مہندر پرتاپ چاند صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہوں گی جو اس دنیائے فانی سے ۲۰۔ اکتوبر ۲۰۲۰ء کی رات رخصت ہوگئے۔ اُن کی بے وقت رحلت کا نہ صرف چہارسو پریوار اور اردو داب کا بلکہ میرا بھی ذاتی نقصان ہوا۔ اُن کے جانے سے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے سایہ دار درخت کی چھاؤں سے محروم ہوگئی۔ اُن جیسا پُرخلوص، پُر وقار، پُرشفیق اور نفیس شخصیت اب تو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ پرماتما اُن کی آتما کو شانتی دے۔ صرف یہ ہی دعا کر سکتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ وقت تھمتا نہیں اور دنیا کا کاروبار اُسی طرح چلتا رہتا ہے۔ سب کام اُسی طرح ہو رہے ہیں مگر اُن کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔

جمیل عثمان صاحب کے انٹرویو سے اُن کی زندگی اور اُن کی ادبی خدمت سے بھرپور جانکاری حاصل ہوئی۔ آپ کے سوالات ایسے تھے کہ اُن کی پوری زندگی کا نقشہ قارئین کے سامنے آ گیا۔ حیرت ہوتی ہے سوچ کر کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو کسی ایک ملک کو اپنا نہیں کہہ سکتے۔ اُن کی زمین وسیع ہے۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ بچپن ہندوستان میں گزرا، لڑکپن اور شباب کا دور بنگلہ دیش، جوانی پاکستان، ملازمت سعودی عرب اور آگے کی زندگی امریکہ میں بسر ہو رہی ہے۔ اُن کے انٹرویو اور اُن کی کہانیوں میں بہار، کولکتہ، بنگلہ دیش، سعودی عربیہ، پاکستان اور امریکہ کی زندگی کے کچھ کھٹے میٹھے، کچھ تلخ حقائق پڑھنے کو ملے۔ انٹرویو بھرپور اور دلچسپ ہے۔ اُن کا لکھا افسانہ ''خالی ہاتھ'' اندر تک ہلا گیا۔ ''زبان کی کھچڑی'' بھی دلچسپ مزاحیہ مضمون ہے۔ ''حشر ساماں'' تو کرونا کے حالات کی درد بھری حقیقت ہے۔ جمیل عثمان صاحب اور آپ کو خوبصورت گوشہ نکالنے کے لیے بہت مبارک۔

اس بار تو سبھی افسانے کمال کے ہیں۔ محمد حمید شاہد اور آغا گل صاحب نے کوئٹہ کی تاریخ اور موجودہ حالات کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ پڑھ کر دل بوجھل ہوگیا۔ اُن کی جاندار تحریر نے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ وحشی سعید صاحب کی کرونا پر لکھی ہوئی کہانی پڑھ کر موجودہ حالات آنکھوں کے آگے گھوم گئے۔ نہ جانے کب اس نامراد بیماری سے پوری دنیا کو نجات ملے گی۔ غزالہ قمر صاحبہ نے غربت، مجبوری اور سمجھوتے پر بسر کرنے والوں کا درد بخوبی بیان کیا ہے۔ رومانہ

رومی نے بھی موجودہ حالات کی عکاسی کرتے ہوئے رسم و رواج، اپنی روایتوں، قدروں سے مجبوری میں سمجھوتہ کرنا بزرگوں کے لیے آسان نہیں۔ ناک پر بیٹھی مکھی کا مقصد تو بالکل واضح ہے۔ ''قربِ قیامت'' کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ ہی نہیں۔ یہ افسانہ کسی اور ہی لیول کا ہے۔ ایسے موضوعات کے لیے ایسا اسلوب برتنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کرپشن کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا اور آخر تک کہانی باندھے رکھتی ہے۔ لاجواب۔ سبھی قلم کاروں میں میری جانب سے، بہت بہت مبارک باد۔

زہریلا انسان آخر اپنے اختتام تک پہنچ ہی گیا۔ آخیر تک دلچسپی برقرار رہی۔ حسرت موہانی پر لکھا مضمون معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ فرح کامران کا مضمون، ایک صدی کا قصہ اور غزلیں ابھی پڑھنی باقی ہیں۔ امید ہے ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی شاعری کمال کی ہوگی۔

راحت اندوری صاحب کے منتخب اشعار ٹائٹل کے بیک پیج پر چھاپ کر آپ نے دو کام کر دیے۔ راحت صاب کو خراجِ عقیدت بھی پیش کر دیا اور روایتی ڈیزائن میں نیا پن بھی آ گیا۔ رسالے کا مطالعہ مکمل ہوتے ہی اگلے شمارے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ سلامت رہیں خوش رہیں۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

برادرم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو مجھے بھی بذریعہ ای میل آتا ہے۔ مجھے پسند بھی ہے۔ جمیل عثمان صاحب کا انٹرویو بہت مفصل اور خوبصورت ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ان کی شخصیت، ان کا خاندانی پس منظر اور اب تک ان کے ساتھ مشرقی پاکستان سے پاکستان، پھر سعودی عرب اور امریکہ تک میں جو ہوتا رہا اس کی مکمل منظر کشی نظر آئی۔ اس سے بہتر انٹرویو ہو نہیں سکتا۔ جمیل صاحب نے ہر سوال کا جواب تفصیل اور پورے پس منظر کو اجاگر کرتے ہوئے دیا۔ ایک بات میں نے سنجیدگی سے نوٹ کی کہ انٹرویو کرنے والے کی شخصیت متاثر کن ہے۔ گلزار صاحب آپ نے جمیل صاحب کی زندگی اور ان کی تحریروں پر اس طرح سوالات کیے کہ کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہ جائے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ بچپن سے ان کے ساتھ رہے ہوں اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے ہر لمحے کو جانتے ہوں اور ان کے منہ سے وہ کچھ کہلوا رہے ہیں جن کا آپ کو پتہ ہے۔ یقین کیجیے کہ یہی انٹرویو لینے والے کا کمال ہے کہ سامنے والے کے منہ سے وہ نکلوا لیتا ہے جو وہ خود سے شائد نہ کہیں۔

احتشام (شکاگو)

گلزار بھائی آداب،

میں پچھلے دو سال سے 'چہارسو' کی مسلسل قاری ہوں۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میری نثری اور شعری تخلیقات سب سے پہلے "چہارسو" میں ہی شائع ہوئیں۔ میں نے اس عرصے میں کتنی بار سوچا کہ میں بھی شکریہ کے کچھ الفاظ لکھ کر "رس رابطے" کا حصہ بنوں، لیکن ہر بار الفاظ کے چناؤ میں الجھ کر رہ جاتی، نیا شمارہ آ جاتا اور میری بات پرانی ہو جاتی۔ لیکن اس بار عہد کیا کہ بات پرانی نہیں ہونے دوں گی۔ اب ذکر دو سالوں کا ہے تو بات کو سمیٹنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔ بہرحال، اب جب کچھ کہنا ہے تو سب سے پہلے میں یہ کہوں گی کہ گلزار بھائی آپ جس محنت لگن اور باقاعدگی سے رسالہ نکال کر رہے ہیں وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ مجھے تو حیرت ہوئی کہ اس کرونا وائرس کے زمانے میں جہاں کتنے کام رک گئے، "چہارسو" کا کام نہیں رکا۔ اس اداس فضا میں بھی آپ نے اپنے قارئین کو مایوس نہیں ہونے دیا۔

چہارسو میں بہترین نثر اور شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ جہاں آپ کہنہ مشق ادباء اور شعراء کی تخلیقات اپنی رسالے میں شامل کرتے ہیں وہاں آپ نئے لکھنے والوں کو بھی ڈھونڈ نکالنے اور ان کی حوصلہ افزائی کا بیڑا بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ قابلِ ذکر بات ہے کہ شمالی امریکہ کے تخلیق کار بھی مسلسل "چہارسو" کا حصہ بن رہے۔ دیارِ غیر میں جہاں دوڑتی بھاگتی زندگی میں چند لمحے بھی بہت مشکل سے میسر آتے ہیں، ایسے میں جو لوگ اپنی زبان و ادب کی ترویج میں حصہ ڈال رہے ہیں ان کو اپنے ملک میں پہچان ملنی چاہئے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ یہ خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ "قرطاس اعزاز" اس بار جمیل عثمان کے نام تھا، جن سے کئی برسوں پرانا گہرا تعلق ہے۔ ان کی نثر اور شاعری پڑھی بھی اور ان کی زبانی سنی بھی، ان کے پڑھنے کے خوبصورت الفاظ نے کم از کم میرے لئے اس بات کو غلط ثابت کر دیا کہ نثر پڑھنے میں مزا آتا ہے، سننے میں نہیں۔ ہر چند کہ ان کی پہچان نثر ہے، خود بھی اپنی شاعری کو کم درجہ دیتے ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ شاعری کے ساتھ بھی پورا انصاف کر رہے۔ ایک انتہائی سنجیدہ تخلیق کار ہیں اور اس کے لئے واقعی اپنا خون جگر دے رہے۔ قرطاس اعزاز کے لئے جمیل عثمان کا چناؤ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سمندر کی تہہ میں وہ سیپی تلاش کرنا جانتے ہیں جس میں موتی ہوتا ہے۔

بات بہت طویل ہو جائے گی ورنہ "چہارسو" میں چھپنے والی تخلیقات پر بھی کچھ رائے دیتی۔ اس بار صرف اتنا کہوں گی کہ آپ کے افسانوں کی کتاب تو پڑھ ہی چکی تھی، لیکن ہر بار جب چہارسو میں آپ کا کوئی افسانہ چھپتا ہے تو اس کو پڑھ کر دوبارہ لطف اندوز ہوتی ہوں۔ آپ کے لئے بہت دعائیں۔

فرح کامران (نیوجرسی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

امید ہے مزاج بخیر ہونگے بعض مصروفیات کے سبب کافی دنوں سے رابطہ بھی نہیں ہو پایا اور اور چہارسو جمیل عثمان نمبر بھی مکمل نہیں پڑھ پایا۔ بحر حال اللہ اللہ کر کے جتنا جتنا پڑھا اس سے تشنگی اور بڑھتی گئی۔ ماشاءاللہ نہایت عمدہ اور معیاری جریدہ ہے کمپوزنگ بھی بہترین ہے اور اندر کا مواد بھی۔ یقیناً آپ مبارک باد کے مستحق ہیں اللہ آپکو جزاء خیر عطا فرمائے آمین۔ ابھی جتنا پڑھا ہے اسکا اگر میں ذکر کروں تو جمیل عثمان صاحب کا افسانہ حشر ساماں، ڈاکٹر سید کشفی

صاحب کی تحریر۔ انسانوں میں مقیدایک دن, انورسدید صاحب کی۔ طلوع ہوتی ہوئی مسکراہٹ, روشنی کا کا درخت پروفیسر خالد ظہور صاحب, جمیل عثمان صاحب کا تخلیقی بہاؤ کامران ظفر صاحب اور جمیل صاحب کا افسانہ خالی ہاتھ بیحد عمدہ تخلیقات ہیں۔ اسکے علاوہ مختلف شعراء کا کلام بھی کافی پسند آیا۔

افق فریدی (دہلی)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام اوراحترام۔

جمیل عثمان صاحب کا انٹرویو دلچسپ تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ، زبان کے مسائل اور کئی مسائل پہ انھوں نے بہت کھل کر بات کی اور ان کی تحریریں اس سے بھی زیادہ اچھی لگیں، خصوصاً افسانے۔ غزلوں میں ان کا اپنا ہی انداز ہے جو مسلسل غزل کے قریب ہے اور اس سے ان کے نظم کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مجھے ان کی نظم ''اعصاب'' اچھی لگی۔ افسانوں میں ان کا انٹرویو سے پہلے والا افسانہ ہی بہت پر درد تھا جس میں اس دور کی دین خصوصاً مغرب میں، یعنی اولڈ ہومز کا المیہ، موضوع ہے جس کی کریہہ ترین صورت اس وقت یہاں ہم وبا کے دنوں میں دیکھ رہے ہیں کہ کینڈا میں سب سے زیادہ اموات شروع میں وہیں ہوئی تھیں۔ ان کے افسانوں میں جھول نظر نہیں آتا۔ ان کے ہاں حقیقت پسندی ہے، منظر نگاری ہے، سادہ بیانی اور کہانی پر زور ہے جس سے افسانہ جڑا رہتا ہے مگر وہ اہم جزئیات سے بھی غافل نہیں ہوتے اور افسانے کی روانی بھی متاثر نہیں ہوتی۔

اس شمارے میں عبداللہ جاوید صاحب کا حسرت موہانی کے حالاتِ زندگی کا اجمالی خاکہ بہت اچھا لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے منجمد قومی بیانیے کی عینک کے بغیر دیکھیں تو بہت کچھ نظر آتا ہے اور بڑے بڑے ہیرے نظر آتے ہیں, مگر کون دیکھے۔ جمیل عثمان صاحب ہی کا ''خالی ہاتھ''، رینو بہل کا ''جہانِ نو کی نوید'' بہت اچھے افسانے ہیں۔ ان کے علاوہ وحشی سعید کا ''کیا زندہ رہو گے'' کشمیر کے حالات اور وبا کی دوہری اذیّت کی تکلیف دہ تصویر دکھاتا ہے جبکہ حمید شاہد کا ''برشور'' اور آغا گل کا ''شوم کا مال'' بلوچستان کے اور بالعموم وطن کے رستے زخموں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ غزالہ قمر کا ''چھت۔۔۔'' ہمارے اطراف مسلسل جاری ظلم کی تصویرکشی ہے۔ آپ کا ''قربِ قیامت'' عالمی سیاست اور اس سے جڑی سازشوں اور عوام کے ذہنوں میں پھرتے سازشی نظریوں کو سمیٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کافکا کی تحریریں پڑھ کر لطف آیا، جانے کیا سوچ کر اس نے ایسے ٹکڑے لکھ چھوڑے تھے۔ تابش خانزادہ صاحب کا ناول مکمّل ہوگیا، میری خواہش ہے کہ جب کتاب چھپے تو پورا ناول ایک ساتھ پڑھ سکوں۔

انجم جاوید صاحب کی نظم بہت خوب تھی مگر ان کے نام کے ساتھ کراچی کے بجائے ''لاہور'' شاید غلطی سے لکھ دیا گیا ہے۔ ناصر علی سیّد کی نظم پڑھی، عنوان بھی ہے، مگر ہے وہ غزل۔ افتخار عارف صاحب کی نظم اچھی لگی، شاید پہلے پڑھ چکا ہوں۔ غزلوں میں کئی اشعار بہت اچھے تھے جن میں خلیق الزماں نصرت، احمد سوز، افق آفریدی، حمیرا رحمان، منظر بھوپالی، طالب جوہری اور احمد مشتاق صاحبان کی غزلوں کے اشعار شامل ہیں۔ پشت پہ راحت اندوری کا انتخاب بھی خوب ہے۔ شکریہ

فیصل عظیم (کینیڈا)

جاوید بھائی، سلام ورحمت۔

لفظوں کی اک مہک پھیلی چہار سو
کرنیں تفکرات کی بکھری چہار سو

کچھ عرصہ ہوا محترم یونس شرر صاحب نے مجھے کہا بیٹی اب تم اخبار اور میگزینز میں لکھنا شروع کر دو تو مجھے بھی ایک نئے جذبے نے آلیا میں نے جب ادھورا دھر دیکھنا شروع کیا تو لاتعداد ان گنت روزنامے ہفتہ وار میگزینز اور ماہنامے نظر آنے لگے اُنہیں میں چہارسُو ایک روشن ستارے کی طرح سامنے آیا یونس شرر صاحب سے میں نے مشورہ لیا اُنہوں نے کہا بیٹی چہارسُو اچھا معیاری ماہنامہ ہے اس میں اپنی نگارشات بھیجو فرح کامران صاحبہ سے میں نے چہارسُو کا لنک لیا اور فوراً رابطہ کیا چہارسُو کے مُدیرِ مسئول محترم جاوید گلزار صاحب نے بہت اچھا response دیا۔ اُنہوں نے بڑی خوشدلی سے مجھے ویلکم کیا محترم جاوید گلزار صاحب نہایت خوش اخلاق، خوش طبع اور۔ بیغرض انسان ہیں اور اس طرح چہارسُو میں مجھے بھی جگہ بنانے کا موقع ملا چہارسُو واقعی ایک بہترین ماہنامہ ہے جو لکھاریوں کے اجتماع سے ایک کہکشاں کی صورت اختیار کر گیا یہ نئے اور پُرانے لکھنے والوں کے لئے ایک پلیٹ فارم کا کام کرتا ہے جہاں بہت پائے کے اور منجھے ہوئے لکھنے والے نظر آتے ہیں وہیں نو آموز مصنف اور شعراء ابھی اپنی تصانیف لیئے جلوہ افروز دکھائی دیتے ہیں نہ صرف یہ لکھنے والوں کے لئے بہترین آمجگاہ ہے بلکہ باذوق پڑھنے والوں کے لیے بھی ایک موزوں رسالہ ہے ہر ماہ کوئی نہ کوئی اچھوتی کاوش سامنے لاکے قارئین کے دل جیتنے کا سبب بنتا ہے ایسے ہی پچھلے ماہ مرحوم راحت اندوری کی یاد میں اور جمیل عثمان نمبر نکال کے میگزین کو چار چاند لگا دیئے جمیل بھائی کے متعلق یوں تو پچھلے ماہنامے میں لکھا جا چکا ہے لیکن ان کے بارے میں دو باتیں میں بھی کرنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ جمیل بھائی واقعی اس قابل ہیں کہ انہیں بہترین خراجِ تحسین پیش کیا جائے وہ ایک نرم لہجے کے گرم جوش انسان ہیں انکی تحریروں میں سچائی کا رنگ نظر آتا ہے جمیل بھائی سے ہماری بہت پُرانی جان پہچان نہیں ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے برسوں پُرانی جان پہچان ہے بہت قلیل عرصے میں بہت زیادہ پُرانی دوستی لگتی ہے خاص طور پہ بھابھی کی دلآویز مُسکراہٹ اور اپنائیت نے ان کا گرویدا بنا دیا ہے۔ یہ ایک اچھا ذریعہ ہے شعراء اور مصنفین کو متعارف کروانے کے لئے اس طرح جو لوگ اپنے پسندیدہ شخصیات کے بارے ان کی زندگی کے بارے میں نہیں جانتے اور جاننا چاہتے ہیں ان کے بارے میں دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں جس سے ایک قاری کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے جمیل عثمان نمبر میں جمیل بھائی کے والدین اور ان کی اپنی زندگی کے حالات اور واقعات لکھنے والوں نے بڑی خوبصورتی سے پیش کئے جن میں محمد

انعام الحق صاحب کی تحریر میرے ہمزاد نے ان کی تعلیمی اور تجرباتی خوبیوں کی لمبی فہرست سامنے رکھ دی عطیہ سکندر صاحبہ نے ان کی تخلیق سے کچھ انتخابات پیش کیے ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کی تصنیف افسانوں میں مقید ایک دن بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا اس نمبر میں جمیل عثمان بھائی کے اپنے افسانے بھی شامل رہے جن میں حشر ساماں اور طلوع ہوتی مُسکراہٹ قابلِ ذکر تھے ابوالحسن نغمی کا مضمون معجزات بھی مکمل پڑھے بغیر نہ رہ سکی محترمہ نصرت انور صاحبہ جو بہترین لکھنے والوں کی صف میں شامل ہوتی ہیں جس طرح ان کی ہر کاوش لاجواب ہوتی ہے اسی طرح اُجلی اُجلی کہانیاں بھی بے مثال رہیں جمیل عثمان صاحب کے کچھ نظمیہ کلام بھی شاملِ اشاعت رہے جمیل بھائی کی زندگی ان کی تصانیف کے علاوہ بھی دوسرے شعراء اورافسانہ نگاروں کی نگارشات سے رسالہ کی زیبائش میں اضافہ ہوا۔

نسیم سحر اور ڈاکٹر انیس الرحمٰن کی عقیدت سے بھرپور نعتیں محمد حمید نعمان، رینو بہل کے افسانوں کو پڑھنا اچھا لگا۔ آغا گل کے افسانے شوم کا مال میں شاد باد منزلِ مُراد کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ قابلِ زکر ہے، فرح کامران بھی اچھا لکھ رہی ہیں ان کی تحریر ہیئے اب ایسی جگہ چل کے بے مثال ہے وحشی سعید نے افسانہ کیا زندہ رہو گے میں موجودہ حالات کی بہترین عکاسی کی ہے گلزار جاوید نے قرب قیامت افسانہ میں خوبصورت لفظوں کی کاٹ سے معاشرے میں ہونے والے مسائل کی نشاندہی کی ہے جاوید گلزار صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح یہ بھی لاجواب رہی دستِ کرم میں علامہ طالب جوہری، محترم یونس شرر اور مُشیر طالب کی پختہ گری سے چہار سو کی زینت میں بتدریج اضافہ ہوا اسی طرح بہت سے مختلف اقسام کے خوشبودار گلوں سے یہ گلدستہ تزئین کے بعد قارئین کی نگاہوں کا مرکز رہا آخر میں مرحوم راحت اندوری صاحب کے اشعار سے رسالے کو اختتام کیا جس نے راحت اندوری کے جو شیلے اندازِ بیاں کی یاد تازہ کردی۔

آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو

(راحت اندوری)

مرحوم راحت اندوری کے نام

اِندور کی گلیوں میں روشن جو دیا تھا
اس جوت سے زمانہ جگا چوند ہوا تھا
کُچھ ایسی چلی! ہائے اک تُند سی ہوا
گُل ہوا چراغ چھائی ظلمت بھری گھٹا

آخر میں پھر ایک بار پھر چہار سو کی پوری ٹیم کو بہت مبارک اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

ڈاکٹر نزہت شاہ (نیویارک)

☆

''بڑے لوگ''

مختار مسعود بیوروکریٹ تھے اور مصنف بھی، وہ دو ہزار سترہ میں انتقال کر گئے لیکن دو ہزار دو میں انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی اکٹھی کی جو کہ دس کروڑ روپیہ بنی اور اُسے آزاد کشمیر کی ایک فاؤنڈیشن کے حوالے کر دیا اور انہیں سکول بنانے کا کہا، فاؤنڈیشن نے سکول بنا دیا اور مختار مسعود صاحب کو افتتاح کی دعوت دی، مختار مسعود صاحب نے یہ دعوت تین شرائط کے ساتھ قبول کی:

۱۔ افتتاح کی کوئی تقریب نہیں ہوگی۔
۲۔ افتتاح چھٹی والے دن ہوگا۔
۳۔ ڈونیشن کی کوئی تشہیر نہیں کی جائے گی۔

یوں مختار مسعود صاحب ایک اتوار کو سکول کے افتتاح کے لئے چلے گئے، وہ خالی کلاس روم میں گئے، بلیک بورڈ پر'' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا اور واپس آ گئے۔

جب کسی نے مختار مسعود صاحب سے پوچھا کہ آپ نے یہ سکول کھولنے کے لئے چوکی (گاؤں) کا انتخاب کیوں کیا تو مختار مسعود صاحب نے جواب دیا'' میرے دادا کشمیر سے چوکی کے راستے پنجاب میں داخل ہوئے تھے، وہ رات چوکی میں رکے تھے اور چوکی گاؤں کے لوگوں نے اُن کی بہت خدمت کی تھی، اُن کے دادا ساری عمر چوکی کے لوگوں کی تعریف کرتے رہے اور میں اس گاؤں میں سکول بنا کر یہ احسان اتارنا چاہتا تھا''

یہ واقعہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ ڈونیشن، سادگی اور تشہیر پر مشتمل ہے، اُس بندے نے اپنی زندگی کی ساری جمع پونجی ڈونیٹ کر دی اور کسی کے سامنے نام تک لینا گوارا نہیں کیا جبکہ دوسرا حصہ پہلے حصے کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے، بڑے لوگ ایسے ہی بڑے نہیں ہوتے، اُن کے دادا نے ایک رات گاؤں میں گزاری اور ساری عمر اُس گاؤں کی مہمان نوازی کی تعریف میں گزار دیئے جبکہ پوتے نے دادا کی وہ بات پلے باندھ لی اور ساری عمر کی جمع پونجی اُس گاؤں پہ لگا دی۔ اللہ، اللہ۔

...... تنہائی کے سوسال ......

گیبریل گارشیامارکیز ترجمہ : ڈاکٹرنعیم کلاسرا

تنہائی کے سوسال ایک ناول ہے جو کہ 1967ء میں کولمبیا کے مصنف گبریل گارشیامارکیزنے لکھا ہے۔اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اور نوبل انعام یافتہ ناولوں میں شامل ہے۔اس ناول میں مارکیزنے بوئندہ خاندان کے کثیرنسل کی کہانی بتائی ہے،جن کا سربراہ جوزے آرکیدو بوئندہ تھا۔اس نے ایک چھوٹی سی بستی کی بنیادرکھی جو ماکوندو کے نام سے جانی جاتی تھی۔ہربستی بقیناً کسی نہ کسی انسان نے بسائی ہوتی ہے۔۔جس طرح بندہ بڑا ہوتا ہے اسی طرح جگہیں بھی بڑی بوڑھی ہوتی ہے اور بالآخر مرجاتی ہے۔ایسی ہی ایک بستی کی کہانی " تنہائی کے سوسال " میں ملتی ہے۔۔ چھ،سات نسلوں پر محیط یہ محض " بوئنداہ خاندان " کی کہانی نہیں بلکہ تہذیبوں کے عروج اورزوال کا وقت مقامی ثقافتوں اورانکے قصے کہانی کی روایت سے ہوکرگزرتا ہے۔۔اس ناول میں ہمیں متضاد موضوعات ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلونظرآتے ہیں۔۔موت،پیار،نفرت،جنگ،امن،جوانی،بڑھاپا،ان موضوعات کے ساتھ ساتھ ناول کی خوابناک فضا قاری کے باطن میں سلگنے کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔۔اس ناول میں ہم قدم قدم پرحیرت سے دوچار ہوتے ہیں۔۔یہ حیرت حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کے انوکھے پن سے پیدا ہوتی ہے۔۔اس ناول میں مارکیز کی ابتدا زندگی کے حالات و واقعات اس کی اپنی نانی اورخالاؤں سے سنی زبانی روایات اور داستانیں ایک بڑے کینوس پر متشکل ہیں اور مارکیز کا زرخیز تخلیل ان کہانیوں کوحیرت انگیز شکل دینے لگتا ہے۔

تنہائی کے سوسال کا ماحول بوسیدہ،لاتعلق اورزوال آمادہ تنہائی سے بھراپڑا ہے۔۔جنگ اورتشدد سے گزرکے واقعات اس تنہائی کواوربھی شدید کرتے ہیں۔۔اس بےگانہ اور خالی تنہائی کواس کے کرداروں کے پاس بھرنے کے لئے جنسی عمل کے سوااورکوئی راستہ نہیں۔۔۔اگراس ناول میں جنسی اختلاط کی بہتات نظر آئے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔یہ اس لاتعلق تنہائی کوبھرنے کا عمل ہے۔ایک دفعہ یہ ناول آپ نے شروع کردی تو پھر جب تک ختم نہیں ہوگا آپ کوسکون نہیں آ? گا۔مختلف کرداروں کی مختلف کہانی قاری کواپنے اندر سموئے رکھتی ہیں۔کہانی میں بہت سے کردار ہیں ہرایک اپنی جگہ ایک الگ مقام رکھتا ہے مجھے جوسب سے زیادہ پسند آیا وہ ہے ارسلا جوایک رحم دل اورمحبت کرنے والی عورت ہوتی ہے۔ہرایک کواپنے دل اورگھر میں جگہ دیتی ہے۔ایک عورت کے لیے اس کی اولاداس کا گھراس کے اردگرد کے لوگ یہ سب چیزیں کتنی اہمیت رکھتی یہ بھی اس کی کردار میں دیکھا جاسکتا ہے۔ایک چیز جو مجھے اچھی نہیں لگی وہ ہے کرداروں کے ایک جیسے نام۔اس ناول کرداربھی بہت ہے اوراس کے نام بھی ایک جیسے ہیں تو بعض دفعہ قاری کو پریشانی میں مبتلا کرتی ہیں۔ناول پڑھتے ہو? ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ انڈر لائن کروں اتنے خوبصورت اورمعنی خیز جملے لکھے ہیں۔کچھ جملے جو مجھے بہت پسند آئی ؛

''بندہ اپنے ہاتھ آگے کرے تو پرندے ہتھیلی سے کو? چیز کھانے کے لیے آجاتے ہیں''

''تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں پتہ ہے کہ ہم یہ جنگ کیوں لڑرہے ہیں۔'' کرنل بوئندہ نے کہا۔

''جہاں تک میرا تعلق ہے۔مجھے اب ادراک ہوا ہے کہ میں صرف اپنے نام کی وجہ سے جنگ لڑرہا ہوں۔''

''کسی بھی انسان کا بہترین دوست صرف وہی ہے_''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا

''جتنا کوئی سوچتا ہے۔مرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔''

''میں کبھی ایسے شخص سے شادی نہیں کروں گی جو اتنا بےوقوف ہو کہ اس نے اپنا ایک گھنٹہ محض اس لیے ضائع کردیا بلکہ اس نے لنچ بھی نہیں کیا کہ وہ ایک لڑکی کو نہاتے ہوئے دیکھتا رہا۔''

''مردوں کے اندر عورت کی طلب تمہاری گمان سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔''

''گم شدہ چیزوں کی پھلورروٹین کی عادتوں سے ہٹ کرچھپی ہوتی ہے۔اس لیے انہیں ڈھونڈنا مشکل ہوجاتا ہے۔''

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
راہ نمائے سخن
SUKRITA PAUL KUMAR
CONVERSATIONS ON MODERNISM
مردہ خانے میں عورت
مشرف عالم ذوقی
MURDA KHANY MEIN AURAT
by
Musharraf Alam Zauqi